اسلام میں
مذہبی رواداری

سید صباح الدین عبدالرحمان

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ (یوپی)

اسلام میں مذہبی رواداری

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

دارالمصنفین ،شبلی اکیڈمی ،اعظم گڈھ ،یو۔پی (الھند)

سلسلہ دارالمصنفین : ١٦٨

نام کتاب : اسلام میں مذہبی رواداری

مصنف : سید صباح الدین عبدالرحمٰن

صفحات : ٣٠٨

طبع جدید : ٢٠٠٩ء

ناشر : دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڈھ (یو۔پی)

مطبع : معارف پریس شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ (یو۔پی)

قیمت : 150 روپے

ISBN 978-93-80104-02-7

فہرست مضامین

دیباچہ

اسلام میں مذہبی رواداری کی تعلیمات کا ایک مرغزار آباد ہے مگر قرآن مجید اور احادیث نبوی کا مطالعہ غور سے کیا جائے تو ان میں ان کا چمن زار نظر آئے گا، خاکسار کو اس موضوع سے بڑی دلچسپی رہی، ۱۹۷۲ء میں صابو صدیق ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ بمبئی کے المالطیفی ہال میں ایک مقالہ ''ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری'' کے عنوان سے پڑھا تو سامعین کو اس سے بڑی دلچسپی پیدا ہوئی، خیال ہوا کہ اس موضوع پر مستقل کتابیں لکھی جائیں تو مناسب ہوگا، الحمدللہ کہ اس پر تین جلدیں لکھنے کی توفیق عطا ہوئی، جو دارالمصنفین سے شائع ہوگئی ہیں، ان کو قلم بند کرتے وقت یہ بات بھی ذہن میں آئی کہ اسلام میں مذہبی رواداری کے عنوان سے بھی ایک کتاب لکھنے کی ضرورت ہے، ۱۹۷۶ء میں پاکستان میں سیرت نبوی پر ایک بین الاقوامی کانفرنس ہوئی تو اسی عنوان سے مجھ کو ایک مقالہ لکھنے کو کہا گیا، کراچی کے ایک اجلاس میں ایک مختصر مقالہ لکھ کر پیش کر دیا مگر یہ خیال چھایا رہا کہ اس پر ایک مستقل کتاب ہونی چاہیے۔

دارالمصنفین کی مطبوعات میں اس پر کوئی مستقل کتاب نہ تھی، گو مولانا شبلی کی تصنیفات اور مقالات، پھر سیرت النبیؐ کی مختلف جلدوں، صحابہ کرام کے سلسلہ کی تصانیف، تاریخ اسلام، تاریخ دولت عثمانیہ اور تاریخ اندلس میں جابجا اس عنوان پر مباحث ہیں، زیر نظر کتاب میں مواد کی تلاش و جستجو میں ان تصانیف سے پورا استفادہ کیا گیا ہے، جن ماخذوں سے ان میں واقعات نقل کیے گئے ہیں ان کے بھی ساتھ ساتھ حوالے دیے گئے ہیں پھر انگریزی کی دوسری کتابوں سے بھی ہر طرح کے معلومات یکجا کر دینے کی کوشش کی گئی

ہے، جیسا کہ اس کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوگا۔

پہلے ارادہ ہوا کہ قرآن مجید اور احادیث نبویؐ میں مذہبی رواداری کی جو تعلیمات ہیں ان پر رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین نے جس طرح عمل کیا، اسی کا احاطہ کر کے یہ کتاب ختم کر دی جائے لیکن اس موضوع سے دل چسپی بڑھی تو ذہن منتقل ہوا کہ مسلمان فرماں رواؤں نے جہاں جہاں اپنی حکومتیں قائم کیں اور وہاں اپنی مذہبی رواداری کے جو نمونے پیش کیے ان کو بھی قلم بند کر دیا جائے تو اور بھی بہتر ہوگا پھر یہ بھی خیال آیا کہ عیسائی مورخین مسلمانوں کی عدمِ رواداری کا ذکر بہت بڑھا چڑھا کر کرتے ہیں، اگر عیسائیوں کی مذہبی چیرہ دستی اور سیاسی سفاکی کی عبرت ناک کہانی عیسائی مورخین ہی کی زبانی قلم بند کی جائے تو مسلمان اور عیسائیوں کی رواداری اور عدم رواداری کا موازنہ کرنے میں آسانی ہو جائے گی، زیر نظر کتاب میں عیسائیوں کی عدم رواداری کی محض تھوڑی سی جھلکیاں دکھائی گئی ہیں، تفصیلات سے اس کی ضخامت بہت بڑھ جاتی۔

اسلام میں مذہبی رواداری کا موضوع اتنا وسیع ہے کہ بہت سے واقعات سمیٹنے کے باوجود پھر بھی بہت کچھ صرفِ نظر ہو گئے ہیں، اس کتاب کی کتابت ہو چکی تھی تو کچھ اور مفید معلومات حاصل ہوئے جن میں سے دو چار یہاں پر قلم بند کرنے کے لیے طبیعت مائل ہو رہی ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ایک لشکر نجد کی طرف روانہ ہوا اس نے قبیلۂ بنو حنیفہ کے ایک شخص کو پکڑ لیا جو پہچانا نہیں گیا، رسول اللہ ﷺ کے پاس وہ لایا گیا، فرمایا کہ تمہیں خبر ہے یہ کون ہے؟ یہ قبیلہ بنو حنیفہ کا ثمامہ بن اثال ہے، اس کے ساتھ حسن سلوک کرو پھر اپنے گھر تشریف لے گئے اور فرمایا کہ جس قدر بھی کھانا ہو سب ثمامہ کے پاس بھیج دو، اپنی اونٹنی کے بارے میں حکم دیا کہ اس کو بھی صبح و شام ثمامہ کے پاس دودھ کے لیے بھیج دیا کرو پھر بھی ثمامہ سیر نہ ہوتا تھا، رسول اللہ ﷺ ثمامہ کے پاس آ کر فرماتے، اے ثمامہ! اسلام قبول کر لو تو وہ جواب دیتا، اے محمد! آپ کو اختیار ہے، اگر آپ قتل کریں گے تو ایک ایسے شخص کو قتل کریں گے جو واجب القتل ہے اور اگر فدیہ چاہتے ہوں تو جس قدر

درکار ہو فرما دیجیے، وہ دے دیا جائے گا، کچھ اور وقت گزرا تو ایک دن رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ثمامہ کو رہا کر دو، رہائی کے بعد ثمامہ وہاں سے چل کر بقیع پہنچے، اچھی طرح پاک و صاف ہو کر حاضر خدمت ہوئے اور رسول اللہ ﷺ کے دست مبارک پر بیعت اسلام کی، شام ہوئی تو کھانا ان کے سامنے رکھا گیا، جس میں سے تھوڑا ہی سا کھایا، اونٹنی کا دودھ بھی تھوڑا ہی پیا، اس پر مسلمانوں کو حیرت ہوئی، رسول اللہ ﷺ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے فرمایا: ''تم کو اس بات پر کیوں تعجب ہے؟ یہ آدمی صبح کو ایک ہی آنت میں کھا کر شکم سیر ہو گیا، کافر سات آنتوں میں کھا کر شکم سیر ہوتا ہے، مومن ایک ہی آنت میں کھا کر آسودہ ہوتا ہے''۔ (سیرت ابن ہشام: ج ۲، ص ۴۱۳)

خیبر کی لڑائی ۷ ہجری میں ہوئی، مسلمانوں نے یہودیوں کے جانور اور مال لوٹ لیے، اس پر آنحضرت ﷺ کو نہایت غصہ آیا، تمام لوگوں کو جمع کر کے فرمایا: ''خدا نے تم لوگوں کے لیے یہ نہیں جائز کیا ہے کہ اہل کتاب کے گھروں میں گھس جاؤ مگر با اجازت اور نہ یہ کہ ان کی عورتوں کو مارو، نہ یہ کہ ان کے پھل کھاؤ، جب کبھی وہ تم کو وہ ادا کریں جو ان پر فرض ہے''۔ (سیرۃ النبیؐ: ج ۱، ص ۵۸۲)

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب بنو تغلب مغلوب ہوئے تو وہ اپنے قدیم مذہب کو ترک کرنے کے لیے راضی نہ تھے، حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ ان پر کسی قسم کا دباؤ نہ ڈالا جائے اور وہ اپنے مذہب کی پیروی میں آزاد ہیں، البتہ اگر ان میں سے کسی شخص نے اسلام قبول کرنا چاہا تو کوئی شخص مزاحمت کا مجاز نہ ہوگا اور نہ ایسے لوگوں کے بچوں کو جو مسلمان ہو گئے ہیں، اصطباغ دے سکیں گے۔ (طبری: ج ۵، ص ۲۴۸۲)

قبیلۂ بکر کے ایک شخص نے حیرہ کے ایک عیسائی کو مار ڈالا، حضرت عمرؓ نے لکھ بھیجا کہ قاتل مقتول کے وارثوں کو دے دیا جائے، چنانچہ وہ شخص مقتول کے وارث کو جس کا نام حنین تھا، حوالہ کیا گیا اور اس نے اس کو قتل کر ڈالا۔ (الفاروق: ج ۲ ص ۱۳۸ بحوالہ الدرایۃ فی تخریج الہدایہ مطبوعہ دہلی ص ۲۶۰)

حضرت عمرؓ ہی کے زمانہ کا ایک بہت ہی دل چسپ واقعہ یہ بھی ہے کہ ایران کے

ہرمزان نے کئی دفعہ حضرت عمرؓ کے عہد کے سپہ سالار حضرت سعدؓ سے صلح کی تھی اور ہمیشہ اقرار سے پھر جاتا تھا، شوستر کے معرکہ میں دو بڑے مسلمان اس کے ہاتھ سے مارے گئے، حضرت عمرؓ کو ان باتوں کا اس قدر رنج تھا کہ انھوں نے ہرمزان کے قتل کا پورا ارادہ کرلیا، تاہم اتمام حجت کے طور پر عرض ومعروض کی اجازت دی، اس نے کہا: عمر! جب تک خدا ہمارے ساتھ تھا تم ہمارے غلام تھے، اب خدا تمہارے ساتھ ہے، ہم تمہارے غلام ہیں، یہ کہہ کر پینے کا پانی مانگا، پانی آیا تو پیالہ ہاتھ میں لے کر درخواست کی کہ جب تک پانی نہ پی لوں مارا نہ جاؤں، حضرت عمرؓ نے منظور کیا، اس نے پیالہ ہاتھ سے رکھ دیا اور کہا کہ میں پانی نہیں پیتا، اس لیے شرط کے مطابق تم مجھے قتل نہیں کر سکتے، حضرت عمرؓ اس مغالطہ پر حیران رہ گئے، پھر ہرمزان نے کلمہ توحید پڑھا اور کہا، میں پہلے ہی اسلام لا چکا تھا لیکن یہ تدبیر اس لیے کی کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ میں نے تلوار کے ڈر سے اسلام قبول کیا ہے۔ (الفاروق ج ا ص ۱۶۴ بحوالہ العقد الفرید لابن عبدربہ، باب المکیدۃ فی الحرب)

عیسائی مصنفوں میں ٹی، ڈبلیو، آرنلڈ نے پریچنگ آف اسلام کے نام سے جو کتاب لکھی ہے، وہ ان کی فراخ دلی اور مذہبی رواداری کا ثبوت ہے جو اور عیسائی اہل قلم کے یہاں نہیں ملتی ہے، زیر نظر کتاب لکھتے وقت ٹی .ڈبلیو. آرنلڈ کی اس اہم تصنیف کو ہم نے قصداً زیادہ تر علاحدہ رکھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کے واقعات سے استفادہ کرنے پر قلمی قناعت کرلی جائے، جب میری یہ کتاب ختم ہوئی تو اس کا مطالعہ ازسرنو شروع کیا، گو اس کو بار بار پہلے بھی پڑھ چکا تھا، اس میں رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں اسلام کی تبلیغ جس طرح ہوئی پھر مغربی ایشیا، ہسپانیہ، یورپ، ایران، وسط ایشیا، ہندوستان، چین، افریقہ اور الجزائر میں اس کی اشاعت جس طور پر ہوئی اس کا مورخانہ اور مبصرانہ تجزیہ ایسے موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ عیسائی بھی اپنے تعصب کی عینک اتار کر اس کا مطالعہ کریں تو ان کی آنکھیں روشن، دماغ واضح اور ذہن صاف ہو جائے گا، اس کتاب کے کچھ واقعات ہدیہ ناظرین ہیں۔

ہم نے اپنی اس کتاب میں لکھا ہے کہ بنو عباس اپنے زمانہ میں عیسائیون کو بڑے بڑے عہدے دیتے رہے، اسی بات کو ٹی .ڈبلیو. آرنلڈ نے اپنے انداز میں اس طرح کہا ہے:

''عیسائی قوموں نے اور خاص کر ان عیسائی قوموں نے جو شہروں میں آباد تھیں، ابتدائی دور خلافت میں نہایت آسائش اور ترقی سے زندگی بسر کی، خلفا کے دربار میں اکثر عیسائی مناصب جلیلہ پر ممتاز ہوئے، چنانچہ ایک مسیحی عرب جس کا نام اخطل تھا دربار کا شاعر تھا اور سینٹ یوحنا دمشقی کا باپ خلیفہ عبدالملک (۶۸۵ء-۷۰۵ء) کا مشیر گذرا ہے، خلیفہ معتصم (۸۳۳ء-۸۴۲ء) کی خدمت میں دو عیسائی بھائی رہتے تھے جو خلیفہ کے سب سے زیادہ معتمد تھے، ان میں سے ایک کا نام سلمویہ تھا اس کو تقریباً وہی منصب حاصل تھا جو آج کل سکریٹری آف اسٹیٹ کو حاصل ہوتا ہے، کوئی شاہی مکتوب اس وقت تک مستند تسلیم نہ ہوتا تھا جب تک کہ سلمویہ کے بھی دستخط اس پر ثبت نہ ہوتے تھے، دوسرے بھائی ابراہیم کے سپرد مہر خلافت تھی اور صیغہ بیت المال بھی اسی کی نگرانی میں تھا، یہ عہدہ بیت المال کے روپیہ اور صرف کے لحاظ سے ایسا تھا جس کی نسبت توقع ہوسکتی تھی کہ اس پر ہمیشہ مسلمان مقرر ہوگا لیکن ایسا نہ تھا، معتصم کو ابراہیم کے ساتھ ایسا انس تھا کہ ابراہیم جب بیمار پڑا تو خلیفہ اس کی عیادت کو گیا اور اس کی موت پر سخت رنج کیا، ابراہیم کی تدفین کے دن حکم دیا کہ جنازہ قصر شاہی میں لایا جاوے اور تمام مسیحی رسوم میت نہایت ادب سے وہاں ادا کی گئیں، نصر بن ہارون جو عضد الدولہ بو یہ خاندان عجم کے بادشاہ کا وزیر اعظم تھا، عیسائی مذہب رکھتا تھا اور بہت کلیسے اور خانقاہیں تعمیر کر چکا تھا، مدت تک سلطنت کے عہدے خاص کر صیغہ بیت المال کہ عیسائیوں اور عجمیوں سے معمور ہوتے تھے، اس زمانہ کے بعد مصر میں بھی یہی حال ہوا کہ بعض اوقات ان ممتاز عہدوں پر عیسائی کلیۃً متصرف ہوگئے، خاص کر پیشہ طبابت میں عیسائیوں نے بڑی دولت جمع کر لی، امیروں اور رئیسوں کے گھر میں ان کی عزت ہونے لگی، خلیفہ ہارون رشید کا طبیب خاص جس کا نام جبرئیل تھا، نسطوری عیسائی تھا

اور علاوہ ذاتی جائداد کے اس کی آمدنی آٹھ لاکھ درہم سالانہ تھی، دو لاکھ اسی ہزار درہم سالانہ خلیفہ کی ملازمت کے صلہ میں ملتا تھا دوسرا عیسائی طبیب بھی بائیس ہزار درہم سالانہ تنخواہ پاتا تھا۔ (پریچنگ آف اسلام اردو ترجمہ دعوت اسلام از محمد عنایت اللہ ص ۸۱-۸۲)

ٹی. ڈبلیو. آرنلڈ نے یہ بھی لکھا ہے کہ ان خلفا کے عہد میں جو قومیں مسلمان نہ تھیں، وہ اپنے انتظام میں خود مختار تھیں، جس کی وجہ یہ تھی کہ جو معاملات ان کے باہمی ہوتے ان کے انصرام کا قطعی اختیار سلطنت بالائی کی طرف سے ان کو حاصل تھا، اور ان کے مذہبی پیشوا ایسی صورت میں جب کہ کسی معاملہ میں فریقین ان کے ہم مذہب ہوں مالی مقدمات کا فیصلہ کرنے میں پورے اختیارات رکھتے تھے، ان کے گرجاؤں اور خانقاہوں میں کسی کو دخل نہ تھا۔ (ایضاً ص ۸۲)

عیسائی مورخین بڑے شد و مد کے ساتھ لکھتے ہیں کہ مسلمان فرماں رواؤں کے زمانہ میں نئے گرجوں کی تعمیر کا کیا سوال ہوتا، وہ تو پرانے گرجاؤں کو بھی مسمار کرتے رہے، اس کو سامنے رکھ کر ٹی. ڈبلیو. آرنلڈ نے یہ لکھا ہے کہ

”متعدد واقعات عیسائی اور مسلمان مورخین سے دریافت ہوتے ہیں کہ نئے گرجے برابر تعمیر ہوئے، خلیفہ عبدالملک (۶۸۵ء-۷۰۵ء) کے عہد خلافت میں الرہا کے شہر میں ایک نیا گرجا بنا، دو اور گرجے مصر کے شہر الفسطاط میں تعمیر ہوئے، ایک گرجا سینٹ جارج کے نام سے حلوان میں بنایا گیا، جو الفسطاط کے قریب ایک گاؤں ہے، ۷۱۱ء میں ایک یعقوبی کلیسا انطاکیہ میں خلیفہ ولید (۷۰۵ء-۷۱۵ء) کے حکم سے بنا، اس زمانہ کے بعد خالد الکسری نے جو عیسائی تھا اور ۷۲۴ء سے ۷۳۸ء تک عراق، عرب اور عراق عجم کا حاکم رہا تھا، اپنی ماں کے لیے ایک کلیسا تعمیر کروایا، ۷۵۸ء میں نصیبین میں اس گرجے کی تعمیر ختم ہوئی جس پر مطران نے چھپن ہزار دینار کی رقم خرچ کی، پھر آٹھویں صدی عیسوی میں ابوسرجہ کے کلیسا کی تعمیر کو شمار

کرنا چاہیے جو قدیم قاہرہ کے رومی قلعہ میں بنایا گیا، خلیفہ مہدی (۷۷۵ء-۷۸۵ء) کے عہد حکومت میں ایک گرجا عیسائی قیدیوں کے لیے بغداد میں تعمیر ہوا، یہ قیدی اس وقت قید ہوئے تھے جب کہ اہل اسلام کی لڑائیاں روم کی عیسائی سلطنت سے ہو رہی تھیں، بغداد میں دوسرا کلیسا خلیفہ ہارون رشید (۷۸۶ء-۸۰۹ء) کے زمانہ خلافت میں تعمیر ہوا اور اس کو سمالو کے باشندوں نے بنایا، جنھوں نے خلیفہ کی اطاعت اور خلیفہ نے ان کی سرپرستی منظور کر لی تھی، خلیفہ ہارون الرشید کے زمانہ میں ایک بڑا اعالی شان گرجا بابل میں تعمیر ہوا جس میں دانیال رسول اور حزقیل رسول کے تابوت رکھے گئے تھے، جب خلیفہ مامون رشید (۸۱۳ء-۸۳۳ء) مصر میں تھا تو دو معززین دربار کو اجازت دی کہ مقطم کی پہاڑی پر جو قاہرہ کے قریب تھی، گرجا بنائیں اور اسی خلیفہ کی اجازت سے ایک دولت مند عیسائی نے جس کا نام بکام تھا، کئی خوب صورت گرجے بورا میں تعمیر کروائے، نسطوری بطریق تموتھیس نے جو ۸۲۰ء میں مرا ایک گرجا تکریت میں اور ایک خانقاہ بغداد میں تعمیر کی، دسویں صدی عیسوی میں ابوسیفین کا خوش نما قبطی گرجا الفسطاط میں تعمیر ہوا، اور اسی صدی میں جب کہ عضد الدولہ بویہ (۹۴۹ء-۹۸۲ء) میں جنوبی فارس اور عراق پر مسلط تھا تو اس کے مسیحی المذہب وزیر اعظم نصر بن ہارون نے متعدد گرجے اور خانقاہیں تعمیر کیں، فاطمی خاندان مصر کے ساتویں خلیفہ الظاہر (۱۰۲۰ء-۱۰۳۵ء) کے عہد میں ایک نیا گرجا تعمیر ہوا، نئے گرجے اور خانقاہیں عباسی خلیفہ مستضی (۱۱۷۰ء-۱۱۸۰ء) کے زمانہ میں بھی تعمیر ہوئیں ۱۱۸۷ء میں الفسطاط کے قریب ایک گرجا تعمیر ہوا اور وہ لیڈی دی پیور ورجن کے نام سے موسوم ہوا۔'' (پریچنگ آف اسلام اردو ترجمہ دعوت اسلام از محمد عنایت اللہ ص۸۲-۸۴)

ٹی ڈبلیو آرنلڈ یہ بھی لکھتے ہیں کہ مسلمان اپنے اصول مذہبی آزادی کی وجہ سے

بے انصافیوں کو روانہ رکھتے تھے، اسی لیے مسلمانوں کی یہی کوشش رہی کہ اپنی تمام عیسائی رعایا کے ساتھ ایمان داری سے پیش آئیں، چنانچہ اس کی مثال موجود ہے، فتح مصر کے بعد یعقوبی فرقہ کے عیسائیوں نے رومی فرقہ کے حکام کی برطرفی کے وقت موقع پایا کہ آرتھوڈکس عیسائیوں کے گرجاؤں پر قبضہ کرلیں لیکن کچھ عرصہ کے بعد جب ان گرجاؤں کے حق دار پیدا ہوئے اور انھوں نے اپنا حق ثابت کردیا تو مسلمانوں نے یہ گرجے ان کو دلوادئے۔ (ایضاً ص ۸۵)

ٹی. ڈبلیو. آرنلڈ نے ایسی رواداریوں کی بہت سی مثالیں اپنی کتاب میں درج کی ہیں، وہ مسلمان حکم رانوں کی مذہبی رواداری کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

> ''حکومت اسلامیہ میں عیسائیوں کو جو مذہبی آزادی میسر آئی تو ایشائے کوچک کے عیسائیوں کو بھی اسی زمانہ میں اس کا خیال پیدا ہوا اور سلجوقی ترکوں کے آنے کو عیسائیوں نے اپنے حق میں مفید جانا کہ عیسائی حکومت سے وہ ہم کو رہا کریں گے یعنی محصول ہی کی سختیوں سے نہیں بلکہ کلیسائے یونان کی عقوبت پسند خصلتوں سے بھی نجات ملے گی، جس نے منحرف فرقے پالیسین اور آئیکا نوکلاسٹ پر سخت ظلم کیے تھے، چنانچہ میکائیل ہشتم (۱۲۶۱ء-۱۲۸۲ء) کے زمانہ میں وسط ایشائے کوچک کے باشندوں نے ترکوں سے درخواست کی کہ چھوٹے شہروں پر قبضہ کرلیں تاکہ رعایا کو عیسائی سطلنت کے ظلم سے نجات ملے، اکثر امیر وغریب وطن ترک کرکے ترکوں کی عمل داری میں چلے آتے تھے۔ (ایضاً ص ۱۱۱)

عثمانی ترکوں کی رواداری کا ذکر زیرنظر کتاب میں بہت کچھ آیا ہے، اس کا اعتراف موجودہ دور کے مورخین بھی کرتے ہیں، ابھی ''لیگیسی آف اسلام'' (میراثِ اسلام) کا ایک نیا اڈیشن جوزف شاخت اور باسورتھ کی ادارت میں شایع ہوا ہے، اس میں لندن یونیورسٹی کے برنارڈ لیوس کا ایک مضمون پالیٹکس اینڈ وار کے عنوان سے ہے، اس میں ترکوں کی مذہبی رواداری اور عیسائی رعایا کے ساتھ ان کے حسن سلوک کا ذکر ہے، اس کا اردو ترجمہ لاہور سے

اردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے مدیر جناب شیخ نذیر حسین نے دارالمصنفین کے رسالہ معارف کے لیے بھیجا تھا، جو فروری ۱۹۸۷ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے، اس کے کچھ ٹکڑے ہم یہاں ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔

عثمانی ترکوں کو عیسائیوں نے یورپ سے رخت سفر باندھنے پر مجبور کیا، اسی طرح سسلی اور اسپین سے مسلمانوں کو در بدر کیا، ان واقعات پر تبصرہ کرتے ہوئے برنارڈ لیوس نے لکھا ہے کہ جب عثمانی ترکوں نے یورپ سے رخت سفر باندھا اور ان کے اقتدار کو زوال آیا تو عیسائی اقوام جن پر ترکوں نے صدیوں تک حکومت کی تھی اپنے ملکوں میں آباد اور موجود تھیں، ان کے مذاہب، ان کی زبانیں اور ثقافتیں پہلے کی طرح علی حالہ برقرار تھیں، اور اپنے علاحدہ تشخص کے اظہار کے لیے تیار ہو چکی تھیں، اس کے مقابلہ میں آج اسپین اور سسلی کے باشندوں میں ایک مسلمان بھی نظر نہیں آتا اور نہ کوئی عربی بولنے والا دکھائی دیتا ہے۔

پھر وہ ترکوں کی عام رواداری اور عدل گستری کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہے:

> ''مسلم اور یہودی مہاجرین کے علاوہ وہ منحرف عیسائی جو اپنی حکومتوں سے مذہبی اور سیاسی اختلافات رکھتے تھے، ترکوں کے یہاں آکر پناہ لیتے تھے اور ان کی رواداری اور عدل گستری سے فیضیاب ہوتے تھے، ترکوں کے مفتوحہ علاقوں کے کسانوں کی حالت سدھر گئی، لڑائی بھڑائی اور بدانتظامی کے بجائے ملکی وحدت اور امن و امان کا دور دورہ ہوا جن کی وجہ سے اہم سماجی اور اقتصادی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔''

وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ ان کے زمانہ میں پرانی جاگیریں ترک سپاہیوں کو دی جاتی تھیں مگر جب یہ فوجی ملازمت سے سبکدوش ہو جاتے تھے تو یہ زمیں داریاں بحق سرکار ضبط کر لی جاتی تھیں یعنی انھوں نے مسلمانوں میں دوامی اور موروثی جاگیرداری قائم ہونے نہیں دی لیکن اس کے مقابلہ میں انھوں نے عیسائی کاشتکاروں کو ہر طرح کا تحفظ عطا کیا اور ان کی کاشتکاری موروثی رہی، جس میں ان کو پہلے کی نسبت زیادہ آزادی اور خودمختاری تھی،

مال گذاری کی تشخیص کا طریقہ بھی ان کے لیے سیدھا سادا بنایا گیا تھا اور تحصیل و وصول میں بھی انتہائی نرمی برتی جاتی تھی۔

برنارڈ لیوس کو اس کا بھی اعتراف ہے کہ عیسائی کاشتکار دل و جان سے عثمانی حکومت کے مطیع و فرماں بردار تھے اور وہ بلقانی ریاستوں میں امن و سکون سے زندگی بسر کرتے تھے، لیکن مغرب سے درآمدہ قومیت کے فتنہ نے ان کے امن کو تہ و بالا کر دیا، ورنہ حقیقت تو یہ تھی کہ عیسائی یورپ کے مقابلہ میں ان کاشتکاروں کی حالت بہتر تھی۔

عثمانی ترکوں میں دیوشیرمہ (لازمی بھرتی) کا قانون تھا، جس کے تحت عیسائیوں کے لڑکوں کو بھی فوج اور سول کی ملازمتوں کے لیے لازمی طور پر بھرتی کیا جاتا تھا، اس کے خلاف یورپ میں بڑی چیخ پکار ہوتی رہی لیکن یہ فائدے سے خالی نہ تھا، اس طریقہ سے ایک معمولی دیہاتی کا لڑکا بھی سول اور فوج کے اعلیٰ مناصب تک پہونچ جاتا تھا اور بہت سے دیہاتی لڑکے بڑے بڑے افسر بن گئے، ان کے خاندانوں کی سماجی حیثیت بھی اونچی ہوگئی، جس کا اس وقت کی عیسائی دنیا میں تصور بھی نہیں ہوسکتا تھا۔

برنارڈ لیوس یہ بھی لکھتا ہے کہ یورپ میں عثمانی مملکت کو خطرناک دشمن سمجھا جاتا تھا لیکن اسی کے ساتھ بعض منچلے اور طالع آزما عیسائی امیر و امراء ترکوں کی رواداری کی کشش سے ترکی چلے آئے تھے، مفلوک الحال اور خاک نشین کسانوں کا مرکز امید ان کے آقاؤں کے دشمن (ترک) بن گئے تھے۔

آخر میں وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ مسیحیت کے بڑے بڑے حامی بھی ترکوں کی سیاسی اور فوجی صلاحیت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے، ترکوں کے فرضی خطرہ کے بارے میں یورپ میں بہت سی کتابیں لکھی گئیں، لیکن ان میں ترکوں کے نظم و نسق کی خوبیوں کا بھی ذکر ہے اور ان کے اختیار کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے معارف فروری ۱۹۸۷ء)

زیر نظر کتاب میں مسلمانوں کی رواداری اور عیسائیوں کی عدم رواداری کو ظاہر کرنے میں بعض سیاسی واقعات کو ذرا تفصیل سے لکھنا پڑا جو بظاہر موضوع سے الگ معلوم

ہوتے ہیں مگر اس تفصیل کے بغیر اصل موضوع کو سمجھنا مشکل ہو جاتا، اس لیے ناگزیر طریقہ پر ان کو قلمبند کرنا پڑا ہے۔

آخر میں یہ کہنا ہے کہ جب انسانیت سنورتی نظر آئے گی اور لوگوں کی آنکھوں پر سے تعصب، نفرت، عداوت اور حقارت کی عینکیں اتر جائیں گی تو ان کو محسوس ہوگا کہ اسلام کی تعلیمات دنیا کے لیے ابر رحمت تھیں، ان کے سچے پیرووں نے اپنی عملی زندگی میں انسانی ہمدردی، رواداری، فراخ دلی اور سیر چشمی کی جو مثالیں پیش کیں، ان ہی میں دنیا کی فلاح و بہبود کا راز مضمر ہے، ابھی اس حقیقت کو دریافت کرنے کا شاید وقت نہیں آیا ہے لیکن جب یہ حقیقت دریافت ہو جائے گی تو دنیا کا انسان اپنے کو از سر نو دریافت کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

مگر یہ بھی واضح رہے کہ اسلام رواداری، محبت، شائستگی، شرافت اور معقولیت کی تعلیم ضرور دیتا ہے لیکن ایسی عاجزی اور مسکینی کی بھی تعلیم نہیں دیتا ہے کہ اس کے پیرو ظالم کے لیے بن کررہ جائیں، جو لوگ ظالم کا رویہ اختیار کریں ان کے ساتھ ان کے ظلم کی نوعیت کے لحاظ سے ان کا مقابلہ کرنے کی بھی تلقین کی گئی ہے، ظالموں کے مقابلہ میں نرم و شیریں بننا بھی صحیح نہیں، کیونکہ ایسے ظالم شرافت کو کمزوری اور مسکنت تصور کرنے لگیں گے، اسی لیے قرآن پاک میں ہے کہ اہل کتاب سے بحث نہ کرو مگر عمدہ طریقہ سے، سوائے ان لوگوں کے جو ان میں سے ظالم ہیں۔ (پارہ ۲۱، سورہ ۲۹، آیت ۴۶)

دعا ہے کہ جس حسن نیت سے یہ کتاب لکھی گئی ہے اس کا اثر ہمارے ناظرین پر خاطر خواہ طریقہ سے پڑے، یہی اس کتاب کے لکھنے کا اصلی صلہ ہوگا۔

ہر طرح کی احتیاط کے باوجود کتابت اور طباعت کی غلطیاں رہ گئی ہیں، جن کے لیے غلط نامہ آخر میں لگا دیا گیا ہے، ناظرین اس کی مدد سے تصحیح کرلیں اور مصنف کو شکر گذار ہونے کا موقع دیں۔

سید صباح الدین عبدالرحمٰن
دار المصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ

۲۵ر فروری ۱۹۸۷ء

اسلام میں مذہبی رواداری

اسلام آیا اور دنیا میں اپنی پوری قوت، صلابت اور رحمت کے ساتھ پھیلتا چلا گیا، کفر، شرک اور دوسرے مذاہب کے اس کے مخالفین اور بڑی سے بڑی حکومتیں اس کی بڑھتی ہوئی طاقت کو روک نہ سکیں، موجودہ دور کے مورخین اور مستشرقین بھی جو اسلام کے ہوا خواہ ہونے کے بجائے اس کے بدخواہ ہیں، اس کی حیرت انگیز رفتار ترقی پر انگشت بدنداں ہیں، جارج سیل نے کلام پاک کے انگریزی ترجمہ کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ وہ ان اسباب کو تو تلاش کرنا نہیں چاہے گا جن کی وجہ سے محمدؐ کی شریعت کی پذیرائی دنیا میں بے مثال طور پر ہوئی مگر یہ امر واقعہ ہے کہ یہ ہوئی، اور اب تو ان کی آنکھوں پر سے بھی پردہ اٹھ گیا جن کو یہ باور کرایا جاتا تھا کہ یہ تلوار کے ذریعہ پھیلا، اس مذہب کو ان قوموں نے بھی قبول کیا جن کو محمدؐ کی قوت سے کبھی واسطہ نہیں پڑا، اور وہ لوگ بھی دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے جنھوں نے عربوں کو ان کی فتوحات سے محروم کیا اور ان کے خلفا کی بالا دستی کو ختم کیا، اس مذہب کے بارہ میں عامیانہ طور پر جو کچھ بھی کہا جائے مگر یہ حقیقت ہے کہ اس کا فروغ حیرت انگیز طریقہ پر ہوا۔

مارگولیتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بہت ہی متعصب اور دریدہ دہن سوانح نگار ہے لیکن اس کو بھی اعتراف ہے کہ "محمدؐ کا سیاسی کام آپ کی موت کے وقت ادھورا نہیں تھا، آپ نے ایک امپائر قائم کر دیا تھا، جس کے مذہبی اور سیاسی دونوں دارالسلطنت تھے، آپ نے بکھرے ہوئے قبیلوں کو ایک قوم بنا دیا، ان کو ایک مذہب دے کر ایک مرکز اتحاد عطا کیا،

اور ان میں ایسی یگانگت پیدا کردی تھی جس میں ایک خاندان سے زیادہ پائداری تھی، پرانے معتقدات جو عرصۂ دراز سے چلے آرہے تھے، ان کی وجہ سے عرب الگ تھلگ ہو کر رہ گیا تھا لیکن یہ سب اپنی موت مر گئے، ان کی بعض باتیں تو لے لی گئی تھیں لیکن ان کے سارے نام قطعی طور پر ختم ہو گئے، گرچہ محمدؐ وفات پا گئے ہیں لیکن محمدؐ کا اللہ وفات نہیں پا سکا ہے۔''
(محمد ص ۲۷۴-۲۷۱)

ایچ. جی. ویلس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا منکر ہے لیکن اسلام کی ترقی کا تجزیہ کرنے میں اس کو لکھنا پڑا کہ'' یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اسلام میں بہت ہی عمدہ اور اعلیٰ تعلیمات ہیں، جب اس کی تبلیغ شروع ہوئی تو معاشرہ میں ظلم وستم کا دور دورہ تھا جس سے سوسائٹی دب کر رہ گئی تھی، اسلام میں ایک ایسا معاشرتی نظام پیش کیا، جس سے معاشرتی ستم آرائی ختم ہوگئی، اسلام کے معاشرہ میں لطف، مہر اور محبت ہے، یہی ایک تنہا خصوصیت نہیں بلکہ قرآن کے ذریعہ سے اس نے توحید کا جو تخیل پیش کیا وہ یہودیوں سے بالکل مختلف تھا، عیسائیت نے اس تخیل کو اتنا گنجلک بنادیا کہ اس سے نہ صرف تفرقہ پیدا ہوتا گیا بلکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کی اسپرٹ جاتی رہی، اسلام میں عبادت کرنے کا جو نظام ہے، وہ بھی اس کی قوت ہے پھر اس میں مکہ کو جو اہمیت دی گئی ہے اس سے بھی اس کی شان میں اضافہ ہوا، یہ نیا مذہب وہی ہے جو حضرت عیسیٰؑ کی زندگی میں عیسائیت یا گوتم بدھ کی زندگی میں بودھ مت تھا، اسلام میں بڑے بڑے علماء و، فضلاء اساتذہ اور مبلغین ہوئے، لیکن ان میں پادری نہیں ہوئے۔''

ایچ. جی. ویلس کی اس تحریر میں یہ بھی ہے کہ اسلام میں لطف، کرم، فیاضی اور اخوت کی تعلیم بھری ہوئی ہے، یہ بہت ہی سادہ اور قابل فہم مذہب ہے، اس کو معمولی آدمی بھی آسانی سے سمجھ لیتا ہے، یہودیت کے یہاں خدا عجیب وغریب چیز بن گیا ہے، عیسائیت میں تثلیث، عقائد اور کفر کی اتنی پیچیدگیاں ہیں کہ ایک معمولی آدمی کو ان کے اور چھور کا پتہ نہیں چلتا، مزدکیت کا اعلیٰ تخیل مانی کو دار پر چڑھانے کے بعد ختم ہوگیا، دنیا جب غیر یقینی حالت میں تھی، مکاری عام تھی، تفرقہ پھیلا ہوا تھا، اخوت کا فقدان تھا، بہشت راہبوں، پادریوں اور

ان کے ہم نوا حکمرانوں کے لیے مخصوص تھی تو محمدؐ نے ایسی تعلیم دی جو لوگوں کے دلوں میں اتر گئی۔'' (آوٹ لائنز آف دی ہسٹری آف دی ورلڈ یا محمد اینڈ اسلام)

ایچ .جی .ویلس نے یہ بھی لکھا ہے کہ اسلام پھیلتا گیا، یوان چوانگ تک پہونچا افریقہ تک گیا، اس کے سیلاب میں ایرانی، رومی، یہودی اور مصری تمدن بہہ گیا، اس کو اس لیے فروغ ہوا کہ اس کے ذریعہ سے اس زمانہ کے لیے بہترین معاشرتی اور سیاسی نظام پیش کیا گیا، یہ اس لیے بھی پھیلا کہ لوگ سیاسی حیثیت سے مظلوم تھے، ان کا استحصال ہو رہا تھا، ان کے اوپر خود غرض حکومت تھوپ دی گئی تھی، اسلام میں وسیع النظری تھی، اس کی تعلیمات میں تازگی تھی، پاکیزگی تھی، اس کے سیاسی نظریوں میں نیا پن تھا، اس زمانہ کے سیاسی اور معاشرتی نظام کے مقابلہ میں اس کا نظام ہر طرح بہتر تھا، اس لیے رومن امپائر کے سرمایہ دارانہ نظام اور یورپ کی معاشرتی روایات پر اس سے بڑی ضرب کاری لگی۔

یہ تحریریں اسلام کے گڈ کنڈکٹ کے لیے سرٹیفکٹ کے طور پر پیش نہیں کی جارہی ہیں کیوں کہ ان ہی مصنفوں کی تحریروں میں اسلام اور اسلام کے رسولؐ کے خلاف بڑی زہرافشانیاں بھی ملیں گی لیکن یہاں یہ اس لیے پیش کی جارہی ہیں کہ بعض اوقات جادو سر پر بھی چڑھ کر بولتا ہے اور یہ جادو بولے یا نہ بولے، ہم کو جو زریں تعلیمات اسلام کے ذریعہ سے ملی ہیں ان پر ہمیں خود فخر اور ناز کرنا ہے۔

اسلام ایک دین رحمت ہے، اس لیے کہ انسانیت کی تکمیل کے لیے جتنے فضائل اخلاق کی ضرورت ہوسکتی ہے، ان سب کی تعلیم ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دی اور ان پر خود عمل کر کے دکھایا، ایمان، تزکیۂ نفس، زہد، تقویٰ، عفت، پاکبازی، دیانت داری شرم، رحم، عدل، عہد کی پابندی، احسان، عفو و درگذر، خودداری، شجاعت، استقامت، حق گوئی استغنا، محبت اور شفقت وغیرہ کی جو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیمات ہوسکتی ہیں، وہ آپ کے ذریعہ ہم کو ملیں اور جتنے رذائل ہوسکتے ہیں ان سب کی مذمت اور ممانعت کی گئی ہے، ان تعلیمات کے بعد یہ کہنے میں فخر ہوتا ہے کہ اسلام کا رب رب المسلمین ہی نہیں بلکہ رب العالمین ہے اور اس کا رسول رحمۃ للمسلمین کے بجائے رحمۃ للعالمین ہے، اگر کوئی اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے

گریز کرے تو یا تو اس کا یہ مذہبی تعصب ہے یا اسلام کی تعلیمات سے ناواقفیت اس کے بیچ میں حائل ہے یا وہ غلط رائے قائم کرنے کی منفیانہ ذہنیت میں مبتلا ہے۔

اسلامی فن روایت و درایت کا یہ معیار قائم کیا گیا ہے کہ سب سے پہلے ایک واقعہ کی نوعیت کو کلام پاک کی روشنی میں سمجھا جائے، اگر اس میں کامیابی نہ ہو تو احادیث صحیحہ کا سہارا لیا جائے، اگر اس میں بھی ناکامی ہو تو روایات سیرت کی طرف توجہ کی جائے، سیرت کی جو روایتیں اعتبار کے لحاظ سے احادیث کی روایتوں سے فروتر ہوں، ان کے مقابلہ میں احادیث کی روایات کو ترجیح دی جائے، اگر احادیث کی روایتوں میں اختلاف ہو تو اربابِ فقہ و ہوش کی روایتوں کی طرف رجوع کیا جائے، جو روایت عقلی وجوہ، مشاہدۂ عام، اصول مسلمہ اور قرائن حال کے خلاف سمجھی جائے وہ لایق حجت قرار نہ دی جائے، روایات احاد کو موضوع کی اہمیت اور قرائن حال کی مطابقت کے لحاظ سے قبول کرنے کی کوشش کی جائے، روایت و درایت کا یہ معیار اسلام کے غیر مسلم نقادوں کے یہاں نہیں پایا جاتا، وہ اسلامی تاریخ کے کچھ جزئیات یا سنی سنائی روایات یا بعض نامعتبر کتابوں کے واقعات کو ماخذ بنا کر محض اپنے زور بیان اور عیارانہ قوت استدلال سے بود کو نابود، نابود کو بود، وجود کو عدم، عدم کو وجود، سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ بنا دیتے ہیں۔

ہمارا اصلی مسلک تو یہ ہے کہ ہم انسانیت کو سنوارنے کے لیے اس دنیا میں ہیں، ہمارا رب رب العالمین ہے، اس کا بڑا وصف یہ ہے کہ وہ رحمٰن اور رحیم ہے، اس کے کلام کا سرعنوان ہی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہے، اس کی پہلی سورہ الحمد للہ رب العالمین الرحمٰن الرحیم سے شروع ہوتی ہے، اس کی تین سو سے زیادہ آیتوں میں اس کی صفت رحمت کا ذکر ہے، وہ غفور ہے، وہ تواب ہے، وہ ذوالرحمۃ ہے، وہ خیر الراحمین ہے، وہ کریم ہے، وہ حلیم ہے، وہ حفیظ ہے، وہ ستار ہے، وہ غفار ہے، وہ ذوالجلال والاکرام ہے، ہم اس کے سامنے سرتسلیم خم کرنے والے ہیں، تو پھر رحیمی، کریمی، حلیمی اور ستاری سے انحراف کرنا اپنے ایمان میں خلل ڈالنا ہے، ہمارا عقیدہ یہ بھی ہے کہ ہم دنیا کے لیے رحمت اس لیے بھی ہیں کہ ہم رحمۃ للعالمین کے پیرو ہیں۔

جب اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی یعنی ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو

اسلام کا پیام دے کر اس دنیا میں بھیجا تو ارشاد فرمایا:

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ (الانبیاء:۱۰۷)
میں نے آپ کو سارے جہاں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا

پھر فرمایا:

يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِداً وَمُبَشِّراً وَّنَذِيراً وَّدَاعِياً إِلَى اللّٰهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجاً مُّنِيراً (احزاب:۶)
اے پیغمبر! ہم نے تجھ کو گواہی دینے والا، نیکوں کو خوشخبری سنانے والا، غافلوں کو ہشیار کرنے والا، خدا کی طرف اس کے حکم سے پکارنے والا اور ایک روشن کرنے والا چراغ بنا کر بھیجا۔

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِلنَّاسِ بَشِيراً وَّ نَذِيراً (سبا:۲۸)
ہم نے نہیں بھیجا ہے تم کو اے محمد! لیکن تمام انسانوں کے لیے خوشخبری سنانے اور ہشیار کرنے والا بنا کر

جب ہم رحمۃ للعالمین کے پیرو ہونے کے دعویدار ہیں تو ہمارا مقصد حیات یہ ہے کہ ہم روزمرہ کی زندگی میں تمام انسانوں کو خوشخبری سنائیں، غافلوں کو ہشیار کریں تاکہ اپنے رسولؐ کے اسوہ کے پابند ہو کر روشن کرنے والا چراغ بن کر رہیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو یہ حکم دیا:

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالإِحْسَانِ (نحل:۹)
بے شک اللہ سب کے ساتھ عدل، احسان اور سلوک کا حکم دیتا ہے۔

أَحْسِنْ كَمَا أَحْسَنَ اللّٰهُ إِلَيْكَ (قصص:۷)
تم دوسروں کے ساتھ نیکی کرو اور بھلائی کرو جیسا کہ اللہ تمہارے ساتھ بھلائی کرتا ہے۔

اس کے یہ معنی ہیں کہ عدل، احسان، حسن سلوک، نیکی اور بھلائی ہماری زندگی کا بھی نصب العین ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کفر یعنی اس کے وجود سے انکار اور شرک یعنی اس کی ذات میں کسی کی شرکت پسند نہیں کرتا ہے، کافر اور مشرک اس کے باغی ہیں، وہ چاہتا تو کفر اور شرک کا تخیل

انسانی ذہن میں پیدا ہونے ہی نہیں دیتا، یا کافروں اور مشرکوں کو صفحۂ ہستی سے ہمیشہ کے لیے مٹا دیتا مگر دنیا میں برابر کفر بھی رہا اور شرک بھی، کافروں اور مشرکوں کو ہر قسم کا عروج بھی حاصل ہوتا رہا، اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ سے اپنے تمام بندوں کو اپنا فرماں بردار اور اطاعت گذار بنا کر ایک مسلک، ایک عقیدہ اور ایک مذہب کا پابند بنا سکتا تھا مگر اس کا فرمان ہے کہ اس دنیا میں:

فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ (کہف:۲۹)	جو چاہے ایمان لائے، جو چاہے کفر اختیار کرے۔
لاَ إِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (بقرہ:۲۵۶)	دین کے بارے میں کسی قسم کا جبر نہیں ہونا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ نے ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتوں اور کثرت سے خدا کو یاد کرنے والے مرد اور یاد کرنے والی عورتوں کے لیے اجر مقرر کر رکھا ہے اور ان کو اپنی رحمت کا بڑا حصہ دینے کی بشارت بھی دی ہے اور ان کافروں کو جو اس کی باندھی ہوئی حدوں سے گذر جاتے ہیں دردناک عذاب بلکہ ہمیشہ کے لیے آگ میں رکھنے کے انتباہ سے بھی آگاہ کیا ہے مگر ان کو اس دنیا میں آزاد چھوڑ رکھا ہے، جس سے اس کی قدرت کاملہ کی رواداری عیاں ہے، ان کو راہِ راست پر اسلام کے پیام کے ذریعہ سے لانے کی ضرور تلقین کی ہے مگر اس طرح کہ

اُدْعُ إِلَىٰ سَبِيْلِ رَبِّکَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ (نحل:۱۲۵)	اپنے رب کے راستہ کی طرف دانشمندی اور اچھی اچھی باتوں کے ذریعہ بلاؤ اور بہت پسندیدہ طریقہ سے بحث کرو۔

اسی کے ساتھ اس کی بھی تلقین ہے کہ

وَلاَ تَسُبُّوْا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْواً بِغَيْرِ عِلْمٍ (انعام:۱۰۸)	مسلمانو! جو لوگ خدا کے سوا دوسرے معبودوں کی پرستش کرتے ہیں ان کو برا نہ کہو، یہ لوگ نادانی سے خدا کو برا کہنے لگیں گے۔

جب ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم خدا کا آخری پیغام دنیا میں لائے تو آپ کو یہ حکم ملا کہ آپ کا کام صرف خدا کا پیام پہونچا دینا ہے اور بس۔

إِنْ عَلَيْكَ إِلَّا الْبَلَاغُ (شوریٰ:۴۸)	آپ کے ذمہ تو صرف پہونچا دینا ہے۔
وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ الْمُبِيْنُ (نحل:۸۲)	پھر اگر یہ لوگ اعراض کریں تو آپ کے ذمہ تو صاف صاف پہونچانا ہے۔
فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْا انَّمَا عَلَى رَسُوْلِنَا الْبَلَاغُ الْمُبِيْنُ (مائدہ:۹۲)	اگر روگردانی کرو گے تو جان لو کہ ہمارے رسول کے ذمہ صرف صاف صاف پہونچا دینا تھا۔

اگر لوگ روگردانی کریں تو اس کی ذمہ داری ان پر ہے آپ پر نہیں، اس کے جوابدہ وہ ہوں گے آپ نہیں، ان سے حساب لینا اللہ تعالیٰ کا کام ہے، آپ ان پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجے گئے۔

لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُسَيْطِرٍ (غاشیہ:۲۲)	آپ ان پر مسلط نہیں ہیں۔
ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ (غاشیہ:۲۶)	پھر ہمارا ہی کام ان سے حساب لینا ہے۔

اور نہ آپ ان کے نگہبان ومحافظ ہیں۔

وَمَا أَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ (انعام:۱۰۷)	اور نہ آپ ان پر مختار ہیں۔
وَمَا أَرْسَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ وَكِيْلاً (بنی اسرائیل:۵۴)	اور ہم نے آپ کو ان کا ذمہ دار بنا کر نہیں بھیجا۔
فَمَا أَرْسَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظاً (نساء:۸۰)	سو ہم نے آپ کو ان کا نگراں کر کے نہیں بھیجا۔

جن لوگوں نے اللہ کے سوا دوسرے کارساز ٹھہرا رکھے ہیں، اللہ خود ان کا حال دیکھتا رہتا ہے۔

وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ، اَللّٰهُ حَفِيظٌ عَلَيْهِمْ (شوریٰ:٦)	اور جن لوگوں نے خدا کے سوا دوسرے کارساز قرار دے رکھے ہیں، اللہ ان کی دیکھ بھال کر رہا ہے۔

جس نے اس کے رسول کی ہدایت کے مطابق سیدھی راہ اختیار کی، وہ تو اپنے ہی لیے اختیار کرتا ہے اور جو بھٹکا وہ بھٹک کر اپنا ہی کھوتا ہے۔

مَنِ اهْتَدٰى فَإِنَّمَا يَهْتَدِىْ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا (بنی اسرائیل:۱۵)	جو شخص راہ پر چلتا ہے وہ اپنے نفع کے لیے راہ پر چلتا ہے اور جو شخص بے راہی کرتا ہے سو وہ بھی اپنے نقصان کے لیے بے راہ ہوتا ہے۔

ان آیتوں سے ظاہر ہے کہ اسلام کی تعلیم یہی ہے کہ اسلام کے پیام سے روگردانی کرنے والوں سے کوئی تعرض نہ کیا جائے، ان پر کوئی زور، جبر اور زبردستی نہ کی جائے۔

تبلیغ اسلام کی نوعیت: اور زور، جبر اور زبردستی کا کیا سوال ہے بلکہ اسلام کی تبلیغ کی ابتدا تو جبر، زور اور زبردستی کے جس معاندانہ ماحول میں ہوئی وہ انسانی تاریخ کی دردناک لیکن تابناک مثال ہے، اسلام کا آغاز مظلومیت، بے چارگی اور بے بسی سے ہوا، قریش، یہود اور نصاریٰ سب ہی اس کے مخالف تھے، اسی لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم ہوا کہ اس کا آغاز اپنے گھر اور نرمی سے کرو اور وہ نہ مانیں تو ان سے تعرض نہ کرو، ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔

وَأَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْأَقْرَبِيْنَ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فَإِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ إِنِّيْ بَرِيْءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ (شعراء:۱۱)	اور اپنے نزدیک کے خاندان والوں کو (اللہ سے) ڈرا اور اپنی پیروی کرنے والے مومنین کے لیے نرم ہو جا، اگر تیری بات نہ مانیں تو کہہ دے کہ میں تمہارے اعمال سے بری ہوں۔

حضرت خدیجہؓ سب سے پہلے ایمان لائیں، پھر حضرت علیؓ کو یہ شرف حاصل ہوا جن کی عمر اس وقت دس سال کی تھی، آپ کے غلام زیدؓ بن حارثہ بھی حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے، قریش کے سرداروں میں پہلے حضرت ابوبکرؓ آپ کے گرویدہ ہوئے، حضرت عمارؓ اور حضرت سعید بن زیدؓ نے بھی آپ کی دعوت کو قبول کیا، عورتوں میں حضرت خدیجہؓ کے علاوہ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباسؓ کی بیوی ام الفضلؓ، اسماء بنت عمیسؓ، اسماء بنت ابوبکرؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کی بہن حضرت فاطمہ بھی اس چھوٹے سے کارواں میں شریک ہوئیں، حضرت ابوبکرؓ کی مساعی سے حضرت عثمان غنی، حضرت زبیرؓ، حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف، حضرت طلحہؓ اور سعدؓ بن ابی وقاص بھی مسلمان ہوئے، اس جماعت کی تعداد بڑھنے میں تین سال لگ گئے، غیر مسلموں کے خوف سے اس کی تبلیغ خاموشی سے ہوتی رہی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی ایذا رسانی کے ڈر سے مکہ سے باہر جا کر پہاڑ کی گھاٹیوں میں مسلمانوں کے ساتھ نماز ادا کرتے، وہاں بھی غیر مسلم پہونچ کر جھگڑا کرتے، جس سے خون بہنے کی نوبت آجاتی۔ (تاریخ طبری ج ۱، حصہ سوم عربی، ص ۱۱۶۹، اردو ص ۷۵) نبوت کے تین سال کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو حکم ملا:

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ — پس تجھ کو جو حکم دیا گیا ہے اس کو کھل کر کہہ دے اور مشرکین سے دور ہو جا۔

اس حکم کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کے گلی کوچوں میں جا کر اسلام کی تبلیغ شروع کی، کبھی دعوت میں بلا کر احکامِ الٰہی سناتے، کبھی کوہ صفا پر چڑھ کر پیام دیتے، مکہ کے غیر مسلموں نے آپ کی اس تبلیغی مہم کو پسند نہیں کیا، ابولہب کے ساتھ مکہ کے اور سرداروں نے آپ کے خلاف مہم شروع کی، آپؐ کے راستہ میں کانٹے بچھائے گئے، آپؐ کے دروازے پر غلاظتیں پھینکی گئیں، ان ایذا رسانیوں سے عاجز ہو جاتے تو آپ صرف اتنا فرماتے: ''فرزندانِ عبد مناف کیا ہمسایگی کا یہی حق ہے جو ادا کر رہے ہو؟ (طبری ج ۱ حصہ سوم عربی ص ۱۱۹۹، اردو ص ۱۰۰) ایک روز آپؐ خانۂ کعبہ میں نماز ادا کر رہے تھے تو آپ جب سجدے میں گئے تو عقبہ بن ابی معیط نے آپ کی گردن مبارک میں چادر ڈال کر اس کو کھینچنا شروع کیا، ایک اور موقع پر جب آپ نماز میں مصروف تھے تو ابوجہل کے اشارے پر اونٹ کی اوجھڑی آپ کی پشت مبارک پر ڈال دی گئی، آپؐ کو شاعر، مجنون، ساحر، اوروں سے سن سن کر افسانے بنانے والا، قوم میں پھوٹ ڈالنے والا، مکہ کو اجاڑنے والا، بھائی کو بھائی سے، بیٹے کو ماں سے جدا کرنے والا کہا گیا، نبوت کے چھٹے سال ایک روز آپ صلی اللہ علیہ وسلم

خانۂ کعبہ میں وعظ کہہ رہے تھے تو ابو جہل وہاں پہونچ گیا، اس نے آپ ؐ کو گالیاں دیں، پھر بری طرح ستایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی جواب نہیں دیا، بے بسی کے ساتھ گھر واپس ہو گئے، آپ ؐ کے دوسرے چچا حضرت حمزہؓ اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، ان کو ابو جہل کی زیادتی کی خبر ہوئی تو آپ ؐ کی مظلومیت سے متاثر ہوئے، ابو جہل کے پاس پہونچے، اس کے سر پر اس زور سے کمان ماری کہ وہ زخمی ہو گیا اور جب ابو جہل کے حامی ان سے الجھے تو وہ اسی وقت مسلمان ہو گئے۔ (مستدرک حاکم ج ۳ ص ۱۹۳، طبری ج ۱ حصہ سوم عربی ص ۱۱۸۷، اردو ص ۹۰، سیرۃ النبیؐ ج ۱ ص ۲۲۳، مہاجرین حصہ اول ص ۱۷۰)

تبلیغ میں آلام و مصائب: حضرت عمرؓ اور ان کے گھر والے اسلام لائے تو اسلام کی قوت بڑھی، مسلمان اب تک چھپ کر اپنے گھروں میں نماز ادا کیا کرتے تھے، اب کعبہ میں جا کر پڑھنے لگے، اس سے غیر مسلموں کا اشتعال اور بھی بڑھا، انھوں نے بنو ہاشم کا مقاطعہ شروع کر دیا، ان سے رشتے ناطے اور لین دین بند کر دئے، ان کا گلیوں میں نکلنا روک دیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجبوراً گھر بار چھوڑ کر اپنے فدائیوں کے ساتھ شعب ابی طالب کی گھاٹیوں میں پناہ لی، یہاں تین برس تک پناہ گزیں رہے، کھانے پینے کے سامان کی کمی کی وجہ سے بچے بھوک سے بلکتے رہتے، پناہ گزیں پتیاں کھا کھا کر صبر و استقلال سے دن کاٹتے رہے، تین سال کے بعد غیر مسلموں نے ان کو گھر آنے کی اجازت دی۔ (طبقات ابن سعد ج ۱ ص ۱۳۹، سیرۃ النبیؐ ج ۱ ص ۲۴۵)

یہاں سے نکلنے کے بعد آپ مکہ سے باہر نکل کر تبلیغ کے لیے زید بن حارثہ کے ساتھ طائف تشریف لے گئے، وہاں آپ کو پتھروں سے اس طرح لہولہان کیا گیا کہ آپ زخموں سے نڈھال ہو کر بیٹھ جاتے، زید بن حارثہ بازو تھام کر کھڑا کر دیتے، طائف سے واپس ہوئے تو آپ ؐ پر مایوسی طاری نہیں تھی، ان مخالفوں کے لیے تباہی کی کوئی بددعا بھی نہیں کی، آپ ؐ کو یقین تھا کہ اگر اس وقت وہ سیدھی راہ پر نہیں آئے ہیں تو ان کی آیندہ نسلیں ضرور خدائے واحد پر ایمان لے آئیں گی، اس لیے بددعا کے بجائے آپ ؐ نے یہ درد انگیز دعائیں مانگیں:

"خداوندا! میں اپنی کمزوری، بے سروسامانی اورلوگوں کے مقابلہ میں اپنی مجبوری کی شکایت تجھ سے کرتاہوں، اے ارحم الراحمین! تو کمزوروں کا رب ہے، تو میرا رب ہے، تو مجھے کس کے سپرد کرتا ہے، کسی اجنبی کے جو مجھ پر ظلم کرے یا تو نے میرے معاملہ کو کسی دشمن کے حوالہ کر دیا ہے، اگر تو مجھ سے ناراض نہیں ہے تو میں ان مصائب کی پروانہیں کرتا، تیری حمایت میرے لیے بہت زیادہ وسیع ہے، میں تیرے اس نور کی پناہ میں آتا ہوں جس سے تمام تاریکیاں روشن ہوگئی ہیں اور جس پر دنیا و آخرت میں کامیابی کا مدار ہے، اس بات سے پناہ مانگتا ہوں کہ تیرا غصہ اور غضب مجھ پر نازل ہو، بے شک جب تک چاہے تجھے عتاب کرنے کا حق ہے اور ہر قسم کی طاقت اور قوت حاصل ہے۔" (تاریخ طبری ج ۱ حصہ سوم عربی ص ۱۲۱، اردو ترجمہ ص ۱۰۲-۱۰۱)

اس دعا سے ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی تبلیغی مہم کے لیے زور اور زبردستی کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغی مہم جاری رہی، حج کا زمانہ آتا تو زائرین خانہ کعبہ کے پاس پہونچتے اور اللہ کا پیام سناتے، عرب میں مختلف مقامات پر میلے لگتے تھے، جن میں عکاظ، مجنہ اور ذوالمجاز کے میلے مشہور تھے، آپ وہاں بھی پہونچ کر توحید کا درس دیتے، بنو عامر، محارب، فزارۃ، غسان، مرۃ، حنیفہ، سلیم، عبس، بنونصر، کندہ، کلب، حارث بن کعب، عذرۃ اور حضارمۃ جیسے قبیلوں میں بھی ایک تبلیغی مشنری کی حیثیت سے پہونچے، ابولہب آپؐ کے پیچھے پیچھے جاتا اور جو کچھ آپ فرماتے، اس کی تکذیب کی کوشش کرتا۔ (مستدرک حاکم ج ۱ ص ۱۵، سیرۃ النبیؐ ج ۱ ص ۲۵۲-۵۳)

اسلام کی راہ میں صحابۂ کرام کے مصائب: پھر مکہ کے جو لوگ اسلام لائے، ان کی ایذا رسانی کی بھی کوئی حد نہ تھی، حضرت بلالؓ کے آقا امیہ بن خلف نے ان کو گرم ریت پر لٹایا، تپتا ہوا پتھر ان کے سینے پر رکھا، ان کی مشکیں باندھ کر ستایا، ان کی گردن میں رسی ڈال کر

مکہ کی پہاڑیوں میں گھسٹوایا، ان تمام مصیبتوں میں ان کی زبان سے صرف اَحَد اَحَد کے نعرے نکلتے رہے۔ (اسد الغابۃ ج اص ۲۰۶، مہاجرین ج اص ۱۸۷)

حضرت عثمانؓ ابن عفان مسلمان ہوئے تو ان کے چچا نے کھجور کی رسی سے باندھ کر مارا (طبقات ابن سعد، تذکرۂ حضرت عثمانؓ بن عفان، سیرۃ النبیؐ ج اص ۲۳۲، تاریخ اسلام از شاہ معین الدین احمد ندوی ج اص ۲۴۶) حضرت زبیرؓ بن العوام جب سولہ برس کے تھے تو اسلام لائے، غیر مسلموں نے ان کو چٹائی میں لپیٹ کر باندھ دیا اور اس قدر دھواں دیا کہ ان کا دم گھٹنے لگا، ان کی زبان سے صرف یہ نکلا کہ کچھ کرو، اب میں کافر نہیں ہوسکتا۔ (اصابہ ج ا، تذکرہ زبیرؓ، مہاجرین حصہ اول ص ۹۷)

حضرت طلحہؓ سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں ایمان لائے تو ان کے حقیقی بھائی نے ان کو اور حضرت ابوبکرؓ کو ایک ہی رسی میں باندھ کر مارا۔ (اسد الغابہ ج ۳ ص ۵۹، مہاجرین حصہ اول ص ۱۰۰-۹۹)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اسلام لائے تو غیر مسلموں کے سامنے کلام پاک پڑھنا شروع کیا، انھوں نے ان کو اتنا مارا کہ ان کا چہرہ ورم کر گیا پھر بھی ان کی زبان بند نہیں ہوئی اور صرف اتنا کہا کہ دشمنان خدا آج سے زیادہ میری نظر میں کبھی ذلیل نہ تھے۔ (اسد الغابہ، تذکرہ عبداللہ بن مسعود، مہاجرین حصہ اول ص ۳۶۵)

حضرت عمارؓ بن یاسر جب حلقہ بگوش اسلام ہوئے تو غیر مسلموں نے ان کو دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹا دیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس طرف سے گذرے تو ان کے سر پر دست مبارک پھیر کر صرف اتنا فرمایا: ''اے آگ! تو ابراہیمؑ کی طرح عمار پر ٹھنڈی ہوجا'' حضرت عمارؓ کی والدہ حضرت سمیہؓ کو ابوجہل نے نہایت بے رحمی سے اپنے نیزہ سے شہید کیا، حضرت عمارؓ کے والد حضرت یاسرؓ اور ان کے بھائی حضرت عبداللہؓ بھی اسی راہ میں جاں بحق ہوئے، ایک بار حضرت یاسرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس ایذا رسانی کی شکایت کی تو آپؐ نے فرمایا: ''صبر کرو، صبر کرو'' پھر دعا کی کہ ''اے خدا! آل یاسر کو بخش دے'' آپؐ جب حضرت عمارؓ کے گھر سے گذرتے تو اس خاندان کی مصیبت کو دیکھ کر فرماتے ''اے آل عمار!

تمھیں بشارت ہو، جنت تمھاری منتظر ہے" (طبقات ابن سعد قسم اول جز ثالث ص ۱۷۸، مہاجرین حصہ اول ص ۳۳۴)

حضرت صہیب بن سنانؓ مکہ میں غیر مسلموں کے مظالم سے تنگ آ گئے تو مدینہ ہجرت کرنے کو تیار ہوئے، غیر مسلم سد راہ ہوئے تو انھوں نے ان کو اپنا ترکش دکھا کر کہا: "تم جانتے ہو کہ میں تم لوگوں سے زیادہ صحیح نشانہ باز ہوں، خدا کی قسم جب تک اس میں ایک تیر بھی ہے، تم میرے قریب نہیں آسکتے، اس کے بعد اپنی تلوار سے تمھارا مقابلہ کروں گا، اگر مال و دولت چاہتے ہو تو اس کو لے کر میرا راستہ چھوڑ دو، یہ غیر مسلم اس پر راضی ہو گئے اور حضرت صہیبؓ اپنا سب کچھ لٹا کر اپنے ایمان کی خاطر مدینہ پہونچ گئے۔ (طبقات ابن سعد قسم اول جز ثالث ص ۱۶۳، مہاجرین حصہ اول ص ۳۵۶)

حضرت عثمانؓ بن مظعون سے برہم ہو کر ایک غیر مسلم نے ان کو اس زور سے طمانچہ مارا کہ ان کی ایک آنکھ زرد پڑ گئی، جب ان کی توجہ اس طرف دلائی گئی تو بولے: خدا کی حمایت سب سے زیادہ باامن و ذی عزت یہ ہے اور جو میری آنکھ صحیح ہے وہ بھی اپنے رفیق کے صدمہ میں شریک ہونے کی متمنی ہے۔ (اسد الغابہ ج ۳ ص ۸۶-۳۸۵، مہاجرین حصہ اول ص ۹۷-۳۷۸)

صحابۂ کرام کے مشرف بہ اسلام ہونے پر ان غیر مسلموں کی طرف سے جو مظالم ڈھائے گئے ان کی اسی طرح کی اور مثالیں بکثرت ہیں، گھر سے ان کا نکلنا مشکل تھا، ان کی جانیں غیر محفوظ تھیں، وہ علانیہ عبادت بھی نہیں کر سکتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ان مظالم سے بچنے کے لیے حبشہ ہجرت کرنے کو فرمایا، پہلا قافلہ گیارہ مرد اور چار عورتوں پر مشتمل تھا، اس میں حضرت عثمانؓ بن عفان بھی تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت رقیہؓ بھی تھیں، جو حضرت عثمانؓ سے بیاہی ہوئی تھیں، حبش کے بادشاہ نجاشی پر مکہ کے غیر مسلموں نے دباؤ ڈالا کہ ان کو اپنے یہاں سے نکال دے، نجاشی نے ان مہاجروں کو اپنے سامنے طلب کر کے ان سے پوچھا کہ تمھارا مذہب آخر ہم لوگوں کے مذہب سے کیا نرالا ہے جو تم نے اپنا آبائی مذہب چھوڑ دیا ہے، اس کا جواب حضرت جعفرؓ نے بہت

ہی موثر انداز میں دیا، بادشاہ کے سامنے نڈر ہوکر ایک تقریر کی، جس میں یہ بتایا کہ ہم ایک جاہل قوم تھے، بتوں کو پوجتے تھے، مردے کھایا کرتے تھے، بدکاریوں کے عادی تھے، دلوں میں رحم نہ تھا، پڑوسیوں کے ساتھ برابرتاؤ رکھتے، ہمارا زبردست فرد دوسرے زبردست فرد کو کھاجاتا، اتنے میں ایک ایسا پیغمبر مبعوث ہوا جس کے صدق، امانت، شرافت کو ہم جانتے ہیں، اس نے ہم کو خدائے واحد کی طرف بلایا اور سکھلایا کہ ہم پتھروں کو پوجنا چھوڑ دیں، ہم کو بتایا کہ ہم سچ بولیں، امانت ادا کریں، صلہ رحمی کریں، پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئیں، حرام باتوں اور خون ریزی سے احتراز کریں، فواحش سے باز آئیں، جھوٹ نہ بولیں، یتیم کا مال نہ کھائیں، عورتوں پر تہمت نہ لگائیں، خدائے واحد کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کریں، نماز پڑھیں، روزے رکھیں، ہم نے اس کو مانا، اس پر ایمان لائے، اب جب کہ ہم نے شرک چھوڑ کر خداپرستی اختیار کی، حلال کو حلال اور حرام کو حرام جانا تو اس پر ہماری قوم دشمن ہوگئی ہے، ہم کو طرح طرح کی تکلیفیں پہونچانے لگی کہ ہم خداپرستی کو چھوڑ کر پھر اصنام پرستی شروع کردیں۔ (سیرۃ ابن ہشام ج ۱ ص ۱۸۲-۱۸۱، سیرۃ النبیؐ ج ۱ ص ۲۳۸، مہاجرین ج ۱ ص ۴۵)

سیرۃ ابن ہشام کے مؤلف کا بیان ہے کہ اس تقریر کو سن کر نجاشی اور اس کے درباری اسقف پر رقت طاری ہوگئی اور نجاشی نے کہا کہ یہ اور عیسیٰؑ کا لایا ہوا مذہب ایک ہی چراغ کے دو پرتو ہیں۔

یہ مہاجرین کچھ دنوں حبشہ میں رہ کر پھر مکہ واپس آگئے، لیکن ان کے مصائب ابھی ختم نہیں ہوئے، غیر مسلموں کے مظالم پھر بڑھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ حبشہ کی ہجرت کی اجازت دے دی، ۸۳ مردوں اور ۲۰ عورتوں کا یہ قافلہ پھر کسی نہ کسی طرح حبشہ روانہ ہوگیا۔

ان ناسازگار حالات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ جاری رہی، رفتہ رفتہ بنو ہاشم، موالی بنو ہاشم، بنو مطلب، بنو مطلب کے حلیف، بنو عبد شمس، بنو شمس کے حلیف بنو نوفل، بنو اسد، بنو عبد دار، بنو عبد بن قصی، بنو زہرہ بن کلاب، بنو تیم بن مرہ، بنو مخزوم ابن

یقظہ، بنو عدی، بنو سہم، بنی جمح، بنو عامر بن لوئی، بنو فہرس، مالک، بنو اسد بن عبدالعزی، بنو عبدالدار بن قصی اور ان کے حلیفوں میں سے کچھ لوگوں نے اسلام قبول کرلیا۔ (مزید تفصیلات کے لیے دیکھو مہاجرین حصہ اول مقدمہ ص ۵۷-۵۰) پھر بھی ان کی تعداد غیر مسلموں سے بہت کم تھی، جن کی ایذا رسانیاں جاری رہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حج کے موقع پر تبلیغ اسلام فرماتے رہتے تھے، مدینہ کے لوگ آپؐ کی تعلیم سے متاثر ہوکر اسلام قبول کرنے لگے تو مدینہ دارالامن بن گیا، یہاں پناہ ملنے کی امید ہوئی تو مسلمانوں کی ہجرت شروع ہوگئی، یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے پہلے وہاں کافی مسلمان پہونچ گئے، یہ جلاوطنی اسلام کی راہ میں بہت بڑی قربانی تھی۔

مسلمانوں پر جو مظالم ڈھائے جارہے تھے، اس سے متاثر ہوکر ایک صحابی نے عرض کیا کہ ان دشمنوں کے حق میں بددعا فرمائیں، یہ سن کر آپ کا چہرۂ مبارک سرخ ہوگیا (صحیح بخاری بعثۃ النبی، سیرۃ النبیؐ ج ۲ ص ۳۷۸) ایک دوسرے موقع پر چند صحابیوں نے دشمنوں کے لیے اسی قسم کی بات کہی تو فرمایا: میں دنیا کے لیے لعنت نہیں بلکہ رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں (مشکوٰۃ، اخلاق النبی بحوالہ صحیح مسلم، سیرۃ النبیؐ ج ۲ ص ۳۷۸) مکہ میں جن دنوں مسلمانوں پر مظالم ہورہے تھے تو سخت قحط پڑا، لوگ ہڈی اور مردار کھانے لگے، آپؐ کے شدید دشمن ابوسفیان نے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا کہ محمد! تمہاری قوم ہلاک ہورہی ہے، اللہ سے دعا کرو کہ یہ مصیبت جاتی رہے، آپؐ نے فوراً دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور اللہ تعالیٰ نے اس مصیبت کو دور کردیا۔ (صحیح بخاری، تفسیر دخان ج ۲، سیرۃ النبیؐ ج ۲ ص ۳۷۹)

طائف میں جب آپؐ کی دعوت پہونچی تو وہاں کے لوگوں نے مبلغینِ اسلام پر بڑے مظالم ڈھائے، ان کو بکثرت ہلاک کیا، صحابہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ان کے حق میں بددعا کیجیے، آپ ہاتھ اٹھاتے ہیں لوگ سمجھتے ہیں کہ آپؐ بددعا فرمارہے ہیں لیکن آپ یہ فرمارہے تھے: ''خداوندا! ثقیف (اہل طائف) کو اسلام نصیب کر اور دوستانہ ان کو مدینہ لا اور یہ دعا قبول ہوکر رہی''۔ (ابن سعد، غزوۂ طائف سیرۃ

النبی ج ۲ص ۳۷۹) اسی طرح آپؐ سے اوس کے قبیلہ کے لیے دعا کرنے کو کہا گیا تو آپؐ نے ان کے لیے یہ دعا فرمائی: ''خداوندا! اس کو ہدایت کر اور ان کو لا'' (صحیح مسلم، مناقب اوس سیرۃ النبیؐ ج ۲، ص ۳۸۸)

ان ایذارسانیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا شبلیؒ تحریر فرماتے ہیں:

''دنیا کی تاریخ میں کوئی ایسی مثال نہیں کہ نامانوس اور اجنبی صدائیں بہ رغبت سن لی گئی ہوں، حضرت نوح علیہ السلام کو سینکڑوں برس تک قوم کی نفرت اور دہشت کا سامنا رہا، یونان دنیا کی شائستگی کا معلم اول ہے، تاہم اسی حکمت کدہ میں سقراط کو زہر کا پیالہ پینا پڑا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دار ورسن کا منظر پیش آیا، اس بنا پر عرب اور قریش نے جو کچھ کیا وہ سلسلۂ واقعات کی غیر معمولی کڑی نہ تھی لیکن غور طلب یہ ہے کہ اس کے مقابلہ میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا کیا؟ سقراط زہر کا پیالہ پی کر فنا ہوگیا، حضرت نوح علیہ السلام نے مخالفت سے تنگ آکر ایک قیامت خیز طوفان کی استدعا کی اور دنیا کو ایک بڑا حصہ برباد ہوگیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام تیس چالیس شخصوں کی مختصر جماعت پیدا کر کے بروایت نصاریٰ سولی پر چڑھ گئے لیکن سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا فرض ان سب سے بالاتر تھا خباب بن الارت نے جب قریش کی ایذارسانی سے تنگ ہو کر آپ کی خدمت میں عرض کی کہ آپ ان کے حق میں بددعا کیوں نہیں فرماتے تو آپ کا چہرہ سرخ ہوگیا اور فرمایا کہ تم سے پہلے وہ لوگ گذر چکے ہیں جن کے سر پر آرے چلائے جاتے اور چیر ڈالے جاتے تھے، تاہم وہ اپنے فرض سے باز نہ آئے، خدا اس کام کو پورا کرے گا، یہاں تک کہ شتر سوار صنعاء سے حضر موت تک سفر کرے گا اور اس کو خدا کے سوا کسی کا ڈر نہ ہوگا، کیا یہ پیشین گوئی حرف بہ حرف پوری نہیں ہوئی''۔ (سیرۃ النبیؐ ج ۱ ص ۲۳۹-۲۳۸)

یہ تفصیلات پہلی دفعہ پیش نہیں کی جارہی ہیں، اسلام کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے

والوں کے لیے عام ہیں، ان کو یہاں پر مختصر طریقہ سے دہرانے کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہمارے ناظرین کے سامنے ایک بار پھر یہ حقیقت سامنے آجائے کہ ظالم، قاہر، جابر اور عدم رواداری کون تھا اور کون مظلوم، مقہور، مجبور اور رواداربن کر رہا، تشدد کس طرف سے ہوا اور عدم تشدد کس نے اپنا وطیرہ بنایا، نہتا کون تھا، اسلام زور و جبر اور سختی سے پھیلا یا ایثار، قربانی، امن پسندی، صلح جوئی، بے سروسامانی، پرامن تبلیغ، جذبۂ فدائیت، صبر، تحمل، بردباری اور رواداری سے بڑا اور بڑھتا گیا۔

ہجرت: آپؐ کی ایذا رسانی سے غیر مسلموں کو تسکین نہیں ہوئی تو انھوں نے آپؐ کے سر مبارک کو قلم کرنے کا ایک بڑا انعام مقرر کیا، جب کوئی قتل نہ کر سکا تو عرب کے ہر قبیلہ کے سرداروں نے آپؐ کے قتل کے لیے آپ کا گھر گھیر لیا، جس کے بعد آپؐ نے حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ گھر چھوڑ کر غار ثور میں پناہ لی، گھر چھوڑ رہے تھے تو کعبہ کو دیکھا اور فرمایا: ''مکہ! تو مجھ کو دنیا سے زیادہ عزیز ہے لیکن تیرے فرزند مجھ کو رہنے نہیں دیتے، یہ ایک دردانگیز اور دل فگار صدا تھی، تین روز تک غار ثور میں پناہ لینے کے بعد مدینہ کی طرف بڑھے، غیر مسلموں نے آپؐ کی گرفتاری پر ایک سو اونٹوں کا انعام مشتہر کیا، اس لالچ میں سراقہ بن جعشم نے آپؐ کا تعاقب کیا مگر رحمۃ للعالمین کے ساتھ رب العالمین کی تائید تھی، آپ اپنے یار غار حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ مدینہ محفوظ پہونچ گئے، اس موقع پر اپنے تمام اہل و عیال کو اللہ تعالیٰ کے حوالہ کر کے مکہ ہی میں چھوڑ دیا تھا، جس میں آپؐ کی بیٹیاں حضرت فاطمہؓ اور حضرت زینب اور چہیتی بیوی حضرت عایشہؓ بھی تھیں (صحیح بخاری ہجرۃ النبی و سیرۃ النبیؐ ج ۱ ص ۲۷۱) اسماء بنت ابوبکرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور میرے باپ حضرت ابوبکرؓ کے جانے کے بعد قریش کے کچھ لوگ جن میں ابوجہل بن ہشام بھی تھا، میرے یہاں آئے اور دروازہ پر آکر کھڑے ہوگئے، میں اندر سے نکل کر ان کے پاس آئی، انھوں نے پوچھا تمہارے باپ ابوبکر کہاں ہیں؟ میں نے کہا اللہ کی قسم مجھے معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہیں، اس پر ابوجہل نے جو بہت ہی خبیث اور زشت خو تھا، میرے گال پر اس زور سے طمانچہ مارا کہ میرے کان کی بالی گر پڑی، اس کے بعد وہ سب چلے گئے تین دن تک مجھے معلوم نہ ہو سکا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کہاں ہیں۔(طبری ج ۱ حصہ سوم ص ۱۲۴۰، اردو ترجمہ ص ۱۳۲)

غزوات جارحانہ تھے یا مدافعانہ؟: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں سکونت پذیر ہوئے تو اس جرم میں کہ انصار نے مسلمانوں کو پناہ دی، قریش نے مدینہ کو برباد کرنے کا فیصلہ کیا، اس وقت مسلمانوں کے نیام سے ضرور تلواریں نکلیں، مدینہ کے قیام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ۲ھ میں بدر اور سویق، ۳ھ میں احد، ۴ھ میں مریسیع، ۷ھ میں خیبر، ۸ھ میں موتہ، حنین اور اوطاس وغیرہ میں لڑائیاں لڑنی پڑیں، مگر یہ ساری لڑائیاں ان دشمنوں کے خلاف تھیں جو حملہ آور ہو کر اسلام اور مسلمانوں کا استیصال چاہتے تھے، آیندہ صفحات سے ظاہر ہوگا کہ اسلام کے خلاف تلواریں اٹھیں تو اسلام کے نیام سے بھی تلواریں نکل پڑیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے جاں نثاروں کے ساتھ مدینہ منورہ میں آکر ابھی اچھی طرح سکونت پذیر بھی نہیں ہوئے تھے کہ مکہ کے غیر مسلموں کا ایک خط مدینہ کے ایک بڑے سردار عبداللہ بن ابی کے نام پہونچا کہ تم نے ہمارے آدمیوں کو اپنے یہاں پناہ دی، ہم خدا کی قسم کھاتے ہیں کہ تم لوگ ان کو قتل کر ڈالو یا مدینہ سے نکال دو، ورنہ ہم سب لوگ تم پر حملہ کریں گے اور تم کو فنا کر کے تمہاری عورتوں پر تصرف کریں گے۔(بخاری باب التسلیم من المسلمین والمشرکین، سیرۃ النبیؐ ج ۱ ص ۳۰۵) اس دھمکی کے بعد مدینہ میں مسلمانوں کی نیند حرام ہوگئی، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم راتوں کو جاگتے، صحابہ صبح تک ہتھیار باندھ کر سوتے، ۲ھ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ملا:

قَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ (بقرہ:۲۴) — اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو، جو تم سے لڑتے ہیں۔

اس آیت سے ظاہر ہے کہ مسلمان اللہ کی خاطر ان سے لڑیں جو ان سے لڑتے ہیں، یہ حکم نہیں ہے کہ اللہ کی راہ میں ہر کس و ناکس سے لڑیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حفاظت خود اختیاری میں جہاں اور تدبیریں کیں، وہاں قبائل سے معاہدے بھی کیے تاکہ وہ مکہ کے حملہ آوروں سے مل کر آپؐ کے لیے خطرناک نہ بن جائیں، آپ نے جہینہ، بنوضمرہ

اور بنومدلج سے بڑے فراخدلانہ شرائط طے کیے، مثلاً جہینہ کے قبیلہ سے یہ معاہدہ ہوا کہ وہ بالکل غیر جانبدار رہیں گے، بنوضمرہ سے یہ طے ہوا کہ ان لوگوں کے جان و مال محفوظ رہیں گے اور جو شخص ان پر حملہ کرے گا اس کے مقابلہ میں ان کی مدد کی جائے گی، بجز اس صورت کے کہ یہ لوگ مذہب کے مقابلہ میں لڑیں اور پیغمبر جب ان کو مدد کے لیے بلائیں گے تو یہ مدد کو آئیں گے، بنومدلج سے بھی اسی قسم کا معاہدہ ہوا۔ (زرقانی ج ا ص ۴۵۹، سیرۃ النبیؐ ج ا ص ۱۲-۳۱۰)

احتیاطی تدبیر ہی کے سلسلہ میں آپؐ نے حضرت عبداللہؓ بن جحش کو بارہ آدمیوں کے ساتھ نخلہ بھیجا جو مکہ اور طائف کے درمیان تھا تاکہ وہ قریش کی جنگی کارروائیوں اور سرگرمیوں کی خبروں سے آپؐ کو وہاں سے مطلع کرتے رہیں، نخلہ کے قیام کے زمانہ میں مکہ کے چند معزز اشخاص شام سے منقے، چمڑے اور تجارتی مال لے کر آرہے تھے، حضرت عبداللہؓ نے ان پر حملہ کردیا اور ان کے ایک اہم آدمی عمرو بن الحضرمی کو قتل کردیا اور دو شخص کو گرفتار کرلیا، ان کو اور مال غنیمت کو لے کر حضرت عبداللہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؐ کو بڑا دکھ ہوا اور فرمایا: ''میں نے تم کو ماہ حرام میں قتال کا حکم نہیں دیا تھا'' مال غنیمت لینے سے انکار کردیا، صحابہؓ بھی حضرت عبداللہؓ سے برہم ہوئے کہ تم وہ کرگذرے جس کا حکم تم کو نہ تھا، مکہ کے غیر مسلم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ کرنے کے لیے بے تاب ہی تھے، یہ واقعہ ان کے لیے مزید بہانہ تھا، ابن حضرمی کے خون کا خون بہا ادا کرنے کی کوشش کی گئی مگر ابوجہل نے ابن حضرمی کے بھائی عامر کو اس پر رضامند ہونے نہیں دیا، غیر مسلم مدینہ کی طرف جارحانہ حملہ کے لیے بڑھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے نکل کر بدر کے میدان میں ان سے صف آرا ہوئے، آپؐ کے ساتھ تین سو دس آدمی تھے، دشمنوں کی تعداد تین گنی زیادہ تھی، ان کے ساتھ ایک ہزار آدمی تھے، جن میں سو سواروں کا رسالہ بھی تھا، قریش کے تمام سردار حملہ آوروں کے ساتھ تھے، صرف ابولہب کسی مجبوری کی وجہ سے نہ آسکا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کھجور کی ایک جھونپڑی بنادی گئی آپؐ اسی میں فروکش ہوئے۔ (طبری ج ا ص ۱۸۲، اردو ترجمہ) میدان جنگ میں پانی کی کمی تھی،

بارش ہوئی تو پانی جمع کرلیا گیا مگر دشمنوں کو کافی پانی نہ مل سکا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنی سمت سے پانی لینے کی اجازت دے دی۔ (ابن ہشام ج ۲، ص ۱۶) لڑائی شروع ہوئی تو آپؐ یہ دعا فرماتے رہے:

> ”خداوندا! یہ قریش غرور اور نخوت کے ساتھ تجھ سے لڑنے اور تیرے رسول کو جھٹلانے آگئے ہیں، تو نے جو مجھ سے نصرت کا وعدہ فرمایا ہے اسے پورا کر اور آج ہی ان کا خاتمہ کردے“۔ (طبری ج ۱، اردو ترجمہ ۳، ۱۸ عربی ۱۲۸۸)
>
> ”خداوندا! اگر یہ مسلمانوں کی جماعت ہلاک ہوگئی تو پھر آج کے بعد دنیا میں کوئی تیرا پرستار نہ رہے گا۔
>
> اے بارالٰہ! تو نے جو وعدہ مجھ سے کیا ہے اسے پورا کر، اگر مسلمانوں کی یہ جماعت ہلاک ہوگئی تو تیری عبادت موقوف ہوجائے گی“۔
>
> (طبری ج ۱، اردو ترجمہ ص ۱۸۹، عربی ص ۱۳۱۹)

آپؐ اسی طرح کی دعاؤں میں برابر مصروف رہے، کچھ اس الحاح وزاری میں آپؐ کی چادر آپؐ کے اوپر سے گر پڑی تو حضرت ابوبکرؓ نے اٹھا کر پھر آپؐ کے اوپر رکھ دی اور بالکل قریب آکر عرض کیا: یارسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر نثار آپ نے دعا کا حق ادا کردیا، اب آپ زیادہ نہ کہیں، بہت جلد اللہ تعالیٰ اپنا وعدہ پورا کرے گا (طبری ج ۱ اردو ترجمہ ص ۱۸۹ عربی ص ۲۰-۳۱۹)

ان دعاؤں کی نوعیت بتارہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ محض مدافعانہ جنگ لڑنے کے لیے آمادہ ہوئے تھے یعنی اسلام کی طرف سے نہیں بلکہ اسلام کے خلاف تلوار اٹھی تھی، لڑائی میں اسلام کی فتح ہوئی، آپؐ نے اس کی بشارت دینے کے لیے عبداللہؓ بن رواحہ کو اہل العالیہ اور زید بن حارثہ کو اہل السافلہ کے پاس روانہ کیا، اسامہ بن زید کا بیان ہے کہ ہم کو اس فتح کی خبر اس وقت ملی جب ہم حضرت رقیہؓ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دفن کررہے تھے، جو حضرت عثمانؓ بن عفان کے نکاح میں تھیں (طبری ج ۱، اردو ترجمہ ص ۱۹۹، عربی ص ۱۳۳۴)

اس لڑائی میں جو لوگ قیدی ہوئے ان میں رسول اللہ کے داماد ابوالعاص بن الربیع بھی تھے، جن کے نکاح میں حضرت زینبؓ تھیں، یہ حضرت خدیجہؓ کی بہن کے بیٹے تھے، ان قیدیوں کے ساتھ رسول اللہ نے جو سلوک کیا وہ دنیا کے لیے ایک مثال ہے، جب اہل مکہ نے اپنے قیدیوں کی رہائی چاہی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت زینبؓ نے بھی اپنے شوہر کے فدیہ کے لیے کچھ مال بھیجا، اس میں وہ ہار بھی تھا جو حضرت خدیجہؓ نے ان کو جہیز میں دیا تھا، اس ہار کو دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بے چین ہو گئے، آپ نے صحابہؓ سے فرمایا: اگر مناسب سمجھو تو زینب کی خاطر اس کے اسیر شوہر کو رہا کردو اور اس کے ہار کو بھی اس کو واپس دے دو، صحابہؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ! ہم خوشی سے اس کے لیے تیار ہیں، ابوالعاص کو چھوڑ دیا گیا اور حضرت زینب کا ہار ان کو واپس دے دیا گیا۔

ابوالعاص نے مکہ پہونچ کر حضرت زینبؓ کو رسول اللہؐ کے پاس جانے کی اجازت دے دی، وہ ابوالعاص کو مکہ میں چھوڑ کر مدینہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چلی آئیں، اسلام نے دونوں کے درمیان تفریق کردی تھی، فتح مکہ سے کچھ عرصہ پہلے ابوالعاص تجارت کے لیے شام گئے، ان کی دیانت مشہور تھی اس لیے قریش کے اور لوگوں نے بھی تجارت کے لیے اپنا مال ان کے ساتھ کردیا تھا، جب وہ واپس آرہے تھے تو مدینہ کی ایک فوج نے ان کو دشمن سمجھ کر ان کے مال پر قبضہ کرلیا، وہ کسی طرح چھپ کر رات کو مدینہ پہونچ گئے اور حضرت زینبؓ سے پناہ مانگی، انھوں نے ان کو پناہ دے دی اور ان کا مال واپس کرانے کا وعدہ کیا، فجر کی نماز میں حضرت زینبؓ نے عورتوں کی صف سے چلا کر کہا: اے صاحبو! میں نے ابوالعاص کو پناہ دے دی ہے، نماز کا سلام پھیر کر رسول اللہؐ نے صحابہؓ کو مخاطب کر کے کہا: صاحبو! تم نے سنا جو میں نے سنا، انھوں نے کہا: جی ہاں! آپؐ نے فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے اس سے پہلے مجھے اس واقعہ کا علم نہ تھا، جب ایک ادنی فرد نے تمام مسلمانوں کی طرف سے پناہ دے دی ہے تو اس کو پناہ ملنی چاہیے، اس کے بعد آپ اپنی صاحبزادی کے پاس آئے اور فرمایا: اے میری بچی! تم ابوالعاص کی اچھی طرح مہمانداری کرو مگر اپنے پاس نہ آنے دینا کیونکہ اب تم اس کے لیے حلال نہیں ہو، اس کے بعد ابوالعاص

کا تمام مال ان کو واپس کر دیا گیا، جب وہ مکہ آئے تو ایک ایک چیز لوگوں کے حوالہ کر دی جس کو وہ لے کر تجارت کرنے گئے تھے، اس کے بعد انھوں نے پوچھا: اے جماعت قریش! تم میں سے اب کوئی ایسا شخص رہ گیا ہے جس کا مال میرے پاس ہو اور وہ اس کو اب تک وصول نہ ہوا ہو، انھوں نے کہا: نہیں! کوئی اب ایسا نہیں ہے، سب کو ان کا مال پہونچ گیا ہے، ہم نے تم کو نہایت معتبر اور شریف پایا، اس کے بعد ابوالعاص نے **اشہد ان لاالٰہ الا اللہ واشہد ان محمدا عبدہ و رسولہ** پڑھا، پھر اہل قریش کو مخاطب کر کے بولے: میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھا اسی وقت ایمان لے آتا مگر میں ڈرا کہ تم لوگ یہ بدگمانی کرو گے کہ اس طرح سے میں نے تمہارے مال کھانے کی ترکیب کی ہے، جب اللہ نے اسے تم کو پہونچا دیا اور بار امانت سے فارغ ہوا تو اسلام لے آیا، اس کے بعد وہ مکہ سے مدینہ آگئے، ان کے آنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زینبؓ کو ان کے نکاح میں دے دیا۔ (طبری، اردو ترجمہ ج ۱ ص ۲۱۲-۲۰۷، عربی ص ۱۳۵۱-۱۳۴۶)

جنگ بدر کے خاتمہ کے بعد دشمنانِ اسلام اسیرانِ جنگ بن کر آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؐ نے ان کے ساتھ جو سلوک کیا وہ نفس رواداری کی اعلیٰ مثال ہے، یہ قیدی دو دو چار چار کر کے صحابہ کو تقسیم کر دئے گئے، آپؐ نے تاکید فرمائی کہ وہ آرام کے ساتھ رکھے جائیں، صحابہ نے اس حکم کی تعمیل کی، وہ خود کھجور کھا کر رہ جاتے تھے مگر ان کو پورا کھانا کھلاتے، ان قیدیوں میں ابوعزیز کا بیان ہے کہ انصار جب صبح یا شام کو ان کا کھانا لاتے تو روٹی میرے سامنے رکھ دیتے اور خود کھجوریں اٹھا لیتے، مجھ کو شرم آتی اور میں روٹی ان کے ہاتھ میں دے دیتا لیکن وہ ہاتھ بھی نہ لگاتے اور مجھ کو واپس دے دیتے اور یہ اس بنا پر تھا کہ آنحضرت ﷺ نے تاکید کی تھی کہ قیدیوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے (طبری ص ۱۳۳۸ سیرۃ النبیؐ ج ۱ ص ۳۰۵) آخر میں آپؐ نے ان قیدیوں سے فدیہ لے کر ان کو رہا کر دیا اور مکہ واپس جانے کی اجازت دے دی، ان کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی جاسکتی تھی اور اگر وہ قبول نہ کرتے تو ان کو قتل کیا جاسکتا تھا مگر ایسا نہیں کیا گیا۔

بدر کی لڑائی میں شکست کھانے کے بعد غیر مسلموں میں انتقامی جذبات اور بھی

ابھر گئے، ان کے سردار ابوسفیان نے عہد کیا کہ جب تک وہ اس کا انتقام نہ لے گا سر میں تیل نہ ڈالے گا، اس نے اپنے ہم مذہبوں کو برانگیختہ کرنے کے لیے عربی میں کچھ اشعار کہے تھے جن کا مطلب یہ ہے کہ یثرب اور مسلمانوں کی جماعت پر پیش قدمی کرو کیونکہ میں جانتا ہوں کہ جو کچھ انھوں نے جمع کیا ہے وہ تم کو مل جائے گا، اگر بدر میں ان کو کامیابی ہوئی تو اب آئندہ تم کو کامیابی ہوگی، میں نے قسم کھائی ہے کہ نہ میں عورتوں کے پاس جاؤں گا اور نہ اب نہاؤں گا جب تک کہ تم قبائل اوس اور خزرج کو فنا نہ کردو گے، میرا دل آتشِ انتقام سے شعلہ زن ہے۔ (تاریخ طبری ج ا حصہ سوم اردو ترجمہ ص ۲۵-۲۲۴، عربی ۱۳۶۶) ابوسفیان دوسو ستر سواروں کو لے کر مدینہ پر حملہ آور ہوا، یہودی قبیلہ بنونضیر کے سردار سلام بن مشکم کو اپنا حلیف بنایا اور مدینہ سے تین میل کے فاصلہ پر عریض میں آکر محاذ آرائی کی، ایک انصاری سعد بن عمروؓ کو قتل کیا، چند مکانات اور گھاس کے انبار جلا دیے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو آپؐ اس کے تعاقب میں نکلے، ابوسفیان بھاگ نکلا اور گھبراہٹ میں ستو کے بورے پھینکتا گیا، عربی میں ستو کو سویق کہتے ہیں، اسی لیے یہ لڑائی غزوۂ سویق کہلائی (تاریخ طبری ج ا حصہ سوم، اردو ترجمہ ص ۲۲۵، عربی ۱۳۶۷) یہ غزوہ جارحانہ کے بجائے بالکل مدافعانہ تھا۔

غیر مسلموں کا انتقامی جذبہ اور بھی بڑھا، ۳ھ میں وہ مدینہ پر پھر حملہ آور ہوئے، ان کی فوج کی تعداد تین ہزار تھی جن میں دوسو سوار تھے، اس کے مقابلہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ صرف سات سو مسلمان تھے، یہ غیر مسلم اپنے ساتھ عورتیں بھی لائے تھے جو خود جوشِ انتقام سے لبریز تھیں، انھوں نے منتیں مانی تھیں کہ اولاد کے قاتلوں کا خون پی کر دم لیں گی، پہلے تو مہاجر صحابیوں کی یہ رائے ہوئی کہ عورتیں باہر قلعوں میں بھیج دی جائیں اور شہر میں پناہ گیر ہوکر مقابلہ کیا جائے لیکن نوخیز بہادر صحابیوں کو خیال ہوا کہ شہر سے نکل کر دشمنوں کا مقابلہ کیا جائے، احد میں طرفین کا اجتماع ہوا، غیر مسلموں کی فوجی کارروائی کا پلہ بھاری رہا، ان کی عورتیں دف پر گاکر ان کی ہمت بڑھاتی رہیں، وہ ان کو اشعار پڑھ کر للکارتیں کہ ہم خاندانی بیبیاں ہیں آگے بڑھو تو گلے ملیں گے اور فرش بچھائیں گے، اگر منھ موڑو گے تو کسی

خیال کے بغیر قطع تعلق کرلیں گے، اے بنی عبدالدار! اے پشت بچانے والو! شمشیر براں سے مارو، یہاں پر یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابودجانہؓ کو لڑنے کے لیے ایک تلوار دی تھی، وہ لڑائی میں ایک غیر مسلم عورت کے پاس پہونچے جو اسی قسم کے اشعار پڑھ کر غیر مسلموں کو غیرت دلا رہی تھی، ابودجانہؓ نے اس کو مارنے کے لیے تلوار اٹھائی مگر پھر رک گئے، جب ان سے پوچھا گیا کہ انھوں نے عورت پر تلوار اٹھا کر اپنی کارگذاری کیوں نہیں دکھائی تو بولے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار کو اس سے برتر سمجھا کہ اس سے عورت کو قتل کروں (تاریخ طبری ج ا حصہ سوم، اردو ترجمہ ص ۲۴۹، عربی ص ۱۳۹۰) مگر دوسری طرف سے یہ نمونہ پیش ہوا کہ لڑائی کے بعد غیر مسلم عورتوں نے مسلمان شہداء کے کان ناک کاٹ لیے، ابوسفیان کی بیوی ہندہ نے ان کا ہار بنا کر پہنا اور حضرت حمزہؓ کا کلیجہ نکال کر چبا گئی، آخر یہ غیر مسلم کس مذہب کے پابند تھے، یہ سفاکانہ سلوک ان کے مذہب کی کس تعلیم پر محمود کیا جائے۔

اس کے مقابلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو اسوہ اس جنگ میں رہا وہ انسانیت کو سنوارنے کے لیے ایک پیام ہے، قریش بہت ہی غضب ناک ہو کر لڑ رہے تھے، غیظ و غضب میں آپ پر بھی تیروں کی بوچھار کرنے لگے، اس وقت ان کو برا کہنے کے بجائے آپ کی زبان مبارک سے صرف یہ نکلا کہ اے اللہ میری قوم کو بخش دے، وہ جانتے نہیں اور جب دشمنوں کا حملہ اور بھی تیز تر ہو گیا تو غیرت کے لہجہ میں آپ کی زبان مبارک سے یہ حسرت ناک الفاظ نکلے کہ وہ قوم کیا فلاح پا سکتی ہے جو اپنے پیغمبرؐ کو زخمی کرتی ہے، یہ آہ بھی اللہ تعالیٰ کو پسند نہ آئی جس کے بعد یہ آیت اتری:

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ تم کو اس معاملہ میں کچھ اختیار نہیں۔

(آل عمران: ۱۲)

۲-۳ ہجری میں غزوۂ بنی قینقاع پیش آیا، یہ یہودیوں کا ایک بہادر قبیلہ تھا، بدر کی فتح کے بعد ان کو خیال ہوا کہ مسلمان طاقتور بنتے جا رہے ہیں، ان کو اپنے اقتدار کا خطرہ نظر آیا، مدینہ میں تشریف لانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں سے معاہدہ

کرکے باہمی صلح وآشتی کرلی تھی مگر جنگ بدر کے بعد انھوں نے اس معاہدہ کو توڑ ڈالا اور بدر اور احد کی لڑائیوں کے درمیانی زمانہ میں مسلمانوں سے لڑائی لڑے، وہ مکہ کے غیر مسلموں کو خفیہ امداد بھی پہونچا کر ان کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکانے لگے، مدینہ میں ایک اتفاقی سبب یہ بھی پیش آیا کہ مدینہ کے بازار میں ایک یہودی دکاندار نے ایک انصاری عورت کی بے حرمتی کی، ایک مسلمان نے اس یہودی کو مار ڈالا، یہودیوں نے اس پر اس مسلمان کو ہلاک کردیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس نقض امن کا حال معلوم ہوا تو آپؐ یہودیوں کے پاس تشریف لے گئے اور مدینہ کے بازار میں ان کو جمع کرکے کہا: اے یہودیو! اللہ عز وجل سے ڈرو کہ کہیں وہ تم کو ایسی سزا نہ دے جیسی کہ اس نے قریش کو دی ہے، تم اسلام لے آؤ، تم جانتے ہو کہ میں مرسل ہوں جس کا ذکر خود تمہاری کتابوں میں ہے اور اس میثاق میں ہے جو اللہ نے تم سے لیا تھا، یہ سن کر یہودیوں نے یہ جواب دیا، اے محمد! تم ہم کو بھی اپنی قوم ایسا سمجھتے ہو، تم ایسے لوگوں سے لڑے جو لڑائی سے بالکل واقف نہ تھے، تم نے ان کو زیر کرلیا تو اپنی کامیابی سے دھوکہ میں نہ پڑو، بخدا اگر تم ہم سے لڑے تو تم کو معلوم ہوجائے گا کہ ہم مرد اہل نبرد ہیں، اسی کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ آیت نازل ہوئی:

وَإِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ إِلَيْهِمْ عَلَىٰ سَوَاءٍ (انفال)	اگر تم کو کسی قوم کی خیانت کا اندیشہ ہو تو تم بھی ان کے ساتھ وہی کرو۔

یہودیوں کی طرف سے نقض امن اور جنگ کا اعلان ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تنبیہ کے لیے اقدام کیے، یہودی قلعہ بند ہوگئے، پندرہ دن تک محصور رہنے کے بعد سپر ڈال دی، یہ گویا یہودیوں کے خلاف محض تادیبی کارروائی تھی جب پورا قبیلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں پر گر پڑا تو اس زمانہ کا مشہور منافق عبداللہ بن ابی آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور بولا: اے محمد! آپ ان موالیوں پر احسان کریں یہ لوگ خزرج کے حلیف تھے، آپؐ نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا تو عبداللہ بن ابی پھر بولا: اے محمد! آپ میرے موالیوں پر احسان کریں یہ سن کر آپ نے منھ پھیر لیا تو عبداللہ بن ابی نے بڑھ کر آپؐ کا گریبان پکڑ لیا، اس حرکت پر آپ کا چہرہ متغیر ہوگیا مگر عبداللہ بن ابی پھر بولا: بہ خدا میں

ہرگز اس وقت تک آپ کو نہیں چھوڑوں گا جب تک کہ آپ میرے موالیوں پر احسان نہ کریں گے، ان میں چار سو غیر مسلح اور تین سو زرہ پوش ہیں، انھوں نے مجھے ہمیشہ حبشیوں اور ایرانیوں سے بچایا ہے، آپ ان کو ایک وقت میں ختم کردینا چاہتے ہیں، یہ سن کر آپ نے فرمایا: اچھا! میں نے ان کو تمہاری خاطر چھوڑا مگر آپؐ نے ان کو جلاوطن کردیا، جب وہ مدینہ سے باہر نکلے اور ذباب پہونچے تو کہتے جاتے کہ انسانی شرافت ابھی اور دور ہے اور دور ہے (تاریخ طبری ج ا حصہ سوم، اردو ترجمہ ص ۲۲۱-۲۲۰، عربی ص ۱۳۶۱-۱۳۶۰)

یہودیوں کے ایک دوسرے قبیلہ بنونضیر نے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کرنے کی سازش کی، ان کو مکہ کے غیر مسلموں کی طرف سے یہ پیام ملا تھا کہ وہ محمد ﷺ کو قتل کردیں ورنہ ان کا استیصال کردیا جائے گا، وہ اسلام کے دشمن پہلے ہی سے تھے، اس دھمکی نے ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کے لیے آمادہ کردیا، عبداللہ بن ابی نے بھی ان کی سازش میں ان کا ساتھ دیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی سازش کی خبر ہوئی تو ان کے خلاف بھی تادیبی کارروائی کی، وہ بھی قلعہ بند ہوگئے مگر انھوں نے سپر ڈال کر صلح کرلی اور شام کی طرف چلے جانے کی اجازت مانگی، ان کو اجازت دی گئی کہ اسلحہ کے علاوہ جتنا بار اونٹ پر لاد سکیں وہ لے جائیں (تاریخ طبری ج ا حصہ سوم اردو ترجمہ ص ۲۹۰-۲۸۹، عربی ص ۱۴-۱۴۴۸)

۵ھ میں غزوۂ بنی المصطلق پیش آیا، یہ قبیلہ مریسیع میں رہتا تھا، جو مدینہ منورہ سے نو منزل پر ہے، اس کے سردار حارث بن ضرار نے مکہ کے غیر مسلموں کے اشارہ پر مدینہ پر حملہ کرنے کی تیاری شروع کی، یہ خبر پاکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حفاظتی تدابیر کی خاطر ان کے خلاف صف آرائی کی جو معمولی لڑائی کے بعد پسپا ہوئے، اس لڑائی میں عبداللہ بن ابی نے جو منافقانہ رویہ اختیار کیا اور اس کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو رواداری دکھائی وہ بھی اپنی مثال آپ ہے، وہ بظاہر مسلمان ہوگیا تھا مگر اندرونی طور پر اسلام کے دشمنوں سے ملا رہا، اس غزوہ کی فتح کے بعد اس نے اپنی قوم کو مسلمانوں کے خلاف یہ کہہ کر ابھارا: بخدا ہمارے دشمنوں اور قریش کے غلاموں کی وہی مثل ہے کہ اگر درندے کی تم

پرورش کروگے تو وہ تم ہی کو کھا جائے گا، مدینہ جاتے ہی وہاں کا جو سب سے معزز شخص ہے، وہ اس کو جو سب سے ذلیل ہے نکال دے، تم نے ان کو اپنے وطن میں اتارا، اپنی املاک میں شریک کیا، اگر تم ایسا نہ کرتے تو وہ کسی اور جگہ جاتے، عبداللہ بن ابی کی اس منافقت کی خبر زید بن ارقمؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دی، اس وقت حضرت عمر فاروقؓ بھی وہاں موجود تھے وہ بول اٹھے کہ آپ عباد بن بشر بن رقش کو حکم دیں کہ وہ عبداللہ بن ابی کو جا کر ہلاک کر دیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عمر! یہ تو دیکھو کہ جب لوگوں میں اس بات کا چرچا ہوگا کہ محمد خود اپنے ساتھیوں کو قتل کرا دیتے ہیں تو اس کا کیا اثر پڑے گا، عبداللہ بن ابی کو جب یہ معلوم ہوا کہ اس کی بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہونچ گئی ہے تو وہ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا، اس نے حلف اٹھا کر ان باتوں سے انکار کیا، وہ اپنی قوم میں بہت ہی معزز سمجھا جاتا تھا، اس لیے صحابہؓ نے اس کو الزام سے بچانے کے لیے آپؐ سے عرض کیا: شاید زید بن ارقمؓ کے سننے میں غلطی ہوئی ہو، جب آپؐ مدینہ کی طرف تشریف لے جا رہے تھے تو راستہ میں اسید بن حضیرؓ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپؐ نے فرمایا کہ تم کو اپنے آدمی کی یہ بات نہیں معلوم ہوئی کہ وہ کہتا ہے، مدینہ جا کر جو سب سے معزز ہے وہ سب سے ذلیل کو نکال دے گا، اسیدؓ نے کہا: آپ جائیں تو اسے فوراً نکال دیں، بخدا آپ ذی عزت ہیں اور وہ نہایت ذلیل ہے مگر انھوں نے کہا: یا رسول اللہ مناسب ہے کہ اس وقت آپ اس سے درگذر کریں، اس کی قوم اس کے لیے گھونگھوں کا تاج بنا رہی ہے مگر وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا کہ اس کی حکومت کس طرح آپ کو حاصل ہوتی ہے، عبداللہ بن ابی کے لڑکے عبداللہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جاں نثاروں میں تھے، ان کو اپنے باپ کی ان باتوں کا علم ہوا تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ میں نے سنا ہے کہ اس شکایت کی بنیاد پر جو آپؐ کو میرے باپ سے پہونچی ہے آپؐ ان کو قتل کر دینا چاہتے ہیں، اگر ایسا ہے تو آپؐ خود مجھے اس کا حکم دیں، خزرج کا تمام قبیلہ یہ جانتا ہے کہ میں اپنے باپ کا بہت ہی مطیع ہوں، اگر میرے علاوہ کسی اور کو آپؐ میرے باپ کے قتل کرنے کا حکم دیں گے تو یہ مناسب نہ ہوگا کہ میں اپنے باپ کے قاتل کو چلتا پھرتا دیکھوں پھر اس طرح

ایک مسلمان کو کافر کے بدلے میں قتل کر کے ہمیشہ کے لیے دوزخ میں اپنا ٹھکانا بناؤں گا، یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہم قتل کرنا نہیں چاہتے جب تک کہ وہ ہمارے ساتھ ہیں، ہم ان کے ساتھ اچھے تعلقات رکھنا چاہتے ہیں، اس واقعہ کے بعد جب عبداللہ بن ابی اپنے قبیلہ والوں سے کوئی بات کہتا تو اس کی قوم اس کو برا کہتی اور سزا کی دھمکی دیتی، جب آپ کو یہ بات معلوم ہوئی تو آپ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا: اگر میں تمہارے مشہور کے مطابق اس کو قتل کر دیتا تو ضرور اس کی قوم کی رگ حمیت پھڑک اٹھتی اور حمایت جوش اور حرکت میں آتی اور اگر آج میں اس کے قتل کا حکم دوں تو خود اس کی قوم بھی اس کا کام تمام کر دے، حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ مجھے محسوس ہوا کہ بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کارروائی میرے مشورہ سے زیادہ موجب برکت تھی۔

بنی المصطلق کی لڑائی میں بہت سی عورتیں بھی گرفتار ہوئیں، جو مسلمانوں میں تقسیم کر دی گئیں، ان میں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جویریہؓ سے خود نکاح کر لیا، اس کے بعد صحابہ نے کہا کہ بنی المصطلق تو اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سسرالی رشتہ دار ہو گئے، اس لیے جو لونڈی اور غلام جس کے پاس ہو وہ اس کو آزاد کر دے، چنانچہ محض اس شادی کی وجہ سے سو سے زیادہ آدمی آزاد کر دیے گئے، یہ بھی رواداری کی ایک عمدہ مثال ہے، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے جویریہ سے بڑھ کر اپنی قوم کے لیے بابرکت بی بی کوئی اور نہیں دیکھی (تاریخ طبری ج ۱ حصہ سوم اردو ترجمہ ص ۴۸-۳۴۲، عربی ص ۱۵۱۴-۱۵۱۱)

اسی سال یہودیوں سے جنگ احزاب (خندق) ہوئی، یہ بھی دفاعی لڑائی تھی، بنی نضیر جلاوطن ہوئے تو انھوں نے مکہ کے قریش کو یہ لالچ دے کر ابھارا کہ خیبر کی نصف آمدنی ان کو ہمیشہ دے دی جائے گی، قریش کے قبیلوں میں بنی غطفان، بنو اسد اور بنو سلیم نے یہودیوں سے سازش کر کے چوبیس ہزار لشکریوں کے ساتھ مدینہ پر اس یقین کے ساتھ حملہ کیا کہ وہ اسلام کا خاتمہ ہمیشہ کے لیے کر دیں گے، مسلمانوں پر اس لشکر جرار کا ہراس طاری ہو گیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے باہر نکل آئے اور خندق کھود کر مدافعانہ جنگ کی تیاری کی، آپؐ کی معیت میں تین ہزار صحابی تھے، مہاجرین اور انصار کے ساتھ مل کر آپؐ

نے بھی خندق کھودی، جس کا عمق پانچ گز رکھا گیا غیر مسلموں نے مدینہ کا محاصرہ ہر طرف سے کرلیا تو آپ نے کوہ سلع کو اپنے عقب میں رکھ کر وہاں پڑاؤ کیا اور خندق کو اپنے اور دشمن کے مابین رکھا، بچوں اور عورتوں کو قلعوں میں بھیج دیا، یہودیوں کے قبیلہ بنی قریظہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امن کا معاہدہ کر رکھا تھا مگر وہ معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اسلام کے دشمنوں سے آملے اور عہد و پیمان کا خیال کیے بغیر آپ کی شان میں گستاخی کے الفاظ استعمال کرنے لگے۔

یہ محاصرہ ایک مہینہ تک جاری رہا، صحابہ کرامؓ فاقہ کرنے لگے، ایک دن انھوں نے بیتاب ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے شکم کھول کر دکھائے کہ پتھر بندھے ہیں لیکن آپؐ نے اپنا شکم مبارک کھولا تو ایک کے بجائے دو پتھر تھے، محاصرہ سے گھبرا کر صحابہؓ کے دلوں میں ہر قسم کے برے خیالات آنے لگے، بعض منافقین بھی ساتھ تھے، اس موقع پر ان کا نفاق ظاہر ہوگیا، وہ کہتے کہ محمدؐ ہم سے وعدہ کرتے تھے کہ ہم کسریٰ اور قیصر کے خزانوں کو اپنے تصرف میں لائیں گے، اس کے برخلاف اب یہ نوبت آگئی ہے کہ ہم اپنی ضروریات سے فارغ ہونے کو بھی باہر نہیں جاسکتے، محاصرین خندق کو تو عبور نہیں کرسکتے تھے، دور سے تیر اور پتھر برساتے تھے، محاصرہ کی سختی دیکھ کر آپؐ نے بنی غطفان سے مدینہ کی پیداوار کا ایک ثلث دے کر صلح کا معاہدہ کرنا چاہا مگر صحابۂ کرامؓ کی غیرت وحمیت کچھ ایسی ابھری کہ آپؐ کو ان کے استقلال پر اطمینان ہوا، اس موقع پر حضرت علیؓ اور حضرت عمرؓ نے دشمنوں کے سرداروں سے لڑنے میں جو پامردی اور بہادری دکھائی اس سے صحابۂ کرامؓ کے حوصلے بڑھے، یہودیوں نے اس قلعہ پر بھی حملہ کرنے کی کوشش کی جہاں مستورات تھیں مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی حضرت صفیہؓ کی بہادری سے ان کو کامیابی نہیں ہوئی، محاصرہ طویل ہوا تو محاصرین ہمت ہارنے لگی، چوبیس ہزار آدمیوں کے لیے رسد پہونچانا بھی ان کے لیے مشکل ہوگیا، پھر ایک روز ایسی آندھی آئی کہ ان کے لشکرگاہ میں بڑی تباہی آگئی، یہودیوں اور قریش میں پھوٹ بھی پڑ گئی اور وہ مکہ کی طرف بے نیل مرام پلٹ گئے، اس غزوہ میں رسول اللہ ﷺ کی چار نمازیں قضا ہوئیں، تیر اندازی اور سنگ باری کی وجہ سے آپ اپنی جگہ سے ہٹ نہیں سکتے

تھے (تاریخ طبری ج ۱ حصہ سوم، اردو ترجمہ ص ۳۱۹ - ۳۰۰، عربی ۱۴۸۵-۱۴۶۳) یہ جنگ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف مسلمانوں کی مدافعت میں لڑی جیسا کہ آپؐ کی اس دعا سے بھی ظاہر ہے جو آپؐ نے اس محاصرہ کے موقع پر اللہ تعالیٰ سے کی تھی، آپؐ مٹی اٹھاتے جاتے تھے جس سے شکم مبارک غبار آلود ہو جاتا اور فرماتے جاتے:

''اے خدا! تیری مدد نہ ہوتی تو ہم ہدایت نہ پاتے اور نہ صدقہ دیتے اور نہ نماز پڑھتے، ہم پر سکون اور امن نازل فرما اور دشمن کے مقابلہ کے وقت ہم کو ثابت قدم رکھ، یقیناً ان کافروں نے ہم پر ظلم کیا ہے، جب یہ کسی برائی کا ارادہ کرتے ہیں تو ہم اس کو دفع کرتے ہیں'' (بخاری شریف باب الجہاد)

۶ھ میں صلح حدیبیہ ہوئی، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رواداری، بردباری اور فراخ دلی کی اعلیٰ مثال ہے، مسلمانوں کی قوت اور تعداد بڑھی تو آپؐ نے خانۂ کعبہ میں جا کر عمرہ ادا کرنے کا ارادہ کیا، آپؐ کے ہمرکاب چودہ سو صحابہ تھے، آپؐ نے صحابہؓ کے ساتھ احرام باندھا تاکہ مکہ کے غیر مسلموں کو حملہ کا شبہ نہ ہو مگر ان غیر مسلموں نے اپنے تمام قبیلوں کو جمع کر کے ایک جمعیت عظیم سے آپؐ کو مکہ میں داخل ہونے سے روکا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے نکل کر راستہ طے کرتے ہوئے مکہ معظمہ سے ایک منزل کے فاصلہ پر ایک کنویں کے پاس قیام پذیر ہوئے جس کا نام حدیبیہ ہے، یہاں پہونچ کر مکہ کے غیر مسلموں کو پیام دیا کہ ہم کسی سے لڑنے نہیں آئے ہیں بلکہ عمرہ کرنے آئے ہیں، لڑائی سے پہلے ہی قریش کا کس بل نکل گیا ہے اگر وہ پسند کریں تو ہم ایک مدت کے لیے آپس میں سمجھوتہ کرلیں اور باہمی مزاحمت سے باز آجائیں تاکہ ہم اوروں سے نپٹ لیں، اگر ہم کو کامیابی ہو تو پھر ان کا جی چاہے تو اوروں کی طرح وہ بھی ہمارے ساتھ ہو جائیں اور اگر ہو جائیں تو اس اثنا میں ان کو پنپنے کا موقع مل جائے گا، ان کی تعداد میں اضافہ ہو جائے گا اور اگر وہ ان باتوں کو نہ مانیں تو قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، میں جس مقصد کے لیے آیا ہوں اس کے لیے آخر دم تک لڑوں گا، یہ پیام مکہ کے غیر مسلموں کے پاس پہونچا تو پہلے انھوں

نے اس کو سننا بھی گوارا نہیں کیا لیکن ان ہی میں سے ایک معمر اور تجربہ کار شخص عروہ بن مسعود ثقفی کو یہ باتیں قابلِ قبول معلوم ہوئیں، اس لیے وہ ان پر گفتگو کرنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہونچا، اس نے آپؐ کی ذات مبارک سے صحابہؓ کی جو عقیدت اور محبت دیکھی اس سے متاثر ہوا مگر مکہ کے لوگوں کی رعونت اور غرور کو پیش نظر رکھتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح گفتگو کی کہ تم پہلے اپنی ہی قوم کا استیصال کرنا چاہتے ہو؟ کیا تم سے پہلے کسی عرب نے ایسا کیا ہے کہ اپنی جڑ کاٹی ہو اور دوسری شکل جو تم نے پیش کی ہے کہ ہم ایک دوسرے کے درمیان مزاحم نہ ہوں تو مجھے جو مختلف صورتیں تمہارے ساتھ نظر آ رہی ہیں ان میں ایسے ہی لوگ ہیں جن کی فطرت یہ ہے کہ وہ بھاگ جائیں گے اور تم کو دشمن کے نرغے میں چھوڑ دیں گے، اس گفتگو کے موقع پر حضرت ابوبکرؓ بھی تھے، ان کو یہ گفتگو بہت ہی ناگوار ہوئی مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بڑی رواداری سے عروہ کی باتیں سنتے رہے، وہ عرب کے قاعدہ کے مطابق بے تکلفانہ طریقہ سے باتیں کرتے ہوئے بار بار آپؐ کی ریش مبارک پکڑ لیتا، آپ کی حفاظت کے لیے مغیرہؓ بن شعبہ کھڑے تھے ان کو یہ ناگوار ہوتا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاموشی سے سب کچھ سنتے رہے، عروہ نے اس ملاقات کے دوران دیکھا کہ آپ اپنے صحابیوں کو جب کوئی حکم دیتے ہیں تو وہ فوراً اس کی تعمیل کرتے ہیں، جب وضو کرتے ہیں تو وہ اس کے پانی کو لینے کے لیے آپس میں لڑنے لگتے ہیں، جب وہ آپؐ کے پاس آکر باتیں کرتے ہیں تو نہایت آہستہ آہستہ بولتے ہیں اور تعظیماً آپؐ کو گھور کر نہیں دیکھتے ہیں، عروہ جب مکہ واپس گیا تو اس نے اپنے دوستوں سے کہا کہ میں بادشاہوں کے دربار میں سفارت کے لیے گیا ہوں، میں قیصر و کسریٰ اور نجاشی کے یہاں بھی گیا ہوں، بخدا میں نے اپنوں میں سے کسی بادشاہ کی وہ عزت نہیں دیکھی جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی محمدؐ کی کرتے ہیں، پھر اس نے کہا کہ انھوں نے بہت معقول شرطیں پیش کی ہیں وہ مان لی جائیں، اس کے بعد ہی کنانہ کا ایک اور معزز شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا گیا، اس کے استقبال کے لیے آپؐ نے قربانی کے جانور بھی بھیجے، جس سے متاثر ہو کر اس نے کہا کہ یہ لوگ ہرگز ایسے نہیں ہیں کہ ان کو بیت اللہ کی زیارت سے روکا جائے،

اس کے بعد مکہ کے لوگوں نے جلیس بن علقمہ کو آپؐ کے پاس بھیجا جو اس وقت حبوش کا سردار تھا، آپؐ نے اس کو آتا ہوا دیکھ کر فرمایا: یہ دینداروں کے خاندان کا آدمی ہے، اس کے سامنے نذر کے اونٹ پیش کیے جائیں، جب اس نے ان جانوروں کو دیکھا تو اس قدر متاثر ہوا کہ وہ آپؐ کی خدمت حاضر ہونے کے بجائے مکہ پلٹ گیا، جہاں پہونچ کر اس نے کہا: اے قریش! میں نے خود نذر کے وہ جانور دیکھے ہیں جن کے گلے میں قلادے پڑے تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ بہت دنوں سے پڑے ہوئے تھے کیوں کہ قلادے کی جگہ کے بال جھڑ گئے تھے، ان کو ان کے مقام تک پہونچنے سے روک دینا مناسب نہیں ہے، اس کے بعد اس نے یہ دھمکی بھی دی کہ ہم نے تم سے دوستی اور مدد کا معاہدہ اس لیے نہیں کیا ہے کہ ان لوگوں کو جو بیت اللہ کی عظمت کا اظہار کرنے آئیں ان کو یہاں نہ آنے دیا جائے، قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے یا تو تم محمدؐ کو کعبہ آکر عمرہ ادا کرنے دو، ورنہ میں اپنے تمام ساتھیوں کو لے کر حبوش چلا جاؤں گا اور تمہارا ساتھ چھوڑ دوں گا، اس کے بعد مکہ کے لوگوں کی طرف سے محرز بن حفص آپؐ کی خدمت میں پہونچا، آپؐ نے اس کو دیکھ کر کہا کہ یہ بدکردار اور بدکار آدمی ہے پھر بھی آپؐ نے اس سے باتیں شروع کیں، اسی اثنا میں سہیل بن عمرو آپؐ کے پاس پہونچ گئے، اس کو آتے دیکھ کر آپؐ نے صحابہؓ سے فرمایا: اب تمہارا کام آسان ہوگیا ہے، اب یہ اپنے خاندانی تعلقات کی وجہ سے تم سے صلح کی درخواست کریں گے، تم قربانی کے جانوران کو دکھاؤ اور لبیک لبیک کے نعرے بلند کرو، شاید اس سے ان کے دل نرم پڑ جائیں اور ابھی صلح کی بات شروع بھی نہیں ہوئی تھی کہ ابوسفیان نے اچانک ایک حملہ کردیا پوری وادی آدمیوں اور اسلحہ سے پر ہوگئی، چھ مسلح حملہ آور گرفتار ہوئے تو آپ کی خدمت میں پیش کیے گئے، آپؐ نے نہ ان کے لباس اتروائے اور نہ ان کے اسلحے ضبط کیے اور نہ ان کو قتل کرنے کا حکم دیا بلکہ عفو ودرگذر سے کام لے کر ان کو چھوڑ دیا، طبری کی یہ بھی روایت ہے کہ ایک صحابی زنیمؓ وادی حدیبیہ کے ایک بلند ٹیلے پر کھڑے تھے کہ مکہ کے غیر مسلموں نے تیر کا نشانہ بنا کر ان کو ہلاک کر ڈالا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے خلاف ایک رسالہ بھیجا جو دشمن کے بارہ سواروں کو گرفتار کر کے آپؐ کے پاس لایا، آپ ﷺ نے ان سے

فرمایا: کیا میں نے تم سے کوئی عہد کیا ہے جس کا ایفالازم ہوا نھوں نے کہا نہیں، آپ ﷺ نے پھر اپنی شانِ رحمت دکھائی اور ان کو چھوڑ دیا، اسی موقع پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

هُوَ الَّذِي كَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ عَنْهُم بِبَطْنِ مَكَّةَ مِن بَعْدِ أَنْ أَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ (فتح:۲۴)

اللہ وہ ہے جس نے مکہ میں ان کے ہاتھ تم سے اور تمہارے ہاتھ ان سے روکے، اس کے بعد تم کو ان پر قابو دے دیا تھا۔

صلح کی گفتگو نا تمام رہی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خراش بن امیہؓ کو اپنے اونٹ پر مکہ بھیجا کہ وہاں اشراف کو آپؐ کے آنے کی غرض بتائیں، حضرت خراش بن امیہؓ مکہ پہونچے تو وہاں کے لوگوں نے ان کے اونٹ کو مار ڈالا اور ان کو بھی قتل کر دینے کا ارادہ کیا، مگر حبشیوں کی حمایت سے بچ کر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چلے آئے، اس کے بعد مکہ کے لوگوں نے چالیس پچاس آدمیوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فرودگاہ تک بھیجا کہ آپؐ کے ساتھیوں کو قتل کریں، یہ سب گرفتار ہو کر آپؐ کے سامنے پیش کیے گئے، آپ کا دامن عفو پھر وسیع ہوا اور ان کو بھی معاف کر کے رہا کر دیا، اس کے بعد آپؐ نے صلح کا پیام دے کر حضرت عمرؓ فاروق کو بھیجنا چاہا لیکن انھوں نے یہ کہہ کر معذرت کی کہ میرے قبیلہ میں عدی والوں میں سے کوئی وہاں نہیں جو میری حمایت کر سکے، قریش کا میں سخت دشمن ہوں، اس لیے وہ میری بات ماننے کے بجائے میری جان کے درپے ہوں گے، میرے بجائے عثمان بن عفانؓ زیادہ بہتر ہوں گے، وہاں ان کی عزت اور اثر ہے، چنانچہ آپؐ نے حضرت عثمانؓ بن عفان کو یہ پیام دے کر بھیجا کہ لڑائی کرنا مقصد نہیں بلکہ کعبہ کی زیارت مقصود ہے، حضرت عثمانؓ یہ پیام لے کر پہونچے تو مکہ کے غیر مسلموں نے ان سے کہا کہ ان کا جی چاہے تو کعبہ کا طواف کر سکتے ہیں، انھوں نے طواف کرنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بغیر طواف نہیں کر سکتے، اس پر ان کو مکہ کے لوگوں نے اپنے یہاں روک لیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس خبر پہونچی کہ وہ شہید کر دیے گئے، یہ سن کر فرمایا کہ اب جب تک دشمنوں سے فیصلہ کن لڑائی نہ لڑوں گا یہاں سے واپس نہ جاؤں گا، یہ کہہ کر

آپؐ نے ایک ببول کے درخت کے نیچے بیٹھ کر صحابہؓ سے جاں نثاری کی بیعت لی، اس کا نام بیعتِ رضوان ہے۔

جب غلط فہمی دور ہوئی تو مکہ والوں نے سہیل بن عمرو کو یہ پیام دے کر بھیجا کہ صلح صرف اس شرط پر ہوسکتی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس سال واپس چلے جائیں، آپؐ نے حضرت علیؓ کو بلا کر حکم دیا کہ معاہدہ کے الفاظ قلمبند کریں، سہیل بات بات پر اڑتا مگر آپؐ اپنی رواداری میں اس کی ساری باتیں تسلیم کرتے گئے، حضرت علیؓ نے عنوان پر بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھا، سہیل نے کہا: میں اس جملہ کو نہیں جانتا، اس کے بجائے باسمک اللھم لکھو، رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؓ سے کہا یہی لکھ دو، اس کے بعد آپؐ نے فرمایا کہ آگے لکھو، یہ وہ معاہدہ ہے جس پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سہیل بن عمرو سے مصالحت کی ہے، اس پر سہیل نے کہا: اگر ہم اس بات کو مانتے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں تو پھر کیوں لڑتے، اس کے بجائے آپ اپنا محض نام اور اپنے باپ کا نام لکھوائیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے لیے راضی ہوگئے اور حضرت علیؓ سے کہا کہ لکھو یہ وہ شرائط ہیں جن پر محمد بن عبد اللہ نے سہیل بن عمرو سے مصالحت کی ہے، اس کے بعد یہ شرائط قلمبند کی گئیں کہ دس سال تک ایک دوسرے سے لڑائی نہ ہوگی، اس مدت میں ہر شخص محفوظ رہے گا کوئی کسی پر دست درازی نہیں کرے گا، قریش کا جو شخص اپنے ولی کی اجازت کے بغیر مدینہ پہونچ جائے گا تو وہ اس کے ولی کے پاس بھیج دیا جائے گا اور اگر مدینہ سے کوئی قریش کے پاس چلا جائے گا تو وہ واپس نہیں کیا جائے گا، اب نہ تلوار نکلے گی نہ تیراندازی اور نہ سنگ اندازی ہوگی، جس کا جی چاہے فریقین میں سے جس کے ساتھ چاہے معاہدہ میں شریک ہوجائے، ان شرائط کے ساتھ یہ شرطیں بھی رکھی گئیں کہ مسلمان اس سال مدینہ واپس چلے جائیں مکہ کے اندر نہ آئیں آیندہ سال وہ آئیں، تین دن قیام کریں مگر ان کی تلواریں نیام میں رہیں۔

یہ شرطیں مسلمانوں کے سخت خلاف تھیں صحابہ کو بڑا دکھ ہوا، حضرت عمرؓ فاروق تو اسی دکھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہونچے اور عرض کیا: کیا آپ اللہ کے رسول نہیں

ہیں؟ آپ ؐ نے فرمایا: ہوں، حضرت عمرؓ نے کہا: کیا ہم مسلمان نہیں ہیں؟ آپ ؐ نے فرمایا: ہو، حضرت عمرؓ نے کہا: کیا اہل مکہ مشرک نہیں ہیں؟ آپ ؐ نے فرمایا: ''ہیں'' حضرت عمرؓ نے کہا: تو پھر کیوں ہم دین کے معاملہ میں اپنی کمزوری تسلیم کرلیں، آپ ؐ نے فرمایا: میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں، ہرگز اس کے حکم کی مخالفت نہیں کروں گا، وہ کبھی میری بات نہیں بگاڑے گا، حضرت عمرؓ کہا کرتے تھے کہ اس خوف سے کہ مجھے اپنی اس بات کا کوئی خمیازہ اٹھانا پڑے میں اس روز سے برابر روزے رکھتا، صدقہ دیتا، نمازیں پڑھتا اور غلام آزاد کرتا رہا یہاں تک کہ میرے قلب کو اطمینان ہوگیا، صلح کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قربانی کے اونٹ ذبح کیے، بال ترشوائے اور احرام کھولا، اسی کے بعد سورہ اِنَّا فَتَحْنَالَکَ فَتْحاًمُّبِیْناً نازل ہوئی اور یہ فتح اس لحاظ سے ضرور تھی کہ صلح حدیبیہ سے فتح مکہ تک جتنی تعداد میں غیر مسلم مسلمان ہوئے پہلے کبھی نہیں ہوئے، غیر مسلم مسلمانوں سے ملنے لگے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیمات سے ان کے اخلاق کو جتنا پاکیزہ بنادیا تھا، اسے دیکھ کر متاثر ہوتے اور اسلام قبول کرتے، صلح نامۂ حدیبیہ کا اس لحاظ سے بھی مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس کس طرح ہر موقع پر اپنی رواداری، فراخدلی اور انسان دوستی کی مثال پیش کی جس کا نمونہ مشکل سے کسی اور تاریخ میں مل سکتا ہے، بعض صحابۂ کرام کی بیویاں مکہ میں رہ گئی تھیں انھوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا ان پر زور اور جبر ڈال کر ان کو مسلمان کیا جاسکتا تھا مگر صحابہؓ نے زبردستی کرنے کے بجائے ان کو طلاق دے کر علاحدگی اختیار کرنے کو زیادہ پسند کیا (صلح حدیبیہ کی تفصیل کے لیے دیکھو بخاری شریف کتاب الشروط، تاریخ طبری ج ۱ حصہ سوم ص ۳۷۶-۳۵۶، عربی ص ۱۵۵-۱۵۲۸، نیز سیرۃ النبیؐ ج ۱ ص ۴۴۷-۴۱۰، الفاروق ص ۴۸-۴۵، تاریخ اسلام از شاہ معین الدین احمد ندوی ج ۱ ص ۵۰-۴۹)

فتح مکہ: جب ۸ھ میں غزوۂ موتہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاتحانہ طور پر مکہ میں داخل ہوئے تو آپ ؐ کے سامنے قریش کے وہ تمام سرکش سردار تھے، جنھوں نے آپ ؐ کی ایذارسانی، قتل اور مسلمانوں کی خوں ریزی، غارتگری اور آبروشکنی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی، مکہ میں فاتحانہ داخل ہوتے ہی آپ ؐ نے اپنے لشکریوں کو حکم دیا کہ جب تک کوئی شخص

خود ان پر حملہ آور نہ ہو، وہ کسی پر تلوار نہ اٹھائیں اور جو شخص حرم میں چلا جائے گا یا ابوسفیان کے گھر میں پناہ لے لے گا اس کی جان اور آبرو محفوظ رہے گی، اس رواداری پر عمل بھی ہوا، اس موقع پر تمام مفاخر، سارے انتقامات اور خوں بہائے قدیم آپؐ کے قدموں کے نیچے تھے مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کو نظر انداز کر کے قریش کو اس طرح مخاطب فرمایا کہ جاہلیت کا غرور، نسب کا افتخار خدا نے مٹا دیا، تمام انسان آدم کی نسل سے ہیں اور آدم مٹی سے بنے ہوئے تھے، اللہ کے نزدیک شریف وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔

اس موقع کی جو مرقع آرائی علامہ شبلیؒ نے کی ہے وہ ان کی نثر نگاری کے محاکات کی ایک اعلیٰ مثال ہے، ناظرین کو اس کے پڑھنے میں لطف بھی آئے گا اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی رواداری کی ایک اعلیٰ مثال بھی ان کے ذہن میں نقش ہو جائے گی:

> ''آپؐ نے مجمع کی طرف دیکھا تو جبارانِ قریش سامنے تھے، ان میں وہ حوصلہ مند بھی تھے جو اسلام کو مٹانے میں سب کے پیش رو تھے، وہ بھی تھے جن کی زبانیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر گالیوں کے بادل برسایا کرتی تھیں، وہ بھی تھے جن کی تیغ وسنان نے پیکر قدسیؐ کے ساتھ گستاخیاں کی تھیں، وہ بھی تھے جنھوں نے آنحضرتؐ کے راستے میں کانٹے بچھائے تھے، وہ بھی تھے جو وعظ کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایڑیوں کو لہولہان کر دیا کرتے تھے، وہ بھی تھے جن کی تشنہ لبی خون نبوت کے سوا کسی چیز سے بجھ نہیں سکتی تھی، وہ بھی تھے جن کے حملوں کا سیلاب مدینہ کی دیواروں سے آ آ کر ٹکراتا تھا، وہ بھی تھے جو مسلمانوں کو جلتی ہوئی آگ پر لٹا کر ان کے سینوں پر آتشیں مہریں لگایا کرتے تھے، رحمت عالمؐ نے ان کی طرف دیکھا اور خوف انگیز لہجہ میں پوچھا تم کو کچھ معلوم ہے میں تم سے کیا معاملہ کرنے والا ہوں؟ وہ لوگ اگرچہ ظالم تھے، شقی تھے، بے رحم تھے لیکن مزاج شناس تھے، پکار اٹھے کہ تو شریف بھائی ہے اور شریف برادر زادہ ہے، ارشاد ہوا تم پر کچھ الزام نہیں جاؤ تم سب آزاد ہو، کفار نے تمام مہاجرین کے مکانات پر

قبضہ کرلیا تھا اور وہ ایسا وقت تھا کہ ان کو ان کے حقوق دلائے جاتے، لیکن آپؐ نے مہاجرین کو حکم دیا کہ وہ اپنی مملوکات سے دست بردار ہو جائیں"

(سیرۃ النبی ج ا ص ۴۷۵)

کیا مذہبی رواداری کی اس سے بہتر مثال کسی اور مذہب کی تاریخ میں مل سکتی ہے؟

وحشی حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عزیز ترین چچا حضرت حمزہؓ کے قاتل تھے، وہ فتح مکہ کے بعد بھاگ کر طائف چلے گئے پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر اسلام قبول کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مسلمان تو کرلیا لیکن یہ بھی فرمایا کہ میرے سامنے نہ آیا کرنا کہ تم کو دیکھ کر مجھے چچا کی یاد آتی ہے۔ (صحیح بخاری قتل حمزہ، سیرۃ النبی ج ۲ ص ۳۶۲)

ابوسفیان کی بیوہ ہندہ تھی، اس نے حضرت حمزہؓ کا سینہ چاک کر کے ان کے دل وجگر کے ٹکڑے کیے تھے، فتح مکہ کے روز نقاب پوش ہوکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور مسلمان بن کر امان کی سند حاصل کر لی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ہندہ کو پہچانا تو اس سے کوئی تعرض نہیں کیا، ہندہ متاثر ہوکر بول اٹھی: یارسول اللہ! آپؐ کے خیمہ سے مبغوض تر کوئی خیمہ میری نگاہ میں نہ تھا لیکن اب آپؐ کے خیمہ سے زیادہ محبوب خیمہ میری نگاہ میں دوسرا نہیں" (صحیح بخاری، ذکر ہندہ، سیرۃ النبیؐ ج ۲ ص ۳۶۲)

ابوجہل کے فرزند عکرمہ اسلام لانے سے پہلے آپؐ کے سخت دشمن تھے، فتح مکہ کے بعد وہ بھاگ کر یمن چلے گئے، ان کی بیوی مسلمان ہوچکی تھیں وہ یمن گئیں ان کو مسلمان بنا کر آپؐ کی خدمت میں لے کر حاضر ہوئیں، ان کو دیکھ کر آپؐ فرط مسرت میں ان کی طرف بڑھے اور فرمایا: اے ہجرت کرنے والے سوار! تمہارا آنا مبارک ہو۔ (موطا امام مالک کتاب النکاح، سیرۃ النبیؐ ج ۲ ص ۳۶۳)

ابوسفیان آپ کے شدید دشمن تھے، آپؐ کے خلاف جتنی لڑائیاں لڑی گئیں ان میں سب سے نمایاں حصہ ان ہی کا تھا فتح مکہ کے بعد حضرت عباسؓ ان کو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لائے تو حضرت عمرؓ نے ان کو قتل کردینا چاہا لیکن آپؐ نے منع فرمایا، رواداری اور

فراخدلی کی یہ مثال پیش کی کہ ان کے گھر کو امن و امان کا حرم بنا دیا اور فرمایا: جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے گا اس کا قصور معاف ہوگا۔ (صحیح بخاری فتح مکہ، سیرۃ النبیؐ ج ۲ ص ۳۶۴)

اشاعت اسلام: اس فتح و کامرانی کے بعد بھی آپؐ کے سامنے کلام اللہ کی یہ ہدایت برابر سامنے رہی کہ غافل ہشیار کیے جائیں تمام انسانوں کو رب العالمین کی خوشخبری سنائی جائے اور لوگوں کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کی جائے مگر اس کے لیے دانشمندانہ اور پسندیدہ طریقے اختیار کیے جائیں، اسی لیے فتح مکہ کے بعد آپؐ نے ربانی پیغامات کی خوشخبری سنانے کے لیے مختلف جگہوں پر تبلیغی مشن بھیجے، آپؐ نے مکہ کے اطراف میں کچھ ٹکڑیاں بھیجیں کہ لوگوں کو اللہ کی طرف بلائیں لیکن ان کو کسی حال میں لڑنے کا حکم نہیں دیا تھا، حضرت خالدؓ کو قبیلہ بنی خذیمہ کے پاس بھیجا، وہ سپہ سالار اور فاتح کی حیثیت سے تو ضرور کامیاب تھے مگر واعظ اور صاحب ارشاد نہ تھے، اپنی دعوت دینے میں کشت وخون پر آمادہ ہوگئے، آپؐ کو خبر ہوئی تو آپ کھڑے ہوگئے اور قبلہ رخ دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا: خدایا! میں خالد کے قتل سے بری ہوں، پھر حضرت علیؓ کو بھیجا انھوں نے ایک ایک مقتول کا خون بہا ادا کیا، یہاں تک کہ کتوں کا بھی یمن میں بھی حضرت خالدؓ بھیجے گئے تھے مگر وہ وہاں کامیاب نہ ہوسکے جس کے بعد حضرت علیؓ گئے تو ملک کا ملک مسلمان ہوگیا، یمن ہمدان کا خاندان سب سے زیادہ بااثر تھا اس کے اسلام لانے کی خبر ملی تو آپؐ نے سجدہ کیا اور سر اٹھا کر دو دفعہ فرمایا: السلام علی ھمدان

یمن کے قبیلہ مدحج میں حضرت علیؓ ہی کو تبلیغ کے لیے بھیجا جب وہ روانہ ہو رہے تھے تو آپؐ نے تاکید فرمائی کہ جب تک دوسرے حملہ آور نہ ہوں پیش دستی نہ کرنا مگر جب حضرت علیؓ مدحج پہونچے اور اسلام کی دعوت پیش کی تو ان پر تیر اور پتھروں کی بارش ہونے لگی، حضرت علیؓ صف آراء ہوگئے جس سے کچھ دشمن ہلاک ہوئے اور بقیہ بھاگے، ان کا تعاقب نہیں کیا گیا، اس کے بعد قبیلہ کے رؤسا، خود حاضر ہوئے اور اسلام قبول کیا۔

یمن کے ابنائے رؤسا کے پاس دبر بن یحنس کو دعوت اسلام کے لیے بھیجا، انھوں

نے بطیبِ خاطر اسلام قبول کیا، ان ہی میں ایک رئیس مرکبود کے صاحبزادوں میں عطار نے سب سے پہلے صنعاء میں قرآن مجید حفظ کیا۔

عام یمن میں آپؐ نے معاذ بن جبلؓ اور ابوموسی اشعریؓ کو تبلیغ کے لیے بھیجا، چلتے وقت آپؐ نے ان لوگوں کو یہ ہدایتیں دیں کہ سہولت سے کام کرنا، سخت گیری نہ کرنا، لوگوں کو خوشخبری سنانا، نفرت نہ دلانا، دونوں مل کر کام کرنا، تم کو ایسے لوگ ملیں گے جو پہلے سے کوئی مذہب رکھتے ہیں جب ان کے پاس پہونچنا تو پہلے ان کو توحید اور رسالت کی دعوت دینا، جب وہ اس کو تسلیم کرلیں تو کہنا اللہ نے تم پر روز پانچ وقت کی نماز بھی فرض کی ہے، جب یہ بھی مان لیں تو ان کو سمجھانا کہ تم پر زکوٰۃ بھی واجب ہے، تم میں سے جو امیر ہوں ان سے زکوٰۃ لے کر جو غریب ہیں ان کو دے دی جائے گی، دیکھو جب وہ زکوٰۃ دینا منظور کرلیں تو چن کر ان سے اچھی چیزیں نہ لے لینا، مظلوموں کی بددعا سے ڈرتے رہنا، اس لیے کہ اس کے اور اللہ کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں ہے۔

یہی درحقیقت اسلامی تبلیغ کے اصول ہیں، کسی نے اس کی خلاف ورزی کی تو اس نے تعلیماتِ اسلام اور سنت نبویؐ سے روگردانی کی اور جب اہل یمن نے اسلام قبول کیا تو آپؐ نے خوشی میں فرمایا: ایمان یمن کا ایمان ہے اور دانائی یمن کی دانائی ہے۔

نجران کا قبیلہ حضرت خالد بن ولیدؓ کی کوششوں سے مشرف بہ اسلام ہوا، وہاں کے عبدالقیس کے قبیلہ کا رئیس منقذ بن حیان تھا، وہ مدینہ اپنی تجارت کے سلسلہ میں آیا تو آپؐ سے متاثر ہوکر اسلام لے آیا، اس کے بعد اس کے گھر کے لوگ مسلمان ہوئے، پھر بحرین میں ایک مسجد بنی جس میں مسجد نبویؐ کے بعد سب سے پہلے جمعہ کی نماز ادا ہوئی، وہاں سے چودہ آدمیوں کا ایک وفد مدینہ اس لیے پہونچا کہ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوکر دست بوسی کرے، بحرین میں علاء حضرمیؓ کی مساعی سے بھی اسلام پھیلا، عمان کے رئیسوں نے حضرت ابوزید انصاریؓ اور حضرت عمروؓ ابن العاص کی دعوت پر اسلام قبول کیا، شام کی ایک ریاست میں فردہ بن عمرو رومی سلطنت کی طرف سے گورنر تھے انھوں نے اسلام قبول کرکے آپؐ کی خدمت میں ایک خچر ہدیہ کے طور پر بھیجا، رومیوں کو معلوم ہوا تو ان کو گرفتار کرکے سولی دے دی

مگر دار پر ان کی زبان پر عربی کا ایک شعر تھا، جس کے یہ معنی ہیں کہ مسلمان سرداروں کو میرا یہ پیغام پہونچادو کہ میرا جسم اور میری عزت سب اپنے پروردگار کے ہاتھ میں ہے۔

فتح مکہ کے بعد عرب کے وفود بھی آپؐ کی خدمت میں بہ کثرت آئے، کچھ تو اس حیثیت سے آئے کہ آپ حکمراں تھے اس لیے آپؐ سے معاہدہ کرلیں لیکن اکثر اس غرض سے آئے کہ اسلام کی حقیقت سے مطلع ہو کر اس کے حلقہ میں آجائیں، ان ہی میں بنو تمیم، بنو سعد، بنو حنیفہ، بنو اسد، کندہ، سلاطین حمیر، ہمدان، ازد اور طے تھے، ان میں بنو تمیم بڑی شان وشوکت سے آئے، خطابت اور شاعری میں دربار نبوت کے خطیبوں اور شاعروں سے مقابلہ کیا، آخر میں بول اٹھے کہ دربار رسالت کے خطیب اور شاعر دونوں ہمارے خطیب اور شاعر سے افضل ہیں پھر انھوں نے اسلام قبول کیا۔

بنو سعد نے ضمام بن ثعلبہ کو اپنا سفیر بنا کر آپؐ کے پاس بھیجا، وہ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا تو بولا: میں تم سے کچھ باتیں پوچھوں گا لیکن سختی سے پوچھوں گا اس پر ناراض نہ ہونا، ارشاد ہوا جو پوچھنا ہے پوچھو، اس نے کئی سوالات کیے جس کا انداز یہ تھا کہ اپنے اللہ کی قسم کھا کر کہو کہ اللہ نے تم کو تمام دنیا کا پیغمبر بنا کر بھیجا ہے، اللہ ہی نے تم کو پانچ وقت نماز کا حکم دیا ہے، اللہ ہی نے تم کو زکوٰۃ وروزہ اور حج کے لیے کہا ہے، آپؐ نے سب کا جواب ہاں میں دیا، جب وہ سب کچھ پوچھ چکا تو اس نے کہا میں واپس جاتا ہوں اور جو تم نے بتایا ہے اس میں سے ایک ذرہ نہ زیادہ کروں گا نہ کم، وہ جاچکا تو آپؐ نے ارشاد فرمایا: اگر یہ صحیح کہتا ہے تو اس نے فلاح پائی اور واقعی پائی، اس نے اپنی قوم سے جا کر کہا: لات وعزیٰ کوئی چیز نہیں، وہ نہ تم کو فائدہ پہونچا سکتے ہیں اور نہ ضرر، میں تو اللہ اور محمد پر ایمان لاتا ہوں، اس کے بعد اس کا سارا قبیلہ مسلمان تھا۔

قبیلۂ ثقیف کی طرف سے ایک وفد آیا تو اس نے اسلام قبول کرنے پر آمادگی اس شرط پر کی کہ ان کے قبیلہ کے لوگوں میں زنا نہ روکا جائے، سود کا کاروبار جاری رہنے دیا جائے اور شراب پینے سے بھی نہ روکا جائے، آپؐ نے یہ تینوں شرطیں نامنظور کیں تو وہ بولے: ہمارے بت لات کے متعلق کیا ارشاد ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ اسلام لانے کے بعد تم کو

توڑ دینا ہوگا، انھوں نے کہا کہ ہم تو اس کو ہاتھ نہیں لگا سکتے، آپؐ جو چاہیں کریں، پھر نماز، زکوٰۃ اور جہاد سے مستثنیٰ ہونے کی درخواست کی، نماز سے تو معافی نہیں دی گئی لیکن اس وقت زکوٰۃ اور جہاد کے لیے ان کو مجبور نہیں کیا گیا، آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ جب یہ ایمان لاچکیں گے تو زکوٰۃ بھی دینے لگیں گے اور جہاد بھی کریں گے، حجۃ الوداع تک کوئی ثقفی ایسا نہ تھا جس نے اسلام نہ قبول کرلیا ہو۔

نجران سے عیسائیوں کا ایک وفد آیا تو آپؐ نے ان کو مسجد میں اتارا اور وہیں انھوں نے مشرق کی طرف منھ کر کے اپنی نماز ادا کی تو آپ نے ان کو نہیں روکا، آپؐ نے ان کو اسلام کی دعوت دی تو ان لوگوں نے کہا کہ تم سے پہلے ہی ہم مسلمان ہیں، آپؐ نے فرمایا کہ جب تم صلیب پوجتے ہو، عیسیٰ کو اللہ کا بیٹا کہتے ہو تو کیوں کر مسلمان ہو سکتے ہو، جب یہ لوگ اس پر راضی نہ ہوئے تو آپؐ نے کہا کہ اچھا مباہلہ کرو یعنی ہم تم دونوں اپنے اہل وعیال کو لے کر آئیں اور دعا کریں کہ جو شخص جھوٹا ہو، اس پر خدا کی لعنت ہو مگر یہ وفد اس کے لیے راضی نہیں ہوا (اس قسم کی مزید تفصیلات اور معلومات کے لیے دیکھو سیرۃ النبیؐ از مولانا شبلی نعمانی ج ۲ ص ۵۶-۱۲)

بنواسد، بنوفزارہ، کندہ عبدالقیس اور بنوعامر کے قبیلے بھی حلقہ بگوش اسلام ہوئے، اس کامیابی کے جو اور اسباب تھے ان پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔

تبلیغ کی کامیابی کا بڑا سبب: آپؐ نے جب اسلام کی تبلیغ شروع کی تو گھر کے صرف چند افراد آپؐ کے ساتھ تھے لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کی تائید کے علاوہ آپؐ کا سب سے بڑا سہارا آپؐ کا اعلیٰ انسانی کردار تھا، بعثت سے پہلے آپؐ نے اپنے اہل وعیال کے ساتھ زندگی بھی گذاری، تجارت بھی کی، دوست ودشمن سے تعلقات بھی رکھے، مال ودولت سے بھی واسطہ رکھا، ہر حال میں اپنی روزمرہ زندگی میں اپنے ہم وطنوں کی نظروں میں پاکیزہ اور ارفع دکھائی دئے، جب نبوت ملی تو آپ کی زندگی جو خلوت میں رہی یا جلوت میں نظر آئی یا جب حقوق اللہ کی خاطر مسجد میں دیکھے گئے یا جب حقوق العباد ادا کیے یا جب میدان جہاد میں متحرک ہوئے یا جب دشمنوں سے صلح کی تو ان تمام مشاغل کی جزوی تفصیلات آج سب

کے سامنے ہیں، ان میں آپؐ کے حسن اخلاق، حسن معاملہ، حسن سلوک، عدل، انصاف، عدم تشدد، مساوات، تواضع، راست گفتاری، ایفائے عہد، زہد، ورع، عفو، حلم، دشمنوں سے رواداری، درگذر، لطف طبع، محبت عام اور رقیق القلبی کے جو نمونے ملتے ہیں ان کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ کی زندگی کو ایک آئیڈیل زندگی کہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں، بیوی سے کیسے پیار اور محبت سے ملنا چاہیے، بچوں سے شفقت کیسے کی جاتی ہے، بھائیوں سے کیا برتاؤ ہو، عزیز و اقارب کے حقوق ادا کرنے میں کیا کیا چیزیں لازمی ہیں، غریبوں اور مسکینوں کی مدد کس طرح کی جاسکتی ہے، بیماروں کی تیمارداری اور عیادت کس طرح ہو، دولت کا بہترین مصرف کیا ہے، حاکمیت و محکومیت کے کیا فرائض و حقوق ہیں، فرمانروائی کے کیا لوازم ہیں، حیوانات پر رحم کرنا کتنا ضروری ہے، انسانی ضروریات اور حالات کے ساتھ زندگی کیسی ہونی چاہیے، ان سب کے اعلیٰ نمونے آپ کی حیات طیبہ میں ملتے ہیں جو آپؐ کے معاصروں اور ہم چشموں کے جسم و روح، ظاہر و باطن، قول و عمل اور زبان و دل کے لیے آئینہ خانہ بنا رہا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپؐ نے اپنی نبوت کی زندگی تو گھر کے چند افراد کے ساتھ شروع کی تھی لیکن جب آپؐ نے اپنے آخری حج کے موقع پر اپنا خطبہ دیا تو تقریباً ایک لاکھ جاں نثار آپؐ کے ساتھ تھے، دلوں کی یہ تسخیر ان ایجابی نیکیوں کی بدولت ممکن ہو سکی جو زندگی کو اخلاقِ طاہرہ اور اوصافِ عالیہ سے معمور کرتی ہیں، آپؐ نے اعلان کر رکھا تھا کہ خلوت میں مجھ میں جو کچھ دیکھو وہ جلوت میں سب سے برملا بیان کرو اور جو رات کی تاریکی میں دیکھو وہ دن کی روشنی میں ظاہر کرو، جو بند کوٹھریوں میں دیکھو اس کو کھلی چھتوں پر پکار کر کہہ دو، یہی وجہ ہے کہ آپ کے پیغام نے آپؐ کے پیرؤوں میں وہ نشہ پیدا کر دیا تھا جس کو حضرت عیسیٰؑ کے ابتدائی پیرؤوں میں تلاش کرنا بے سود ہے، حضرت عیسیٰؑ کو سولی پر چڑھا دیا گیا تو ان کے پیرو بھاگ گئے، ان کا دینی نشہ جاتا رہا اور وہ اپنے مقتدا کو موت کے پنجہ میں گرفتار چھوڑ کر چل دیے، اس کے برعکس محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیرو اپنے مظلوم پیغمبرؐ کے گرد جمع ہوئے اور آپؐ کی مدافعت میں اپنی جانیں خطرہ میں ڈال کر تمام دشمنوں پر آپ کو غالب کر دیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیرؤوں کی جاں نثاری: حضرت عیسیٰؑ کے حواری تو ان

کو موت کے پنجہ میں گرفتار چھوڑ کر بھاگ گئے تھے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جاں نثاروں نے آپؐ کی خاطر جس سرفروشی کا ثبوت دیا اس کی مثال کسی اور مذہب کی تاریخ میں نہیں ملے گی ، جنگ احد میں جب یہ غلط خبر پھیل گئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شہادت پائی تو حضرت علیؓ بے تاب ہو کر اپنی تلوار سے دشمنوں کی صف الٹنے میں مشغول ہو گئے کہ وہ آپؐ کے جسد مبارک تک پہونچ جائیں، حضرت انسؓ کے چچا ابن نصرؓ بھی آگے بڑھے تو دیکھا کہ حضرت عمرؓ مایوس کھڑے ہیں، حضرت ابن نصرؓ کو دیکھ کر بولے اب لڑ کر کیا کریں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو شہادت پائی، حضرت ابن نصرؓ نے کہا تو آپؐ کے بعد ہم زندہ رہ کر کیا کریں گے پھر لڑ کر شہادت پائی، یکا یک حضرت کعبؓ کی نظر رسول اللہ ﷺ پر پڑی وہ چلا اٹھے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابھی زندہ ہیں، پھر تو شمع رسالت کے پروانوں کا ہجوم ہوا، حضرت علیؓ کی تلوار فضا میں بجلی کی طرح کوندنے لگی ۔ زیاد بن سکن نے پانچ انصاریوں کے ساتھ لڑ کر اپنے محبوب آقا کے گرد جان دی ، ایک صحابی بول اٹھے: یارسول اللہؐ اگر میں مارا گیا تو میں کہاں ہوں گا؟ آپؐ نے فرمایا: جنت میں، یہ سنتے ہی بے خود ہو کر اس طرح لڑے کہ شہید ہوئے ، دشمنوں نے گھیر کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر تیر برسائے ، ان کی تلوار سے بھی وار جاری تھا، ایک وار آپؐ کے چہرۂ مبارک پر بھی پڑا مغفر کی دو کڑیاں آپؐ کے چہرۂ مبارک میں چبھ کر رہ گئیں، حضرت ابودجانہؓ آگے بڑھے جھک کر آپؐ کے سپر بن گئے ، ان کی پیٹھ دشمن کے تیروں کا ہدف بن گئی ،تلواروں کا وار حضرت طلحہؓ نے اپنے ہاتھوں پر روکا تو ان کا ایک ہاتھ کٹ کر گر پڑا، رسول اللہؐ کی زبان مبارک سے صرف اتنی صدا بلند ہوئی: اے خدا! میری قوم کو بخش دے، وہ جانتے نہیں، حضرت ابوطلحہؓ نے آپؐ کی مدافعت میں تیر برسانے شروع کیے تو ان کی دو تین کمانیں ٹوٹ کر رہ گئیں انھوں نے اپنے سپر سے آپ کے چہرۂ مبارک کو اوٹ کر لیا، آپؐ گردن اٹھا کر کچھ دیکھنا چاہتے تو حضرت ابوطلحہؓ کہتے کہ ایسا نہ ہو کہ کوئی تیر لگ جائے ،آپؐ کے دشمنوں کے تیر کے لیے یہ میرا سینہ ہے، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص بھی آپؐ کی مدافعت کے لیے قدر اندازی کے لیے آگے بڑھے، دشمنوں کے نرغے سے نکال کر آپؐ کے جاں نثار آپؐ کو ایک پہاڑی

کی چوٹی پر لے گئے، قریش کے سردار ابوسفیان نے تعاقب کیا، مگر حضرت عمرؓ اور دوسرے صحابہؓ نے اس کو آگے بڑھنے نہ دیا پھر بھی اس نے حضرت عمرؓ کو للکارا، کوئی جواب نہیں ملا تو بولا: "سب مارے گئے" حضرت عمرؓ بول اٹھے: او دشمن خدا! ہم سب زندہ ہیں، ابوسفیان نے اپنے بت کا نام لے کر کہا: اے ہبل! تو اونچا رہ، صحابہؓ نے آپؐ کے حکم سے کہا: خدا اونچا اور بڑا ہے، ابوسفیان نے کہا: ہمارے پاس عزیٰ ہے، تمہارے پاس نہیں، صحابہؓ نے جواب دیا: خدا ہمارا آقا ہے، اور تمہارا کوئی آقا نہیں، خواتین بھی اس جنگ میں شریک رہیں، حضرت عائشہؓ اور حضرت انسؓ کی ماں حضرت ام سلیمؓ زخمیوں کو پانی پلاتی تھیں جب دشمنوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گھیر لیا تھا تو حضرت ام عمارہؓ آپ کے لیے سینہ سپر ہو گئیں اور تیر اور تلوار سے دشمنوں کا مقابلہ کیا، حضرت حمزہؓ اس جنگ میں شہید ہوئے، ان کی بہن نے میدان جنگ میں جب ان کی لاش دیکھی تو بولیں: اللہ کی راہ میں یہ کوئی بڑی قربانی نہیں، ایک انصاریہ کے باپ، بھائی، شوہر سب اس جنگ میں شہید ہوئے مگر جب اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو زندہ دیکھا تو بول اٹھی "آپ کے ہوتے سب مصیبتیں ہیچ ہیں"۔ (ماخوذ از سیرۃ النبیؐ ج ا ص ۳۸۰-۸۵)

یہ جاں نثاری اور سرفروشی اسی وقت ممکن ہے جب دلوں پر حکمرانی کی جائے، یہ صحابۂ کرامؓ زیادہ تر اپنا آبائی مذہب چھوڑ کر اسلام میں داخل ہوئے تھے لیکن آپؐ کی ذات مبارک سے ان کو جو گرویدگی اور شیفتگی پیدا ہوئی وہ اس روادارانہ محبت وشفقت کا جلوہ تھا جو ان کو آپؐ کی ذات مبارک میں ہر لمحہ اور ہر آن دکھائی دیتا، حضرت عمرؓ کی محبت میں تو ایسا والہانہ پن رہا کہ جب ۱۱ھ میں آپؐ کا وصال ہوا اور اس کی خبر حضرت عمرؓ کو دی گئی تو انھوں نے اپنی تلوار کھینچ لی اور بولے کہ جو یہ کہے گا کہ آنحضرتؐ نے وفات پائی تو اس کا سر اڑا دوں گا اور جب آپؐ کی میت کو غسل دیا جا رہا تھا تو حضرت علیؓ نے آپؐ کے جسم مبارک کو سینہ سے لگا رکھا تھا، یہ وارفتگی اور محبت اسی وقت ممکن ہے جب کوئی حبیب بن کر دوسروں کو محبوب رکھے اور محبوب ہو کر دوسروں کا حبیب بنا رہے، یہ حبیبیت اور محبوبیت شمشیر وسنان سے نہیں بلکہ دلوں کی تسخیر ہی کے ذریعہ حاصل ہو سکتی ہے۔

اصلی اسلامی تعلیمات: اسلام کی تعلیمات وہی ہیں جو قرآن مجید اور حدیث شریف میں ہیں یا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ یا خلفائے راشدین کے حالات کے سلسلہ میں پائی جاتی ہیں، اس دور میں کوئی ایسی مثال نہیں ملے گی جس سے اسلام کی تبلیغ میں زور، جبر، زبردستی یا تشدد استعمال ہوا ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہے کہ دین کے بارے میں کسی قسم کا جبر نہیں، اس کی وضاحت اس طرح بھی کی گئی ہے کہ

وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَآمَنَ مَنْ فِي الْأَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيعًا، أَفَأَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ (یونس:۱۰)	اگر تیرا پروردگار چاہتا کہ لوگوں کو مومن بنادے تو زمین کے سب لوگ ایمان لاتے، تو کیا اے پیغمبر لوگوں پر زبردستی کرے گا کہ وہ ایمان لے آئیں۔

آپؐ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم بھی ملا تھا کہ جنگ کے بعد جو لوگ پرامن طریقہ سے رہنا چاہتے ہوں تو ان پر مذہب کے معاملہ میں کوئی زور اور دباؤ نہ ڈالا جائے، ان کے خلاف کوئی مذہبی جنگ بھی نہ کی جائے۔

فَإِنِ اعْتَزَلُوكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوكُمْ وَأَلْقَوْا إِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ سَبِيلًا (نساء:۱۲)	تو اگر وہ تم سے کنارہ پکڑیں پھر نہ لڑیں اور تمہارے سامنے صلح کی طرح ڈالیں تو اللہ نے تم کو ان پر حملہ کرنے کی راہ نہیں دی۔

آپؐ نے اپنے کسی قیدی پر اسلام لانے پر جبر نہیں ڈالا، آپؐ قیدیوں کو کلام پاک سناتے، اسلام لانے کی تلقین کرتے، اگر وہ اسلام نہ لاتے تو ان کو امن کی جگہ پہونچا دیتے، کلام پاک میں لڑائی کے میدان میں بھی دشمنوں سے رواداری کی تلقین کی گئی ہے۔

وَإِنْ أَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ أَبْلِغْهُ مَأْمَنَهُ ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُونَ (توبہ:۱۰)	اور اگر لڑائی کے میدان میں مشرکوں میں سے کوئی تجھ سے پناہ مانگے تو اس کو پناہ دے، یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے پھر اس کو اس کے امن کی جگہ پہونچا دے، یہ اس لیے کہ یہ بے علم لوگ ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے فرمایا ہے:

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (آل عمران: ۱۱۰) — تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لیے لائے گئے ہو۔

خیر الامت کے معنی یہ ہیں کہ مسلمان دنیا میں اس لیے ہیں کہ وہ یہاں خیر بن کر نیکیاں پھیلائیں، برائیوں سے پرہیز کریں، جب ان کو خیر امت ہونے کی بشارت دی گئی ہے تو تبلیغ کے سلسلہ میں ان کو ظالم اور سفاک بننے کی تعلیم کیسے دی جا سکتی تھی، کوئی مسلمان حکمراں یا فاتح ایسا ہوا تو وہ اپنی بشری کمزوریوں سے ہوا نہ کہ اپنی مذہبی تعلیم کی بنا پر ہوا، اسلام کا تو یہ پیام ہے:

اِدْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ (حم السجدہ: ع ۵) — برائی کی مدافعت خوبی کے ساتھ کرو پھر تو تمہاری عداوت والا بھی تمہارا گرم جوش دوست بن جائے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی پر عمل کیا، برائی کی مدافعت نیکی سے کی، ظلم کا جواب صبر کر کے دیا تو آپؐ کے عدو آپؐ کے گرمجوش دوست بن گئے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اسلام کی طرف سے خیر اور نیکی کی تبلیغ شروع کی گئی تو اس کے خلاف تلواریں اٹھیں اور اس کی طرف سے جو مدافعت ہوئی وہ انسانی تاریخ کا بے مثال نمونہ ہے۔

آسمانی کتابوں کی صداقت پر ایمان: ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے رسول کے صحیفۂ وحی یعنی قرآن مجید پر ایمان لائے لیکن اس کے لیے قرآن مجید میں بھی لازمی قرار دیا گیا ہے کہ وہ دوسری آسمانی کتابوں کی صداقت کو بھی تسلیم کرے، کوئی مسلمان اس وقت تک سچا مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک کہ کلام پاک کے ساتھ اور دوسرے پیغمبروں کی کتابوں کو تسلیم نہ کرے، سورہ بقرہ رکوع ۱۶ میں ہے کہ اے مسلمانو! تم کہو کہ ہم اللہ پر اور جو کچھ ہماری طرف اتارا گیا اس پر اور جو کچھ ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ، خاندان یعقوبؑ کی طرف اتارا گیا اس پر اور جو کچھ موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دیا گیا اس پر اور جو کچھ اور سب پیغمبروں کو ان کے پروردگار کی طرف سے دیا گیا، ہم ان سب پر ایمان لائے (بقرہ ۱۶)

پھر آل عمران ۹ میں یہی بات دہرائی گئی ہے، اس سے انکار کو کفر قرار دیا گیا، سورہ نساء ۲۰ میں ہے کہ اے وہ لوگو! جو ایمان لا چکے ہو ایمان لاؤ اللہ پر، اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر اتاری اور اس کتاب پر جو پہلے اتاری اور جس نے خدا کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کی کتابوں کا انکار کیا وہ نہایت گمراہ ہوا۔

کلام پاک میں صحف ابراہیم، توریت، زبور اور انجیل کا ذکر تصریح کے ساتھ ہے، مگر کلام پاک ہی میں ہے کہ

وَرُسُلاً قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلاً لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ (نساء:۲۳)	ہم نے تم سے پہلے رسول بھیجے ہیں ان میں سے کچھ ایسے ہیں کہ ان کے حالات تم کو سناتے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جن کے حالات نہیں سناتے ہیں۔

اس کے یہ معنی ہیں کہ کچھ آسمانی کتابیں ایسی بھی ہیں جن کا ذکر کلام پاک میں نہیں کیا گیا ہے، اسی لیے جس کسی صحیفہ میں آسمانی تعلیمات کی خصوصیتیں پائی جاتی ہوں اس کو ہم بالتصریح اللہ کی کتاب تسلیم نہ کریں تو تصریح کے ساتھ اس کا انکار بھی کرنے کا حق نہیں رکھتے، اسی لیے ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اہل کتاب کی نہ تصدیق کرو اور نہ تکذیب'' (صحیح بخاری کتاب التوحید وحدیث الافک) اس سلسلہ میں حضرت الاستاذ علامہ سید سلیمان ندویؒ سیرۃ النبیؐ ج ۴ باب ''کتب الٰہی پر ایمان'' میں تفصیلی بحث کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''حقیقت میں اسلام کی یہ تعلیم دنیا کی مہتم بالشان تعلیمات میں سے ہے جس کا وجود کسی دوسرے مذہب میں نہ تھا، یہ رواداری، بے تعصبی اور عام انسانی اخوت کی سب سے بڑی تعلیم ہے، یہودی اپنی کتاب کو چھوڑ کر تمام دوسری آسمانی کتابوں سے انکار کر کے بھی نجات کا منتظر رہ سکتا ہے، عیسائی تورات اور تمام دوسرے صحیفوں کا انکار کر کے بھی آسمانی بادشاہی کا متوقع ہوسکتا ہے، پارسی اوستا کے سوا دوسری ربانی کتابوں کو باطل مان کر

مینو (جنت) کا استحقاق پیدا کر سکتا ہے، ہندو اپنے ویدوں کے سوا دنیا کی ہر آسمانی کتاب کو دجل وفریب مان کر بھی آواگون سے نجات حاصل کر سکتا ہے، بودھ مت والے اپنے سوا دنیا کی تمام وحیوں کا انکار کر کے بھی مینو حاصل کر سکتے ہیں مگر مسلمان جب تک قرآن کے ساتھ تمام دنیا کی آسمانی کتابوں کو منجانب اللہ نہ تسلیم کرے جنت کا مستحق نہیں ہو سکتا'' (ج ۴ ص ۹۹-۵۹۸)

دنیا کی قوموں کے ساتھ رویہ: مسلمانوں کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ ان کے علاوہ دنیا میں حسب ذیل قومیں ہیں: (۱) اہل کتاب، یعنی وہ لوگ جو قرآن مجید کو تو نہیں مانتے لیکن ان کتابوں میں سے کسی ایک کو تسلیم کرتے ہیں جن کا ذکر کلام پاک میں ہے، ان کے متعلق اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ وہ اگر اسلامی حکومتوں کے وفادار شہری ہیں تو ان کے معابد اور مذہبی عمارتیں محفوظ رکھی جائیں، ان کو اپنے مذہب کے بدلنے پر مجبور نہ کیا جائے، ان کی جان، عزت اور مال کی حفاظت کی جائے، ان کی عورتوں سے مسلمان نکاح کر سکتے ہیں، ان کے ہاتھ کا ذبح کیا ہوا جانور اور ان کے جائز کھانے کھا سکتے ہیں۔ (۲) شبہ اہل کتاب، یعنی وہ لوگ جو ان آسمانی کتابوں میں سے کسی کو تسلیم نہیں کرتے جن کا ذکر کلام پاک میں ہے مگر وہ خود اپنے لیے کسی آسمانی کتاب پر ایمان لانے کے مدعی ہیں، ان میں صابی، مجوس، ہندو اور بودھ وغیرہ شامل ہو سکتے ہیں، اسلام کی تعلیم کے مطابق مسلمان ان کی عورتوں سے نکاح نہیں کر سکتے ہیں، ان کا ذبیحہ نہیں کھا سکتے، ان دو باتوں کے علاوہ ان کو اسلامی حکومتوں میں وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اہل کتاب کو دیے گئے ہیں یعنی ان کی جان، عزت، آبرو، مال اور ان کی عبادت گاہوں کی حفاظت اسلامی حکومتوں کا فرض ہے۔ (۳) کفار اور مشرکین وہ لوگ جن کے پاس نہ کوئی آسمانی کتاب ہے اور نہ وہ کسی مذہب کی پیروی کے دعویدار ہیں، اسلامی حکومتوں میں ان کو بھی امن دینے کی تعلیم دی گئی ہے، سورہ توبہ ۶ میں ہے کہ اگر مشرکین میں سے کوئی شخص تم سے پناہ چاہے تو اس کو پناہ دو، یہاں تک کہ وہ اللہ کے کلام کو سن لے، پھر اس کو اس کی جگہ واپس پہونچا دو، یہ اس لیے کہ یہ لوگ اسلام کی حقیقت سے ناواقف

ہیں۔ (توبہ-۶)

اللہ تعالیٰ کی مصلحت ہے کہ اس دنیا میں کچھ کفار اور مشرکین بھی رہیں، اس کی طرف سے ارشاد ہوتا ہے۔

"اور اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک ہی امت بنا دیتا لیکن وہ جس کسی پر چاہتا ہے راہ گم کر دیتا ہے، جس کسی پر چاہتا ہے کھول دیتا۔ہے اور ضرور ایسا ہوتا ہے کہ تم سے ان کاموں کی باز پرس ہو جو دنیا میں کرتے رہے ہو۔" (نحل:۶)

عہد رسالت میں کچھ لوگوں کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ غیر مسلموں کے ساتھ نیکی کرنے یا ان کو صدقہ دینے سے ثواب نہیں ملتا، اس پر وحی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اتری جس سے مراد یہ تھی کہ ہدایت بخشنا مسلمانوں کا کام نہیں، وہ بلا امتیاز ہر ایک مسلم اور غیر مسلم سے نیکی کریں اور اپنی نیت ٹھیک رکھیں ان کو اجر ملے گا، کلام پاک کی یہ آیتیں ہیں۔

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِي مَنْ يَّشَاءُ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِأَنْفُسِكُمْ وَمَا تُنْفِقُوْنَ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللّٰهِ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ (بقرہ:۳۷)	تیرا ذمہ ان کو راہ پر لے آنا نہیں ہے، اللہ راہ پر لے آتا ہے جس کو چاہے اور جو تم دو گے خیرات سو اپنے واسطے اور تم نہیں دیا کرتے لیکن اللہ کی خوشی چاہ کر اور جو دو گے خیرات وہ تم کو پوری مل جائے گی اور تمہارا حق مارا نہ جائے گا۔

اس سلسلہ میں استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندویؒ سیرۃ النبیؐ میں تحریر فرماتے ہیں:

"اس تفصیل سے معلوم ہوسکتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تعلیم نے دنیا میں امن و امان اور مسلمانوں میں مذہبی رواداری کے پیدا کرنے میں کتنا عظیم الشان حصہ لیا ہے، یہی وہ نظریہ تھا جس نے مسلمانوں کو اپنے مذہبی عقائد و شریعت کی سخت پیروی کے باوجود دنیا کی

دوسری قوموں کے ساتھ مشارکت اور میل جول کے لیے آمادہ کیا، مجوسیوں، صابیوں، یہودیوں، عیسائیوں اور ہندوؤں کے ساتھ مل کر مختلف ملکوں میں ان ملکوں کے مناسب مختلف تمدنوں کی بنیاد رکھنے کی ان میں قوت پیدا کی''۔ (ج ۴ ص ۶۰۱)

رواداری میں رسول اکرمؐ کا اسوۂ حسنہ: کلام پاک میں رواداری، فراخ دلی اور انسان دوستی کی جو تعلیمات دی گئیں ان پر ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل کر کے دکھا بھی دیا، جس کی تائید کلام پاک سے بھی ہوتی ہے، آل عمران ۱۵۹ میں ہے کہ بس خدا کی عنایت سے تم ان کے لیے نرم ہو، اے محمد! اگر تم کہیں کج خلق اور سخت دل ہوتے تو البتہ یہ لوگ جو تمہارے آس پاس جمع ہیں تمہارے اردگرد سے ہٹ جاتے، سورۂ توبہ ۱۶ میں اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے لیے فرمایا کہ آپؐ بھلائی کے بھوکے ہیں، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ساری مخلوق خدا کا کنبہ ہے، اس کے نزدیک سب سے پسندیدہ مخلوق وہ ہے جو اس کے کنبہ کے ساتھ نیکی کرے (طبرانی وبیہقی) آپؐ کی تعلیم یہ بھی رہی کہ ایک دوسرے سے تعلقات منقطع نہ کرو، ایک دوسرے سے منھ نہ پھیرو، ایک دوسرے سے کینہ نہ رکھو، ایک دوسرے سے حسد نہ کرو اور خدا کے بندے! بھائی بھائی بن جاؤ (ترمذی ابواب البر والصلۃ ماجاء فی الحسد) آپؐ کا یہ بھی اعلان ہے کہ جو شخص لوگوں پر رحم نہیں کرتا، اس پر خدا بھی رحم نہیں کرتا (ترمذی ماجاء فی رحمۃ الناس) فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ دوسروں کے لیے وہی پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے اور جب آدمی کسی کو دوست رکھے تو اللہ کے لیے دوست رکھے (مسند احمد بن حنبل ج ۳ ص ۲۷۲) آپؐ نے یہ بھی ہدایت کی کہ تم لوگوں کے لیے وہی پسند کرو جو اپنے لیے پسند کرتے ہو تب مسلمان ہوگے۔ (ترمذی ابواب الزہد) اسلام کے دشمنوں کے مظالم سے تنگ آ کر ایک مرتبہ صحابہؓ نے آپؐ سے ان کے لیے بددعا کی درخواست کی تو آپؐ نے فرمایا: میں لعنت کرنے کے لیے نہیں بھیجا گیا ہوں بلکہ رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ (مشکوٰۃ باب فی اخلاقہ وشمائلہ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منصب نبوت کے فرائض انجام دینے میں جو

رواداری اور فراخ دلی دکھائی وہ انسانی تاریخ کی بہت ہی روشن اور تابناک مثال ہے، قریش، یہود اور نصاریٰ سب ہی نے آپ کو طرح طرح کی ایذائیں پہونچائیں مگر آپ نے ان سب کو بہت ہی صبر، تحمل اور بردباری سے برداشت کیا۔

یہود اور مسلمان: کلام پاک میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہودیوں کا ذکر بہت ہی خفگی، تکدر بلکہ کراہت سے کیا گیا ہے، ان کے لیے پے در پے رسول بھیجے گئے مگر انھوں نے سرکشی کی، کسی کو جھٹلایا، کسی کو قتل کر ڈالا (بقرہ:۸۷، مائدہ:۷۰) انھوں نے آخرت بیچ کر زندگی خریدی ہے (بقرہ:۸۶) ان کے دل سخت ہو گئے ہیں، پتھروں کی طرح سخت بلکہ سختی میں ان سے کچھ بڑھے ہوئے ہیں کیونکہ بعض پتھروں سے تو چشمے بھی پھوٹ نکلتے ہیں (بقرہ:۷۴)

بائبل میں بھی ان کو خطا کار گروہ، بدکرداری سے لدی ہوئی قوم، بدکرداروں کی نسل، باغی، جھوٹے فرزند، اللہ کی شریعت کو سننے سے انکار کرنے والے کہا گیا ہے (باب ۱ آیت ۴، ۵، باب ۳ آیت ۹-۱۴) بائبل ہی میں ہے کہ انھوں نے حضرت سلیمانؑ کو شرک، بت پرستی، جادوگری اور زنا کے بدترین الزامات سے متہم کیا، انھوں نے حضرت داؤدؑ پر اوریاہ کی بیوی سے زنا کرنے کا بھی الزام لگایا۔

یہودیوں کی ان تمام مذموم حرکتوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کے مغضوب ہونے کا فیصلہ کیا۔

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَمَا ثُقِفُوْا إِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَاءُوْا بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ذَالِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْأَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ، ذَالِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ (آل عمران:۱۱۲)

یہ جہاں بھی پائے گئے ان پر ذلت کی مار ہی پڑی لیکن اللہ کے ذمہ یا انسانوں کے ذمہ میں پناہ مل گئی تو یہ اور بات ہے، یہ اللہ کے غضب میں گھر چکے ہیں، ان پر محتاجی و بے چارگی مسلط کر دی گئی ہے اور یہ سب کچھ صرف اس وجہ سے ہوا ہے کہ یہ اللہ کی آیات سے کفر کرتے رہے، انھوں نے پیغمبروں کو ناحق قتل کیا، یہ ان کی نافرمانیوں اور زیادتیوں کا انجام ہے۔

ان کے متعلق اللہ تعالیٰ کی غضبناکی کا اظہار ان کے مجموعۂ کتب مقدمہ میں یسعیاہ، یرمیاہ اور ان کے بعد آنے والے انبیاء کی تمام کتابوں میں ہے، اللہ تعالیٰ کی غضبناکی کا اظہار حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ان متعدد تقریروں سے بھی ہوتا ہے جو اناجیل میں ہیں، اس کی توثیق کلام پاک میں اس طرح کی گئی ہے۔

وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَن يَسُومُهُمْ سُوءَ الْعَذَابِ إِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيعُ الْعِقَابِ (الاعراف:۲)

اور یاد کرو جبکہ تمہارے رب نے اعلان کر دیا کہ وہ قیامت تک برابر ایسے لوگ ان پر مسلط کرتا رہے گا جو ان کو بدترین عذاب دیں گے، یقیناً تمہارا رب سزا دینے میں تیز دست ہے۔

یہودیوں کی اسلام دشمنی مشہور رہی، چنانچہ کلام پاک میں ہے کہ وہ مسلمانوں کی خرابی کے کسی موقع سے فائدہ اٹھانے میں نہیں چوکتے، مسلمانوں کو جس چیز سے نقصان پہونچے وہی ان کو محبوب ہے، ان کے دل کا بغض ان کے منھ سے نکلا پڑتا ہے اور جو کچھ وہ اپنے سینوں میں چھپائے ہوئے ہیں اس سے شدید تر ہے، ان کا بھلا ہوجاتا ہے تو ان کو برا معلوم ہوتا ہے، مسلمانوں پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ خوش ہوتے ہیں۔ (آل عمران رکوع ۱۲)

کلام پاک میں یہ بھی ہے کہ یہ یہودی جھوٹی باتوں کی ٹوہ لیتے پھرتے ہیں، حرام مال کھاتے چلے جاتے ہیں، مگر یہودیوں کی ان تمام نفرت انگیز برائیوں اور بداعمالیوں کے باوجود کلام پاک میں مسلمانوں کو مخاطب کر کے یہ ہدایت دی گئی ہے کہ جب وہ لوگ تمہارے پاس اپنے معاملات کا فیصلہ کرانے کے لیے آئیں تو تم کو اختیار ہے کہ تم فیصلہ کر دو یا ان سے کنارہ کش رہو، وہ تمہارا کچھ بگاڑ نہیں سکتے لیکن اگر فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ کرو کیونکہ اللہ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ (مائدہ:۴۲)

اس سے بڑھ کر اور کیا مذہبی رواداری کا درس دیا جا سکتا ہے اور اس کا عملی ثبوت ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ میں ملے گا۔

رسول اللہؐ اور یہود: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہودیوں سے واسطہ اس وقت پڑا،

جب آپؐ ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے، جہاں یہودی اپنی دولت اور ثروت کی وجہ سے امتیازی حیثیت رکھتے تھے، ان کا تمول ان کے لین دین کی وجہ سے تھا، ان کے یہاں سود لینا جائز تھا، اس کی شرحیں بے رحمی سے مقرر کرتے تھے، اس کے وصول کرنے میں بڑی سفا کی دکھاتے، لوگوں کی جائداد پر قبضہ کر لیتے حتیٰ کہ ان کے بچوں اور عورتوں کو اپنے یہاں رہن رکھ لیتے، دولت کی فراوانی کی وجہ سے ان میں ہر قسم کی عیاشانہ برائیاں بھی پیدا ہوگئی تھیں، عام طور سے وہ نفرت کی نظروں سے دیکھے جاتے مگر لوگ ان کے قرض سے دبے رہتے تھے اس لیے ان کا اقتدار قائم رہتا، عرب کے قبیلے آپس میں لڑا کرتے تو یہ ان کے اختلاف کو کسی نہ کسی صورت میں بڑھاتے رہتے، اسلام پھیلنے لگا تو یہودیت کا زور ختم ہونے لگا، مسلمان ان کی بد اخلاقی کو بری نظر سے دیکھنے لگے، صدیوں سے ان کا جو وقار قائم تھا وہ ضایع ہونے لگا، قرآن مجید ان کے ذمائم کی علاحدہ پردہ دری کر رہا تھا پھر بھی مدینہ کے اطراف میں یہودیوں کے تین قبیلوں بنو قینقاع، بنو نضیر اور قریظہ کا بڑا اثر رہا، انھوں نے اپنے لیے بڑے بڑے قلعے بنا لیے تھے اور مدینہ کے دو قبیلے اوس اور خزرج کو اپنی فتنہ انگیزیوں سے لڑایا کرتے تھے جس سے یہ قبیلے پریشان رہتے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو یہودیوں کی شرانگیزیوں اور بد باطنی سے واقفیت رکھنے کے باوجود ان کے اور مسلمانوں کے تعلقات خوشگوار بنانے کی کوشش فرمائی، مدینہ کے مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان ایک معاہدہ لکھوایا، جس کے شرائط یہ قرار پائے: (۱) خونبہا اور فدیہ کا جو طریقہ پہلے سے چلا آتا تھا اب بھی قائم رہے گا (۲) یہود کو پوری مذہبی آزادی حاصل ہوگی (۳) یہود اور مسلمان آپس میں دوستانہ تعلقات رکھیں گے (۴) فریقین سے جب کسی تیسرے فریق سے جنگ ہوگی تو وہ ایک دوسرے کی مدد کریں گے (۵) کوئی فریق قریش کو امان نہ دے گا (۶) کوئی بیرونی طاقت مدینہ پر حملہ کرے گی تو دونوں مل کر مدافعت کریں گے (۷) کسی دشمن سے اگر ایک فریق صلح کرے گا تو دوسرا بھی شریک صلح ہوگا، البتہ مذہبی لڑائیاں اس سے مستثنیٰ رہیں گی۔ (ابن ہشام ج ۱ ص ۹۷-۲۷۸، سیرۃ النبیؐ ج ۱ ص ۲۷۵)

یہ معاہدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مذہبی رواداری اور فراخدلی کی ایک ایسی

مثال ہے جس پر دنیا ناز کر سکتی ہے، موجودہ دور کی اقوام متحدہ بھی فریقین میں اس سے بہتر معاہدہ نہیں کرا سکتیں مگر اس رواداری کے باوجود یہودی نچنت نہیں بیٹھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت المقدس کے بجائے مکہ کو مسلمانوں کا قبلہ بنانے کا اعلان کیا تو یہودیوں کو بڑا دکھ پہونچا اور انھوں نے معاہدہ کے باوجود مسلمانوں کی علانیہ مخالفت شروع کردی، وہ مدینہ کے ان لوگوں سے ساز باز کرنے لگے جو ابھی تک بت پرست تھے یا مسلمان بننے کے باوجود منافقانہ رویہ اختیار کیے ہوے تھے، جب مدینہ پر قریش نے حملہ کیا تو وہ خوش تھے لیکن جب مکہ کے مشرکین کو بدر کے میدان میں شکست ہوئی تو ان کو بڑا دکھ پہونچا، انھوں نے اسلام کی بیخ کنی کو اپنا شعار بنالیا، بنی قینقاع بڑے طاقتور یہودی تھے، پہلے ذکر آیا ہے کہ ان میں سے ایک یہودی نے ایک انصاریہ عورت کی بے حرمتی کی تو ایک انصاری نے غیرت اور غصہ میں آ کر اس یہودی کو قتل کردیا، یہودیوں نے مل کر اس انصاری کو قتل کردیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو آپؐ ان یہودیوں کے پاس تشریف لے گئے اور ان سے فرمایا: اللہ سے ڈرو، ایسا نہ ہو کہ تم پر بھی بدر والوں کی طرح عذاب نازل ہوجائے، انھوں نے جواب دیا کہ ہم قریش نہیں ہیں ہم سے معاملہ پڑے گا تو ہم دکھا دیں گے کہ لڑائی کس کا نام ہے، یہ نقض امن ایک طرح کا اعلانِ جنگ تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی ریشہ دوانیوں سے عاجز آ چکے تھے، اس لیے مجبور ہو کر ان کے خلاف جنگ کی، وہ قلعہ بند ہوگئے، پندرہ دن کے محاصرہ کے بعد انھوں نے اپنی شکست تسلیم کرلی اور اس پر راضی ہوئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو فیصلہ کریں گے ان کو منظور ہوگا، آپؐ نے ان سے انتقام لینے کے بجائے شام کے علاقۂ زراعات میں جلاوطن کردینے پر اکتفا کیا۔ (سیرت ابن ہشام وابن سعد، غزوۂ بنی قینقاع، سیرۃ النبیؐ ج ا ص ۳۷۱)

یہودیوں کے قبیلہ بنونضیر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی سازش کی، ان پر دو آدمیوں کے قتل کا خونبہا واجب الادا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس مطالبہ کے لئے ان کے پاس تشریف لے گئے تو ایک یہودی نے ایک کوٹھے پر سے پتھر لڑھکا کر آپؐ کو شہید کرنے کی کوشش کی مگر آپؐ کو اس کی خبر ہوئی تو بچ کر لوٹ آئے، چند دنوں کے بعد یہودیوں

میں سے بنی قریظہ نے گذشتہ معاہدہ کی تجدید کرلی، بنونضیر سے بھی اس کی تجدید کرنے کو کہا گیا تو وہ راضی نہیں ہوئے بلکہ اس کے بجائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیغام بھیجا کہ آپ تین آدمی لے کر تشریف لائیں وہ بھی تین عالم ساتھ لائیں گے، اگر ان کے عالم آپؐ پر ایمان لے آئے تو وہ بھی آپؐ پر ایمان لے آئیں گے، آپؐ نے منظور فرمالیا لیکن جلد ہی معلوم ہوا کہ انھوں نے اس بہانہ سے شہید کرنے کے لیے بلایا ہے، ان کی اس سرکشی سے مجبور ہو کر آپؐ نے ان کا محاصرہ کیا، پندرہ دن کے بعد انھوں نے صلح کرلی اور اپنے مال ومتاع کے ساتھ خیبر منتقل ہوجانے کے طلبگار ہوئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اجازت دیدی اور پھر جس طرح وہ مدینہ سے رخصت کیے گئے ہیں اس کی تصویر مولانا شبلیؒ نے اس طرح کھینچی ہے:

”بنونضیر اگرچہ وطن چھوڑ کر نکلے لیکن اس شان سے نکلے کہ جشن کا دھوکا ہوتا تھا، اونٹوں پر سوار تھے ساتھ ساتھ باجا بجتا جاتا تھا، مطربہ عورتیں دف بجاتی اور گاتی تھیں، عروہ بن الورد مشہور شاعر کی بیوی کو یہود نے خرید لیا تھا وہ بھی ساتھ ساتھ تھی، اہل مدینہ کا بیان ہے کہ اس سروسامان کی سواری بھی ان کی نظر سے نہیں گذری تھی، ہتھیاروں کا ذخیرہ جو ان لوگوں نے چھوڑا اس میں پچاس زرہیں، پچاس خود اور تین سو چالیس تلواریں تھیں، ان کے جانے کے بعد یہ جھگڑا پیش آیا کہ انصار کی اولاد جنھوں نے یہودی مذہب اختیار کرلیا تھا اور یہودی ان کو اتحاد مذہب کی وجہ سے ساتھ لیے جاتے تھے، انصار نے ان کو روک لیا کہ ہم ان کو نہ جانے دیں گے، اس پر قرآن مجید کی یہ آیت اتری لَاۤ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ (بقرہ: ۲۵۰) یعنی مذہب میں زبردستی نہیں (ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الاسیر یکرہ علی الاسلام سیرۃ النبیؐ جلد اول ص ۳۷۹)

دشمنوں سے یہ رواداری کی مثال کسی اور قوم کی تاریخ میں ڈھونڈے سے بھی نہیں ملے گی، یہودیوں کی کتاب توریت میں لڑنے والے دشمنوں کے متعلق یہ حکم ہے کہ وہ سب

کے سب قتل کردیے جائیں، ان کی عورتیں اور بچے گرفتار کرلیے جائیں اور ان کا سارا سامان مال غنیمت سمجھا جائے۔

یہودیوں کی شرانگیزی جاری رہی، بنی قریظہ سے معاہدہ کی تجدید ہوگئی تھی مگر وہ بھی نچنت نہیں بیٹھے، بنی نضیر نے ان کو توڑلیا، جس کے بعد بنی نضیر، بنی قریظہ، قریش اور دوسرے قبیلوں نے مل کر چوبیس ہزار کی فوج تیار کی اور مدینہ پر چڑھائی کی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے گرد خندق کھود کر ان کا مقابلہ کیا، اسی لیے یہ جنگ احزاب یا غزوۂ خندق کے نام سے موسوم ہوئی، ایک مہینہ تک یہ محاصرہ جاری رہا، کھانے پینے کا سامان ختم ہوگیا تو مسلمانوں پر کئی فاقے گذر گئے، ایک دن صحابہؓ نے بے تاب ہوکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنے شکم کھول کر دکھائے کہ پتھر بندے ہوئے ہیں، آپؐ نے اپنا شکم مبارک کھول کر دکھایا کہ اس پر ایک کے بجائے دو پتھر بندھے ہوئے تھے، اسی حالت میں صحابۂ کرامؓ دشمنوں کا مقابلہ بڑی بہادری اور جرأت سے کرتے رہے، یہاں تک کہ دشمنوں نے خود سامانِ رسد کی کمی، موسم کی ناخوشگواری اور یہودیوں کی بے وفائی سے عاجز ہوکر میدان چھوڑ دیا، بنی قریظہ جنگ سے واپس ہونے لگے تو مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن حی بن اخطب جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کی طرف بڑھے تو وہ عہد شکنی پر نادم کیا ہوتے، الٹے آپؐ کو گالیاں دینی شروع کیں، جس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا محاصرہ کیا اور جب انھوں نے سپر ڈال دی تو ان کی سرکشی اور بدعہدی کی سزا ان کو توریت کے حکم کے مطابق دی گئی، توراۃ کتاب تثنیہ ۱۰ اصحاح ۲۰ آیت ۱۰ میں ہے:

> ''جب کسی شہر پر حملہ کرنے کے لیے تو جائے تو پہلے صلح کا پیغام دے، اگر وہ صلح تسلیم کرلیں اور تیرے لیے دروازے کھول دیں تو جتنے لوگ وہاں موجود ہوں سب تیرے غلام ہوجائیں گے لیکن اگر صلح نہ کریں تو ان کا محاصرہ کر اور جب تیرا خدا تجھ کو ان پر قبضہ دلادے تو جس قدر مرد ہوں سب کو قتل کردے، باقی بچے، عورتیں، جانور اور جو چیزیں شہر میں موجود ہوں سب تیرے لیے مال غنیمت ہوں گی۔''

یہودیوں کی اسلام دشمنی کا مرکز خیبر میں منتقل ہوگیا، جو مدینہ منورہ سے دوسو میل پر واقع ہے، یہاں ان کے چھ بڑے بڑے قلعے سالم، قموص، نطاۃ، قصارہ، شق اور مربطہ تھے، ان پر یہودیوں کو بڑا غرور تھا، اسی لیے خیبر کو بڑا مرکز بنا کر اسلام کی بیخ کنی کا بیڑا اٹھایا، بنی نضیر یہاں جلاوطن ہوکر آئے تو یہاں کے یہودیوں سے مل کر تمام عرب میں اسلام کے خلاف بغاوت برپا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی، مکہ جا کر قریش کو ابھارا، جنگ احزاب میں مسلمانوں کے خلاف مدد پہونچائی، احزاب میں اسلام کے دشمنوں کو شکست ہوئی تو مدینہ پر حملہ کرنے کی سازش کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دل آزاری کے لیے آپؐ کی چراگاہ سے اونٹنیاں چرا کر لے گئے، ان کو روکنے میں ایک جھڑپ ہوئی تو حضرت ابوذرؓ کے صاحبزادے کا قتل ہوگیا، ان کی بیوی یہودیوں کے ہاتھوں گرفتار ہوگئیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عفو و درگذر سے کام لیتے رہے لیکن ان کی سازشیں خطرناک ہوتی چلی گئیں تو آپؐ نے ان کے خلاف جہاد کا اعلان کیا، خیبر کی جنگ میں حضرت علیؓ نے جو بہادری، جرأت اور پامردی دکھائی وہ اسلام کی تاریخ کا ایک بڑا روشن باب ہے، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو لڑائی کا علم دینے لگے تو انھوں نے عرض کیا کہ کیا یہود کو لڑ کر مسلمان بنالیں، ارشاد ہوا نرمی سے ان کے سامنے اسلام پیش کرو، اگر ایک شخص بھی تمہاری ہدایت سے اسلام لائے تو سرخ اونٹوں سے بہتر ہے۔ (صحیح بخاری، سیرۃ النبیؐ ج ۱ ص ۴۸۷)

حضرت علیؓ کی جاں بازی سے خیبر فتح ہوا تو مسلمانوں نے وہاں کی زمینوں پر قبضہ کرلیا، یہودیوں نے درخواست کی کہ زمینیں ان کے قبضہ میں رہنے دی جائیں، وہ پیداوار کا نصف حصہ ادا کیا کریں گے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی التجا کو منظور کیا، بٹائی کا وقت آیا تو غلہ کو دو حصوں میں تقسیم کردیا گیا اور یہودیوں سے کہا گیا کہ ان میں سے جو حصہ چاہیں وہ لے لیں، یہود اس عدل پر متاثر ہوکر بول اٹھے کہ زمین و آسمان ایسے ہی عدل پر قائم ہے۔ (فتوح البلدان بلاذری ص ۲۷، طبری ج ۳ ص ۸۹، سیرۃ النبیؐ ج ۱ ص ۴۸۹، تاریخ اسلام از شاہ معین الدین احمد ندوی ج ۱ ص ۶۵)

اس جنگ میں رئیس خیبر کی لڑکی صفیہ گرفتار ہوئیں تو ایک صحابی حضرت دحیہ کلبیؓ

کے حصہ میں پڑیں لیکن لوگوں نے اعتراض کیا کہ قریظہ اور نضیر کی رئیسہ کسی اور کے حصہ میں نہیں جا سکتی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ اور کوئی اس کا اہل نہیں، اس اعتراض پر آپؐ نے صفیہ کو پہلے آزاد کیا پھر اپنے عقد میں لے لیا، آپؐ نے اس خاتون کے رتبہ کے لحاظ سے اپنی کنیز بنانا پسند نہیں فرمایا، مسند ابن حنبل میں ہے کہ آپؐ نے ان کو اختیار دیا کہ آزاد ہو کر اپنے یہاں چلی جائیں یا نکاح میں آنا قبول کریں، انھوں نے دوسری صورت پسند کی اور آپؐ کے نکاح میں آ گئیں، اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا شبلیؒ نے تحریر فرمایا ہے:

> ''یہ ظاہر ہے کہ حضرت صفیہؓ خاندان کے تباہ ہونے کے بعد خاندان سے باہر بیوی یا کنیز بن کر رہتیں، وہ رئیس خیبر کی بیٹی تھیں، ان کا شوہر بھی قبیلۂ بنی نضیر کا رئیس تھا، باپ اور شوہر دونوں قتل کیے جا چکے تھے، اس حالت میں ان کے پاس خاطر، حفظ مراتب اور رفع غم کے لیے اس کے سوا اور کوئی تدبیر نہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اپنے عقد میں لے لیں، وہ کنیز ہو کر بھی رہ سکتی تھیں لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی خاندانی عزت کے لحاظ سے ان کو آزاد کر دیا اور پھر نکاح پڑھایا، جس خلق، رحم اور مصیبت زدہ کی چارہ نوازی کے علاوہ سیاسی اور مذہبی حیثیت سے بھی یہ کارروائی نہایت موزوں اور بجا تھی، اس قسم کے طرز عمل سے عرب کو اسلام کی طرف رغبت اور کشش ہوتی تھی کہ اسلام اپنے دشمنوں کے ورثہ کے ساتھ بھی کس قسم کا محسنانہ اور ہمدردانہ سلوک کرتا ہے'' (سیرۃ النبیؐ ج ا ص ۴۹۲)

جان، عزت اور آبرو مذہب کے دشمنوں کے یہاں رشتہ قائم کرنے سے خطرے سے خالی نہ تھیں لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے قلوب کی تسخیر کی خاطر یہ رواداری اور فراخدلی دکھائی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت صفیہؓ سے بڑی محبت رہی، نکاح کے بعد اپنے اونٹ پر سوار کیا اور اپنے عبا سے ان پر پردہ کیا، برابر ان کی دلجوئی فرماتے تھے، ایک بار آپؐ سفر میں تھے کہ حضرت صفیہؓ کا اونٹ بیمار ہو گیا، آپؐ کی ازواج مطہرات میں سے

حضرت زینبؓ کے پاس ضرورت سے زیادہ اونٹ تھے، آپؐ نے ان سے، کہا کہ ایک اونٹ صفیہ کو دے دو، حضرت زینبؓ بول اٹھیں کہ کیا میں اس یہودیہ کو اپنا اونٹ دوں؟ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر ناراض ہوئے کہ دو مہینے تک ان کے پاس نہ گئے، ایک موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت صفیہؓ کے پاس تشریف لائے تو دیکھا کہ وہ رو رہی ہیں ان کے رونے کی وجہ پوچھی تو انھوں نے کہا کہ عائشہؓ اور زینب کہتی ہیں کہ وہ آپؐ کی چچازاد بہن بھی ہیں، اس لیے وہ تمام ازواج میں افضل ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم نے یہ کیوں نہ کہہ دیا کہ ہارونؑ میرے باپ، موسیٰؑ میرے چچا اور محمد ﷺ میرے شوہر ہیں، اس لیے تم لوگ کیونکر مجھ سے افضل ہو سکتی ہو۔ (سیرۃ النبیؐ ج ۲ ص ۴۲۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خیبر کے یہودیوں کے جان و مال، امن و امان کے ضامن ہوئے مگر وہ اپنی شرانگیزیوں سے باز نہیں آئے، ایک دن ایک یہودی عورت زینب نے چند صحابہؓ کے ساتھ آپؐ کی دعوت کی، وہ یہودیوں کے سردار مرحب کی بھانجی تھی جو حضرت علیؓ کے ہاتھوں خیبر کی لڑائی میں ہلاک ہوا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرط کرم میں زینب کی دعوت قبول فرمائی، زینب نے کھانے میں زہر ملا دیا تھا، آپؐ نے کھانا بہت کم تناول فرمایا مگر ایک صحابی بشر بن براءؓ یہ کھانا کھا کر زہر کے اثر سے وفات پا گئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زینب کو بلا کر پوچھا تو اس نے اپنے جرم کا اقبال کیا، یہودیوں نے بھی اقرار کیا کہ ہم نے اس لیے زہر دیا کہ اگر آپؐ پیغمبر ہیں تو زہر خود اثر نہ کرے گا اور پیغمبر نہیں ہیں تو ہم کو آپؐ سے نجات مل جائے گی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اپنی ذات کے لیے کسی سے انتقام نہیں لیا لیکن بشر بن براءؓ کی وفات پر زینب قصاص میں قتل کر دی گئی۔ (سیرۃ النبیؐ ج ۱ ص ۴۹۳)

ایک دفعہ دو صحابیؓ خیبر گئے، یہودیوں نے ان میں سے ایک صحابی عبداللہؓ کو قتل کر کے نہر میں ڈال دیا، دوسرے صحابی محیصہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع دی تو آپؐ نے ان سے پوچھا کہ تم قسم کھا سکتے ہو کہ یہودیوں نے عبداللہؓ کو قتل کیا؟ محیصہؓ نے عرض کیا کہ یہودی تو پچاس مسلمانوں کو قتل کر کے جھوٹی قسمیں کھا لیں گے، رسول اللہ ﷺ

اس جواب سے مطمئن نہیں ہوئے، اس لیے یہودیوں سے تعرض نہیں کیا اور بیت المال سے مقتول کا خوںبہا دلایا۔ (سیرۃ النبیؐ ج ا ص ۴۹۳-۴۹۲)

قرآن مجید میں یہودیوں کی بدطینتی اور بدکرداری کے متعلق جو کچھ کہا گیا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی عملی زندگی میں اس کا عملی ثبوت ملتا رہا مگر آپ کا دل یہودیوں کے برے برتاؤ کے باوجود سخت ہونے کے بجائے نرم رہا، آپؐ نے ایک یہودی خاندان کو صدقہ بھی دیا، حضرت صفیہؓ نے اپنے دو یہودی رشتہ داروں کو تیس ہزار کی مالیت کا صدقہ دیا تو اس میں آپؐ نے کوئی مزاحمت نہیں فرمائی۔ (سیرۃ النبیؐ ج ۶ ص ۲۴۱)

آپؐ نے ہمسایہ کا حق ادا کرنے کی جو تلقین کی اس میں یہودی اور غیر مسلم کی کوئی تفریق نہیں رکھی اور آپ کی اس تعلیم پر صحابۂ کرامؓ برابر عمل کرتے رہے، حضرت عبداللہ بن عمروؓ نے ایک دفعہ ایک بکری ذبح کی، ان کے پڑوس میں ایک یہودی بھی رہتا تھا، انھوں نے گھر کے لوگوں سے دریافت کیا کہ تم نے میرے یہودی ہمسایہ کو بھی بھیجا؟ کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے سنا ہے کہ مجھے جبریل ہمسایہ کے ساتھ نیکی کرنے کی اتنی تاکید کرتے تھے کہ میں سمجھا کہ وہ اس کو پڑوسی کے ترکہ کا حقدار بنا دیں گے۔ (ابوداؤد کتاب الادب، باب فی حق الجوار، سیرۃ النبیؐ ج ۶ ص ۲۸۶)

ایک دفعہ ایک یہودی نے برسر بازار کہا قسم اس ذات کی جس نے موسیٰؑ کو تمام انبیاء پر فضیلت دی، ایک صحابیؓ نے یہ سن کر پوچھا: ''محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی؟'' اس نے کہا: ''ان پر بھی'' صحابیؓ نے غصہ میں اس کو ایک تھپڑ مار دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عدل وانصاف کی شہرت تھی وہ یہودی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور صحابی کی شکایت کی، آپؐ نے صحابیؓ پر برہمی ظاہر فرمائی۔ (صحیح بخاری، سیرۃ النبیؐ ج ۲ ص ۳۷۰)

ایک دفعہ چند یہودی آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے السلام علیکم کے بجائے السام علیکم (تجھ پر موت) کہا، حضرت عائشہؓ موجود تھیں انھوں نے جواب میں کہا: وعلیکم السام واللعنۃ یعنی تم پر موت آئے اور تم پر لعنت ہو، آپؐ نے ان کو روک کر فرمایا: عائشہ! بدزبان نہ بنو، نرمی کرو، اللہ تعالیٰ ہر بات میں نرمی پسند کرتا ہے۔ (صحیح مسلم، کتاب الادب

ج ۲ ص ۲۳۹، سیرۃ النبیؐ ج ۲ ص ۳۷۱، تاریخ اخلاق اسلامی از مولانا عبدالسلام ندوی ص ۱۸۸)

ایک بار آپؐ کہیں تشریف لے جارہے تھے تو ایک یہودی کا جنازہ گذرا، اس کو دیکھ کر آپؐ کھڑے ہوگئے۔ (صحیح بخاری کتاب الجنائز، سیرۃ النبیؐ ج ۲ ص ۳۷۱)

آپؐ یہودیوں سے لین دین کرنے میں تامل بھی نہ فرماتے، گو وہ آپؐ سے سختی اور گستاخی سے پیش آتے رہے، زید بن سنہ جب یہودی تھے تو ایک بار آپؐ نے ان سے قرض لیا، ابھی قرض کی واپسی کی میعاد بھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ وہ تقاضے کے لیے آگئے، آپؐ کی چادر پکڑ کر سخت سست کہا، حضرت عمرؓ موجود تھے انھوں نے کہا: او دشمنِ خدا، رسول اللہ کی شان میں گستاخی کرتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسکرا کر فرمایا: عمر! تم سے کچھ اور امید تھی، اس کو سمجھانا چاہیے تھا کہ نرمی سے تقاضا کرے اور مجھ سے کہنا چاہیے تھا کہ میں قرض ادا کردوں، اس کے بعد یہودی کا قرض ادا کر کے بیس صاع کھجور اور زیادہ دئے۔ (سیرۃ النبیؐ ج ۲ ص ۳۵۸ بحوالہ بیہقی، ابن حبان، طبرانی اور سیوطی)

ایک دفعہ ایک یہودی سے ایک جوڑا کپڑا قرض منگوا بھیجا، اس گستاخ نے کہلا بھیجا کہ وہ میرا مال یونہی اڑا لینا چاہتے ہیں، یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف اتنا فرمایا: وہ خوب جانتا ہے کہ میں سب سے زیادہ محتاط اور سب سے زیادہ امانت کا ادا کرنے والا ہوں۔ (جامع ترمذی کتاب البیوع، سیرۃ النبیؐ ج ۲ ص ۳۵۸)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ابتدائی دور میں صحابۂ کرامؓ کو یہود و نصاری سے روایت کرنے اور ان کی کتابوں کے دیکھنے کی ممانعت فرمائی تھی مگر بعد میں جب التباس و اختلاط کا خوف جاتا رہا تو ان سے روایت کرنے کی اجازت دے دی اور خود ان کی کتابوں کے واقعات بیان فرماتے۔ (بخاری باب ما ذکر عن بنی اسرائیل مع فتح الباری و تاریخ اخلاق اسلامی از مولانا عبدالسلام ندوی ص ۲۳۵-۲۳۲)

آپؐ نے اپنے پڑوسیوں سے ہمیشہ اچھا سلوک کرنے کی تلقین فرمائی، اس میں کافر، مسلمان، عابد، فاسق، دوست، دشمن، مسافر اور شہری کی کوئی قید نہیں رکھی، آپؐ نے صحابۂ کرامؓ کی ایک مجلس میں فرمایا: اللہ کی قسم وہ ایمان نہیں لایا، وہ ایمان نہیں لایا، وہ ایمان

نہیں لایا، صحابۂ کرامؓ نے پوچھا: کون ایمان نہیں لایا؟ آپؐ نے فرمایا: جو پڑوسیوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتا ہے، ایک اور موقع پر فرمایا: وہ شخص مسلمان نہیں جو اپنا پیٹ بھرے اور اس کا پڑوسی بھوکا ہو۔ (*بخاری کتاب الادب، باب الوصیۃ بالجار، ادب المفرد باب* لایشبع دون جارہ، تاریخ اخلاق اسلامی ص ۲۴۷-۱۷۳)

رسول اللہؐ اور عیسائی: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی لڑائی عیسائیوں سے نہیں ہوئی، ان سے معاہدے ہوتے رہے، ۶ھ میں آپؐ نے سینا پہاڑی کے عیسائی راہبوں کو جو سینٹ کیتھرائن کی خانقاہ میں رہتے تھے، بڑی مراعات دیں، یہ رواداری کی ایک شاندار مثال ہے، اس چارٹر میں آپؐ نے اپنے پیرودں کی طرف سے یہ ضمانت لی کہ عیسائیوں کو کسی قسم کا نقصان نہ پہونچایا جائے گا، ان کے گرجے اور ان کے پادریوں کی رہائش گاہوں کی پوری حفاظت کی جائے گی، ان پر غیر منصفانہ طور پر ٹیکس نہ لگائے جائیں گے، کوئی بشپ اپنے منصب سے معزول نہ کیا جائے گا، کسی عیسائی کو جبر سے اس کے مذہب سے منحرف نہ کیا جائے گا، کوئی راہب اپنی خانقاہ سے نہ نکالا جائے گا، کوئی عیسائی اپنے مقدس مقامات کی زیارت کو جائے گا تو اس زیارت میں اس کی کوئی مزاحمت نہیں کی جائے گی، کسی گرجے کو منہدم کر کے مسجد یا کسی مسلمان کا گھر نہ بنایا جائے گا، جو عیسائی عورتیں مسلمانوں کے نکاح میں ہیں ان کو اپنے مذہب پر قائم رہنے کی پوری اجازت ہوگی، ان پر مذہب کی تبدیلی کے لیے کوئی جبر اور زور نہ ڈالا جائے گا، اگر عیسائیوں کو ان کے گرجوں، خانقاہوں اور مذہبی عمارتوں کی مرمت کے لیے امداد کی ضرورت ہوگی تو مسلمان ان کو مالی امداد دیں گے، ان شرائط کی خلاف ورزی مسلمان کریں گے تو ان کو سخت سزائیں دی جائیں گی۔ (اے شارٹ ہسٹری آف دی سارا سنس از امیر علی ص ۱۴-۱۵)

عیسائیوں کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ اچھا سلوک کیا، حاتم طائی کے بیٹے عدی اپنے قبیلہ کے سردار اور مذہباً عیسائی تھے، جس زمانہ میں اسلامی فوجیں یمن گئیں یہ بھاگ کر شام چلے گئے، ان کی بہن گرفتار ہو کر مدینہ آئیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بڑی عزت کے ساتھ رخصت کیا، وہ اپنے بھائی کے پاس گئیں اور کہا کہ جس قدر جلد

ہو سکے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو، وہ پیغمبر ہوں یا بادشاہ، ہر حال میں ان کے پاس جانا مفید ہے، عدی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپؐ سے ایسے متاثر ہوئے کہ اسلام قبول کرلیا۔ (ابن ہشام اسلام عدی بن حاتم، سیرۃ النبیؐ ج ۲ص ۴۲-۴۱)

نجران کے عیسائیوں کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو برتاؤ رہا وہ بھی رواداری کی ایک بڑی اچھی مثال ہے، نجران کے عیسائیوں کا ایک وفد آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپؐ نے ان کو مسجد میں ٹھہرایا اور ان کو اپنے طریقے پر مسجد میں نماز پڑھنے کی اجازت دے دی۔ (زادالمعاد، سیرۃ النبیؐ ج ۲ص ۳۷۱)

۷ھ میں جب پورا جزیرۃ العرب آپؐ کے زیرنگیں ہوگیا تو نجران کے عیسائیوں کو جو حقوق دیے گئے وہ یہ تھے، نجران کے اطراف کے باشندوں کی جانیں، ان کا مذہب، ان کی زمینیں ان کے اموال، ان کے حاضر و غائب، ان کے قافلے، ان کے سفراء، ان کی مورتیں اللہ کی امان اور اس کے رسول ﷺ کی ضمانت میں ہیں، ان کی موجودہ حالت میں کوئی تغیر نہ کیا جائے گا اور نہ ان کے حقوق میں سے کسی حق میں دست اندازی کی جائے گی اور نہ ان کی مورتیں بگاڑی جائیں گی، کوئی اسقف اپنی اسقفیت، کوئی راہب اپنی رہبانیت، کلیسا کا کوئی منتظم اپنے عہدہ سے نہ ہٹایا جائے گا، جو بھی کم یا زیادہ ان کے قبضہ میں ہے، اسی طرح رہے گا، اس کے زمانہ میں جاہلیت کے کسی جرم یا خون کا بدلہ نہ لیا جائے گا، ان سے فوجی خدمت نہ لی جائے گی اور نہ ان پر عشر لگایا جائے گا اور نہ اسلامی فوج ان کی سرزمین کو پامال کرے گی، ان میں سے جو شخص اپنے کسی حق کا مطالبہ کرے گا اس کے ساتھ انصاف کیا جائے گا وغیرہ وغیرہ (فتوح البلدان بلاذری ص۷۶ مطبوعہ مصر کتاب الخراج امام ابو یوسف، دین رحمت مطبوعہ دارالمصنفین ص ۳۸-۳۷)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں آپؐ کے معاصر عیسائی حکمرانوں میں حبشہ کے بادشاہ نجاشی کے لیے بہت ہی نرم گوشہ تھا مکہ میں جب غیر مسلموں نے مسلمانوں کو طرح طرح سے ستانا شروع کیا تو آپؐ نے ان کو حبشہ ہی میں جا کر پناہ لینے کی ہدایت دی، جن

لوگوں نے وہاں ہجرت کی ان میں آپؐ کی صاحبزادی حضرت رقیہؓ بھی اپنے شوہر حضرت عثمان بن عفانؓ کے ساتھ تھیں، ان میں حضرت امیر معاویہؓ کی بہن ام حبیبہؓ بھی تھیں، وہاں ان کے شوہر کا انتقال ہو گیا تو آپؐ نے نجاشی کے ذریعہ ام حبیبہؓ کو اپنے نکاح کا پیغام بھیجا، نجاشی نے خالد بن سعیدؓ کو بیچ میں ڈالا، جنھوں نے آپؐ کی طرف سے ایجاب وقبول کیا، نجاشی نے آپؐ کی طرف سے چار سو اشرفیاں مہر ادا کیں، نکاح کے بعد نجاشی نے حضرت ام حبیبہؓ کو آپؐ کے پاس بھجوا دیا، آپ اکثر نجاشی کے حالات ان سے پوچھا کرتے تھے۔
(تاریخ طبری ج ۲ ص ۱۵۵۹۷۰، سیرۃ النبیؐ ج ۲ ص ۴۷۱)

دعوتی خطوط میں نرمی: حدیبیہ کی صلح کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے معاصر سلاطین کو اسلام کی دعوت دی اور ان کے پاس خطوط اپنے سفراء کے ذریعہ بھجوائے، ان ہی میں ایک خط قیصر روم کے پاس بھی بھیجا، جس میں تحریر فرمایا کہ ''اے اہل کتاب! ایک ایسی بات کی طرف آؤ جو ہم میں اور تم میں یکساں ہے، وہ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی اور کو نہ پوجیں اور ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کو چھوڑ کر اللہ نہ بنائے اور تم نہیں مانتے تو گواہ رہو کہ ہم مانتے ہیں''، یہ خط پہونچا تو اس سے پہلے قیصر روم نے ابوسفیان کو بلا کر اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق طرح طرح کے سوالات کیے، ان کے جوابات پا کر وہ اس نتیجہ پر پہونچا کہ آپؐ شریف النسب ہیں اور پیغمبر اچھے خاندان ہی میں پیدا ہوتے ہیں، آپؐ کے خاندان میں کسی نے نبوت کا دعویٰ نہیں کیا، اگر ایسا ہوتا تو یہ سمجھا جاتا کہ آپ کی نبوت خاندانی خیال کا اثر ہے، آپؐ کے خاندان میں کوئی بادشاہ نہیں ہوا، اگر ایسا ہوتا تو خیال ہوتا کہ بادشاہت کی ہوس ہے، آپؐ کبھی جھوٹ نہیں بولے تو پھر یہی سوچنا پڑے گا کہ جو شخص آدمیوں سے جھوٹ نہیں بولتا وہ اللہ پر کیوں کر جھوٹ باندھ سکتا ہے، آپؐ کی پیروی کمزوروں نے کی اور پیغمبروں کے ابتدائی پیرو غریب ہی لوگ ہوا کیے ہیں، آپؐ کا مذہب ترقی کر رہا ہے تو سچا مذہب ہی بڑھتا ہے، آپؐ نے کبھی فریب نہیں کیا تو پیغمبر کبھی کسی سے فریب نہیں کرتے ہیں، آپؐ نماز، تقویٰ اور عفاف کی ہدایت کرتے ہیں، اگر یہ سچ ہے تو میری قدم گاہ تک آپ کا قبضہ ہو جائے گا، یہ سب کچھ کہہ کر قیصر روم نے اسلام تو قبول نہیں کیا لیکن آپؐ

کی عظمت سے ضرور متاثر ہوا۔

آپؐ نے عزیز مصر مقوقس کو بھی ایک خط لکھا جس میں اس کو اسلام کی دعوت دی تھی اس نے جواب میں لکھا کہ مجھ کو اس قدر معلوم تھا کہ ایک پیغمبر آنے والا ہے، لیکن میں سمجھتا تھا کہ وہ شام میں ظہور کرے گا، میں نے آپؐ کے قاصد کی عزت کی اور دو لڑکیاں بھیجتا ہوں جن کی عزت قبطیوں میں بہت کی جاتی ہے اور میں آپ کے لیے کپڑا اور سواری کا ایک خچر بھی بھیجتا ہوں، جو دو لڑکیاں آئیں، ان میں ایک ماریہ قبطیہؓ بھی تھیں جو حرم نبویؐ میں داخل ہوئیں۔

عزیز مصر تو اسلام نہیں لایا لیکن آپؐ کی نبوت کا معترف ہوا لیکن بعض معاصر سلاطین نے آپؐ کے خطوط پا کر برہمی کا اظہار کیا، ایران کا خسرو پرویز آپؐ کا خط پڑھ کر بولا کہ میرا غلام ہو کر مجھ کو ایسا خط لکھتا ہے، پھر نامۂ مبارک کو چاک کر ڈالا، شام کا رئیس حارث غسانی تھا وہ رومیوں کا ماتحت تھا اس کے پاس آپؐ کا خط پہونچا تو برہم ہوا اور آپؐ کے خلاف فوج کشی کا حکم دیا، موتہ اور تبوک اسی سلسلہ کی لڑائیاں ہیں جو اس بات کا ثبوت ہے کہ آپؐ جارح نہ تھے بلکہ عیسائی رئیس جارح تھا۔

آپؐ نے یمامہ کے رئیس ہوذہ بن علی رئیس کو بھی ایسا خط لکھا، اس نے جواب میں لکھا کہ آپؐ کی باتیں اچھی ہیں مگر آپؐ کی حکومت میں میرا بھی حصہ ہو تو میں آپؐ کی اقتدا کے لیے تیار ہوں لیکن آپؐ اللہ کے پیغام پر کوئی سودا کرنا پسند نہیں کرتے تھے، اس لیے جواب میں لکھ بھیجا کہ زمین کا ایک ٹکڑا بھی ہو تو میں نہ دوں گا۔ (مزید تفصیلات صحیح بخاری باب الجہاد، تاریخ طبری ج ۳ ص ۷۰-۱۵۶۹، اور سیرۃ النبیؐ ج ۱ ص ۷۰-۲۶۲ میں ملے گی)

ان تبلیغی سرگرمیوں سے بھی اندازہ ہوگا کہ آپؐ اپنے معاصر سلاطین کو کس طرح اسلام کی طرف مائل کرنا چاہتے تھے، آپؐ جب اپنے سفراء کو کہیں بھیجتے تو ہدایت کرتے کہ وہ اسلام کا پیام پہونچانے میں وہی نرمی اختیار کریں جس کا حکم کلام پاک میں ہے اور یہ سفراء آپؐ کے ذاتی اخلاق و محاسن اور فضائل سے متاثر تھے، اس لیے سفارت کے فرائض ادا کرنے میں یہی اعلیٰ نمونہ پیش کرتے رہے۔

سفراء کے ساتھ رواداری: ایام جاہلیت میں سفراء کے قتل کر دینے کی عام روایت تھی، لیکن آپؐ نے اس کی ممانعت کی، مسیلمہ کی طرف سے آپؐ کی خدمت میں ایک سفیر آیا جس نے آپؐ سے بڑی گستاخانہ گفتگو کی، آپؐ نے اس سے صرف اتنا فرمایا کہ اگر شریعت میں قاصد کو مارنا ممنوع نہ ہوتا تو میں تمہاری گردن اڑا دیتا (مشکوٰۃ شریف باب قیدیوں کے احکام کا بیان) اگر کوئی سفیر باہر سے آکر آپؐ کی ذات اقدسؐ سے متاثر ہو جاتا اور اسلام قبول کر لیتا تو بھی آپؐ اس کو اپنے پاس نہیں روکتے، ایک صحابی ابورافعؓ کا بیان ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر قریش نے مجھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا، میری نظر جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر پڑی، میرے دل میں اسلام کی صداقت و عظمت نے گھر کر لیا، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! قسم اللہ کی اب میں کبھی قریش کے پاس نہ جاؤں گا، آپؐ نے فرمایا: میں نہ تو عہد کو توڑتا ہوں اور نہ قاصدوں کو قید کرتا ہوں، تم واپس چلے جاؤ، اگر تمہارے دل میں وہ چیز قائم رہے جو اس وقت ہے تو پھر چلے آنا، حضرت ابورافعؓ کا بیان ہے کہ میں پھر واپس چلا گیا اور پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کر لیا۔ (ایضاً)

رواداری کا مفہوم: رواداری قابل تعریف صفت ہے مگر اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ کسی حال میں بھی رواداری سے انحراف نہ کیا جائے، اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی صفت یہ ہے کہ وہ رحمٰن ہے، رحیم ہے، ستار ہے، غفار ہے، توّاب ہے مگر اسی کے ساتھ وہ قہّار بھی ہے، وہ اپنی ستاری اور غفاری میں کفر اور شرک کو بھی برداشت کیے ہوئے ہے مگر جب اس کی قہاری بروئے کار آتی ہے تو بستیاں کی بستیاں تباہ و برباد ہو جاتی ہیں، پوری قوم صفحۂ دنیا سے ختم ہو جاتی ہے، حضرت نوحؑ، حضرت یونسؑ، حضرت لوطؑ، حضرت یوشعؑ، حضرت شیثؑ کی قومیں ایسی نیست و نابود کر دی گئیں کہ ان کے پیغمبروں کا نام لینے والا بھی کوئی باقی نہیں رہا، جس سے یہ ظاہر ہے کہ رحم و کرم اور رواداری ہر موقع پر مفید اور موثر نہیں ہوتی، مختلف حالتوں میں مختلف صورتیں پیش آتی رہتی ہیں، اس لیے انسانیت کو سنوارنے کے لیے کبھی ایسا بھی رویہ اختیار کرنا پڑتا ہے جو ظاہر بیں نگاہوں میں سخت سمجھا جاتا ہے، ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

کے یہاں مدبرانہ سختی کی بھی مثالیں ملیں گی، آپؐ نبی آخرالزماں تھے، آپؐ جامعیت کے پیکر بنا کر مبعوث ہوئے، اس لیے جہاں گذشتہ تمام پیغمبروں کی صفتیں آپؐ کو ودیعت کی گئیں وہاں حضرت عیسیٰؑ کا نرم اخلاق اور حضرت موسیٰؑ کی سختی بھی ملی (تفصیل کے لیے دیکھو خطبات مدراس از مولانا سید سلیمان ندوی باب جامعیت) حضرت عیسیٰؑ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ تعلیم دی گئی کہ تو دشمن کو پیار کر، جو تیرے داہنے گال پر تھپڑ مارے تو اس کے سامنے اپنا بایاں گال بھی پھیر دے، جو تجھ کو ایک میل بیگار لے جائے تو اس کے ساتھ دو میل جا، جو تیرا کوٹ مانگے تو اس کو اپنا کرتا بھی دیدے مگر ان کے ماننے والوں نے اس تعلیم کو نظرانداز کر دیا، یورپ اور امریکہ میں حضرت عیسیٰؑ کے ماننے والوں کی ایک بڑی تعداد ہے مگر کیا وہ اس تعلیم پر عمل کر رہے ہیں، ہیروشیما پر ایٹم بم گرا کر اس شہر کو تباہ کرنے والے وہی تھے جو حضرت عیسیٰؑ کا دم بھرتے تھے، ان کے یہاں شہروں کو برباد کرنے والے اور انسانوں کے خون کی ندیاں بہانے والے اسلحہ کے طرح طرح کے کارخانے کیا اس لیے کھولے جا رہے ہیں کہ وہ حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات کو فروغ دیں۔

ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں جہاں نرم اخلاق رہا، وہاں آپؐ میں سختی بھی رہی مگر اس کی نوعیت یہ تھی کہ آپؐ اپنے ذاتی دشمنوں کے حق میں دعائے خیر کرتے اور ان کا بھلا چاہتے لیکن خدا کے دشمنوں کو کبھی معاف نہیں کرتے اور حق کا راستہ روکنے والوں کو عذاب الٰہی سے ڈراتے رہتے، استاذ محترم مولانا سید سلیمان ندویؒ اپنے گہرے مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہونچے تھے کہ حضر پاس ہم کو سرگرم شجاعانہ قوتوں کا خزانہ مل سکتا ہے مگر نرم اخلاق کا نہیں، حضرت عیسیٰؑ کے یہاں نرم اخلاق کی بہتات ہے مگر سرگرم اور خون میں حرکت پیدا کرنے والی قوتوں کا وجود نہیں، اس دنیا میں ان دونوں قوتوں کی ضرورت ہے اور دونوں کی جامع اور معتدل مثالیں صرف ہمارے پیغمبر اسلام میں مل سکتی ہیں۔ (خطبات مدراس ص ۸۴)

اسلام کی لڑائیاں: آپؐ کے یہاں دشمنوں سے معرکہ آرائی کی مثالیں بھی ملیں گی مگر کون قوم اور کون ملک ہے جس کی تاریخ میں لڑائیوں کی مثالیں نہیں ملتی ہیں، آج کی

متمدن دنیا تو اس کی قائل ہے کہ انسانیت کے فروغ کے لیے جنگ لازمی ہے، بیسویں صدی کی متمدن دنیا میں دو ایسی لڑائیاں لڑی گئیں جو پہلی جنگ عظیم اور دوسری جنگ عظیم کے نام سے یاد کی جاتی ہیں، ان لڑائیوں میں کیا کچھ نہیں ہوا، انسانی خون کا سمندر بہایا گیا، انسان لنگڑے، لولے اور اندھے ہوئے، شہروں کی عمارتیں، عبادت گاہیں اور شفاخانے تباہ ہوئے، لاکھوں عورتیں بیوہ ہوئیں، اتنے ہی تعداد میں بچے یتیم ہوئے، دنیا میں اقتصادی بدحالی آئی، جنگ کے بعد جب صلح نامہ پر دستخط ہوئے تو ملکوں کے حصے بخرے کیے گئے، لاکھوں آدمی گھر سے بے گھر ہوئے، بعض ممالک کے گلوں میں سامراجیت کی غلامی کا طوق ڈالا گیا، ان کے باشندوں کے ساتھ تحقیر آمیز سلوک کیا گیا، ان کے ضمیر، زبان، مذہب کی آزادی پر پابندی عاید کی گئی، ان کے ملکوں کی دولت سے سامراجیت کے خزانے کو پر کیا گیا، اب ان ہی لڑائیوں کے ہاتھوں کے کارناموں کو زریں قرار دے کر ان پر بے شمار جلدیں قلمبند کی جا چکی ہیں اور کی جارہی ہیں۔

ہمارے رسول اکرمؐ نے بھی لڑائیاں لڑیں مگر یہ لڑائیاں جنگ و جدل کی تاریخ کے لیے نمونہ بن سکتی ہیں، آپؐ کے غزوے سکندر اعظم کی طرح ذاتی شان وشوکت اور دبدبہ کے لیے نہ تھے اور نہ شارلیمن کی طرح محض فتح وتسخیر کے لیے تھے، نہ نپولین کی طرح محض ملک گیری کی خاطر تھے اور نہ ہٹلر کی طرح انتقام کے جذبہ کو تسکین دینے کی خاطر تھے، نہ تاج وتخت کے لیے تھے، نہ اپنے ہمراہیوں اور علاقہ کی معاشی خوشحالی کے لیے تھے، بلکہ آپ کو آپؐ کے سارے غزوات کی اجازت اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس لیے دی گئی کہ آپؐ پر ظلم کیا گیا اور آپؐ کے ساتھ آپؐ کے حامیوں کو ان کے گھروں سے اس لیے نکال دیا گیا کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے۔ (سورہ حج: ٦)

مکہ میں جن لوگوں نے فتنہ وفساد برپا کر رکھا تھا اور لوگوں کو امن وامان کے ساتھ زندگی بسر کرنے نہیں دیتے تھے، ان کے خلاف بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے جنگ کا اعلان کر دینے کا حکم دیا گیا۔ (انفال: ۵)

پھر ان لوگوں سے لڑنے کا حکم دیا گیا جو نہ تو خود اللہ اور جزا وسزا پر اعتقاد رکھتے اور

نہ دوسروں کو ان پر یقین کامل رکھنے کی اجازت دیتے مگر ایسے لوگوں کو طرح طرح سے ستاتے اور ان پر ظلم کرتے۔ (توبہ:۴۰)

یہ بات بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ اگر فرانس جمہوریت، مساوات اور اخوت کے نام پر خونیں انقلاب لا کر اپنے سر برآوردہ رہنماؤں کو سولی پر چڑھا سکتا ہے، اس انقلاب کے بعد مراکش، الجزائر اور شام کو غلام بنا کر رکھ سکتا ہے، انگلستان اپنے سامراجی جذبہ کو تسکین دینے کی خاطر امریکہ، کنیڈا، ہندوستان، مصر، عدن، روڈیشیا، جنوبی افریقہ کے گلے میں غلامی کا طوق ڈال سکتا ہے، ہالینڈ محض زراندوزی کی خاطر انڈونیشیا کو اپنی آہنی گرفت میں لا سکتا ہے، پرتگال اپنی آبادی کی مادی خوشحالی کے لیے ایشیا اور افریقہ کے علاقوں پر بیجا تسلط اور قبضہ جما کر اپنی توسیع پسندی پر ناز کر سکتا ہے اور امریکہ جمہوریت کے نام پر ویت نام پر ستر لاکھ ٹن سے زیادہ ہلاکت آفریں اور زہریلے بم گرا سکتا ہے، روس اپنی بولشویزم کو کامیاب بنانے کے لیے انسانی خون سے ہولی کھیل سکتا ہے اور مشرقی یورپ، مشرقی جرمنی اور افغانستان کو اپنے سامنے جھکنے پر مجبور کر سکتا ہے اور برلن شہر کے بیچ میں یاجوجی دیوار کھڑی کر کے اس شہر اور ملک کے باشندوں کو ایک دوسرے سے ملنے جلنے سے روک سکتا ہے، نیشنلزم کو فروغ دینے کے لیے دنیا کی دو بڑی لڑائیاں لڑ کر ساری دنیا کو سیاسی اور معاشی بدحالی میں مبتلا کیا جا سکتا ہے تو اگر ان لوگوں کے خلاف لڑائیاں لڑی گئیں جو ان پر ظلم کرتے تھے اور یہ کہتے کہ ان کا رب اللہ ہے اور جس کام کو اللہ نے حرام قرار دیا تھا اس کو وہ حرام نہیں سمجھتے تو ایسی لڑائیاں کیوں ناجائز سمجھی جائیں، آج کل کی جارحیت ہی میں اصلی مدافعت ہوتی ہے، اگر اسلام نے حق وصداقت کی ترویج کے لیے جارحانہ رنگ اختیار کیا تو اس پر شرمانے کی ضرورت بھی نہیں۔

انسانیت کو اسلام کا پیغام: اسلام کی یہ تعلیم رہی ہے کہ انھیں افراد اور قوموں پر فوز وفلاح اور کامیابی کے دروازے کھولے جائیں گے، جنھیں ربانی حقائق کا یقین ہے اور اس یقین کے ساتھ ان کے عمل بھی نیک ہوتے رہے، فلاح ونجات کا حصول کسی نسل اور قومیت پر موقوف نہیں اور نہ کسی مذہب وملت کی طرف رسمی نسبت پر ہے، بلکہ احکام الٰہی پر

یقین لانے اور ان کے مطابق عمل کرنے پر ہے، عدم ایمان اور بدکاری کا نتیجہ دنیا اور آخرت کی تباہی اور ایمان اور نکوکاری کا نتیجہ دین و دنیا کی بہتری ہے، خدا کے سوا نہ تو آسمان میں نہ زمین میں، نہ آسمان کے اوپر اور نہ زمین کے نیچے کوئی ایسی چیز ہے جو انسان کے سجدہ اور رکوع و قیام کی مستحق ہے، ہر عبادت صرف اسی کے لیے اور ہر پرستش صرف اسی کی خاطر ہے، عبادت کے لیے خدا اور بندے کے درمیان کسی خاص خاندان اور کسی خاص شخصیت کی وساطت کی حاجت نہیں، اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی بندگی اور عبودیت کا نذرانہ پیش کرنا ہی عبادت ہے، اسی کے ساتھ ہر وہ نیک کام جو خاص اللہ اور اس کی مخلوقات کے فائدہ کے لیے ہو اور جس کو صرف اللہ کی خوشنودی کے حصول کے لیے کیا جائے وہ بھی عبادت ہے، وہ تمام اچھے کام جو ہر انسان دوسرے کے فائدے کے لئے کرے وہ بھی عبادت ہے، اخوت کی مجسم تشکیل و تنظیم اور مرکزی رشتۂ اتحاد قائم کرنا بھی عبادت ہے، تقوی، اخلاص، توکل، صبر اور شکر قلبی عبادت ہے، تقویٰ یہ ہے کہ دل میں خیر و شر کی تمیز کے لیے خلش ہو اور اخلاص یہ ہے کہ ہر کام میں اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کا خیال ہو، توکل یہ ہے کہ کسی کام میں خواہ کتنی رکاوٹیں پیدا ہوں اللہ سے آس نہ توڑی جائے اور اپنے برا چاہنے والوں کا بھی برا نہ چاہا جائے، صبر یہ ہے کہ اگر کامیابی ہو تو اس پر مغرور ہونے کے بجائے خدا کا فضل و کرم سمجھا جائے جس کا اقرار کرنا شکر ہے، اللہ کے بندوں میں اللہ کا سب سے پیارا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں، اخلاق کی خوبی اس کے علم و فلسفہ میں نہیں بلکہ اس کے عمل میں ہے اخلاق کی غرض و غایت یہ ہے کہ یہ ہر قسم کی دنیاوی، نفسانی اور ذاتی اغراض سے پاک ہو، غم خواری اور تیمارداری انسانیت کا ایک فرض ہے، لوگوں سے اچھی بات کہنا اور اچھائی سے پیش آنا بھی انسانیت کا فرض ہے، جس میں کسی دین و مذہب کی تخصیص نہیں، دین و مذہب اور نسل و قومیت کا اختلاف اس منصفانہ برتاؤ میں حائل نہ ہو، انسان کے ہر قول اور عمل کی درستی کی بنیاد یہ ہے کہ اس کے لیے اس کا دل اور اس کی زبان باہم ایک دوسرے سے مطابق اور ہم آہنگ ہوں، اسی کا نام صدق یا سچائی ہے، جو سچا نہیں اس کا دل ہر برائی کا گھر ہو سکتا ہے، سخاوت اکثر اخلاقی کاموں کی بنیاد ہے، اس سے ہم جنسوں کے ساتھ ہمدردی اور محبت

کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، عفت و پاکبازی ساری اخلاقی خوبیوں کی جان ہے جس کا لگاؤ عزت اور آبرو سے ہے، یہ انسان کے چہرے کا نور ہے، انسانوں میں سب سے اچھا انسان رحم کرنے والا ہے، اخلاق کی ترازو میں عدل وانصاف کا پلہ کچھ کم بھاری نہیں، جس طرح اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کا سچا اور اپنے عہد کا پکا ہے، اسی طرح اس کے بندوں کی خوبیوں میں سے ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ کسی سے جو وعدہ کریں وہ پورا کریں اور جو قول وقرار کریں اس کے پابند رہیں، سمندر اپنا رخ پھیر دے تو پھیر دے اور پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جائے تو ٹل جائے مگر جو عہد کیا جائے اس کو ضرور پورا کیا جائے، کسی کی بھلائی کرنا ایک ایسی صفت ہے جو ہر نیکی کے کام کو محیط ہے، عفو ودرگذر اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی صفت ہے، اگر یہ نہ ہوتو دنیا ایک لمحہ کے لیے بھی آباد نہ رہے، کبریائی اللہ تعالیٰ کی صفت خاص ہے، بندوں کی شان نہیں کہ وہ کبریائی کریں، ان کی بندگی کی شان یہ ہے کہ وہ تواضع اور خاکساری اختیار کریں، اخلاص کا بڑا وصف یہ ہے کہ دوسروں کی ضرورتوں کو اپنی ضرورت پر مقدم رکھا جائے اسی کا نام ایثار ہے، باطل کو مٹانے اور ظلم وستم کو روکنے میں شجاعت اور بہادری دکھائی جائے، حق بات کے سلسلہ میں چاہے جتنی مشکلیں پیش آئیں، مخالفتیں ہوں، ستایا جائے، ہر خطرہ کو برداشت کیا جائے، حق گوئی کا اظہار سب سے زیادہ قابل ستائش ہے، خیانت بدترین گناہوں میں سے ہے، غداری، دغا بازی، بدعہدی بدترین قسم کی برائیاں ہیں، ناپ تول میں کمی بیشی کرنا ملک میں فساد پھیلانے کے برابر ہے، خدا نے شراب پر، اسکے پینے والے، پلانے والے، بیچنے والے، خریدنے والے، دوسروں کے لیے نچوڑنے والے، اپنے لیے نچوڑنے والے، اس کے لے جانے والے اور جس کے پاس لے جائے سب پر لعنت فرمائی ہے، اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کی بخشایش نہ ہوگی جو دل میں کینہ رکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ظلم کو اپنے بندوں کے لیے حرام کیا ہے، جو شخص اپنی غرض یا غصہ سے اندھا ہوکر دوسروں پر ظلم کرتا ہے، اس کا ظلم قیامت کے دن ظلمات بن جائے گا یعنی اس کا اندھاپن قیامت کے ہولناک دن میں اندھیرا بن کر نمودار ہوگا، تکبر مذہبی، اخلاقی اور معاشرتی بداخلاقیوں کا سرچشمہ ہے، مغروروں کا ٹھکانہ دوزخ ہے، اعمال کی راستی وناراستی، اچھائی اور برائی کا بہت کچھ مدار غرض ونیت پر

ہے، اگر کوئی عمل صرف نمود و نمائش کے لیے ہے تو یہ ریا ہے، جس سے عمل کی ساری عمارت بودی اور کمزور ہو جاتی ہے، کفر کے بعد نفاق اور ریا کا درجہ ہے، فضول خرچی سے بداخلاقی پیدا ہوتی ہے اور قومی سرمایہ بھی برباد ہوتا رہتا ہے، تمام بداخلاقیوں میں سب سے زیادہ خطرناک چیز حسد ہے اور اس سے ہر حال میں پناہ مانگنے کی ضرورت ہے، فحش گوئی اور بدزبانی سے آدمی اجتماعی اور معاشرتی زندگی کے فوائد سے محروم ہو جاتا ہے، رفق و ملاطفت شریفانہ اخلاق ہیں الخ۔

انسانیت کو سنوارنے کے لیے لڑائیاں: اسلام میں اخلاق کے سارے فضائل کی تلقین اور سارے رذائل کی مذمت کی گئی ہے، کیا یہ تعلیمات صرف مسلمانوں کے اخلاق کو سنوارنے کے لیے ہیں یا ان سے دوامی فیضان حاصل کر کے ساری انسانیت سنواری جا سکتی ہے، اگر ان سے انسانیت سنواری جا سکتی ہے تو ان تعلیمات سے انحراف یا انکار کرنے کا نام کفر ہے اور اس کفر کو دبانے اور مٹانے میں جو لوگ رکاوٹ پیدا کریں ان کے خلاف جنگ کی جائے تو کیا یہ عدم رواداری کا ثبوت ہوگا یا ایسی لڑائیوں سے انسانیت کی گردن پر احسانات کا ایک بڑا بوجھ ڈال دیا جائے گا، انسانیت کی گردن پر احسانات کے بوجھ ڈال دینے کا نام ہی جہاد ہے۔

لڑائیوں کے لیے اسلامی قانون جنگ و صلح: اسلام نے لڑائیوں کے لڑنے کے جو حسب ذیل ضوابط و قوانین مرتب کیے ان پر بھی انسانیت فخر کر سکتی ہے:

(۱) زیادتی کرنے والوں سے لڑائی لڑی جایے (الحجرات: ۸)

(۲) جو لوگ دین کے بارے میں لڑیں ان سے بھی لڑائی کی جائے، جو لوگ گھروں سے نکال باہر کریں، ان سے اور ان کی مدد کرنے والوں سے بھی جنگ کی جائے۔ (الممتحنہ: رکوع ۲)

(۳) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کسی مہم پر فوج روانہ فرماتے تو سردار فوج کو جو احکام دیتے ان میں ایک لازمی حکم یہ تھا کہ کسی بوڑھے، کسی بچے یا کسی عورت کو قتل نہ کیا جائے (ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی دعاء المشرکین، سیرۃ النبیؐ ج ا ص ۲۰۸)

(۴) جب دشمنوں سے لڑائی ہو تو لشکر کی صفیں سیسہ پلائی ہوئی دیواروں کی طرح ہوں (سورۃ الصّف رکوع ۱) اس سے یہ مراد ہے کہ صف آرائی میں پوری تنظیم ہو، تال میل میں کوئی کسر نہ ہو، عقیدے اور مقصد میں اتحاد ہو، سرفروشی اور جانبازی کا پورا جذبہ ہو۔

(۵) جنگ کے موقع پر دشمنوں کے علاقے میں جو تخریبی کارروائی کی جائے اس کو فساد فی الارض سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ (سورۃ الحشر: ۵)

(۶) جنگ کے زمانہ یا فتح کے بعد زمینوں، فصلوں اور نسلوں کو تباہ کرنا کسی حال میں جائز نہیں۔ (البقرہ: ۲۰۵)

(۷) دوران جنگ دشمن کے مال اور خاندان کو لوٹنے کی سخت ممانعت کی گئی، آپؐ نے یہ منادی کرا رکھی تھی کہ جنگ کے موقع پر جو دوسروں کے گھروں میں جا کر ان کے رہنے والوں کو تنگ کرے یا لوٹے مارے تو اس کا جہاد قبول نہیں کیا جائے گا۔ (ابوداؤد کتاب الجہاد ج ۱ ص ۳۵۲، سیرۃ النبیؐ ج ۱ ص ۶۱۲) یہ بھی فرمایا کہ جو شخص محض لوٹ مار کر کے مال غنیمت حاصل کرنے کی خاطر جہاد کرتا ہے اس کو کوئی ثواب نہیں ملے گا، جہاد اس شخص کا ہے جو اس لیے کرتا ہے کہ خدا کا (مراد کلمۃ اللہ) بول بالا ہو۔ (بخاری کتاب الجہاد، باب من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا و صحیح مسلم کتاب الامارہ، سیرۃ النبیؐ ج ۱ ص ۶۱۵) ایک دفعہ ایک لڑائی میں صحابہؓ انتہائی تنگ حالی میں مبتلا ہو گئے، فاقہ کی نوبت آ گئی، بکریوں کا ایک ریوڑ نظر آیا تو سب اس پر ٹوٹ پڑے، بکریوں کو ذبح کر کے گوشت پکانا شروع کیا تو آپؐ تشریف لائے اور اپنی کمان سے گوشت کی ہانڈی الٹ دی اور فرمایا لوٹ کا مال مردار گوشت کے برابر ہے۔ (ابوداؤد کتاب الجہاد جلد ثانی باب فی النہی عن النہی اذا کان فی الطعام قلۃ، سیرۃ النبیؐ جلد اول ص ۶۱۰)

(۸) مقتولوں کا سر کاٹ کر گشت کرانے یا دشمن کو گرفتار کر کے کسی چیز سے باندھ کر اس کو تیروں کا نشانہ بنانے یا تلوار سے قتل کرنے کی سخت ممانعت کی گئی۔ (المبسوط سرخسی)

(۹) جب دشمنوں سے مڈبھیڑ ہو تو پہلا کام ان سے لڑ کر ان کو کچل کر رکھ دینا ہے، اس کے بعد قیدیوں پر مضبوطی سے قبضہ کرنا ہے (سورۃ محمد آیت ۴) اس کا مطلب یہ ہے کہ

پہلے دشمن کی جنگی طاقت توڑ دی جائے پھر ان کے آدمیوں کو گرفتار کرنے کی کوشش کی جائے۔

(۱۰) جنگ میں جو لوگ گرفتار ہوں ان کے لیے اختیار دیا گیا ہے کہ ان پر احسان کیا جائے یا ان سے فدیہ لیا جائے لیکن ان کو قتل نہ کیا جائے، ایک بار چند قیدیوں کے قتل کیے جانے کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ملی تو آپؐ نے فرمایا: اللہ کی قسم میں مرغ کو بھی اس طرح مارنا جائز نہیں رکھتا۔ (ابوداؤد ج ۲ ص ۱۰، سیرۃ النبی ج ا ص ۶۰۸)

ایک قیدی سہیل بن عمر بڑا آتش بیان مقرر تھا، آپؐ کے خلاف تقریریں کیا کرتا تھا، جب وہ قیدی بنا کر لایا گیا تو آپؐ سے کہا گیا کہ اس کے دانت توڑ دیے جائیں یہ سن کر آپؐ نے فرمایا کہ اگر میں اس کے دانت تڑوادوں تو اللہ تعالیٰ میرے دانت توڑ دے گا اگر چہ میں نبی ہوں۔ (تہذیب سیرۃ ابن ہشام، بیروت ایڈیشن ۱۳۷۴ھ ص ۱۷۰-۱۶۹)

یمامہ کے سردار ثمامہ ابن اثال جب گرفتار ہو کر آئے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ان کو عمدہ کھانا اور دودھ برابر دیا جاتا رہا۔ (سیرۃ ابن ہشام ج ۲ ص ۴۱۳ مصری ایڈیشن)

جنگ بدر کے قیدیوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابیوں کے حوالے یہ کہہ کر کیا کہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے، ان کو کھانے پینے کی تکلیف نہ ہو، چنانچہ صحابہ خود کھجوریں کھا لیتے لیکن قیدیوں کو پورا کھانا کھلاتے۔ حبش کی جنگ کے چھ ہزار قیدیوں کو آپؐ نے کپڑے کے چھ ہزار جوڑے دیے۔

ذی قرد کی جھڑپ کے موقع پر حضرت سلمہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر عرض کیا کہ میں دشمنوں کو پیاسا چھوڑ کر آیا ہوں، اگر سو آدمی مل جائیں تو ایک ایک کو گرفتار کر لاتا ہوں، آپؐ نے رحمت عام کے لحاظ سے فرمایا: قابو پا جاؤ تو عفو سے کام لینا۔ (بخاری و مسلم، سیرۃ النبیؐ ج ا ص ۴۷۹)

(۱۱) دشمن اگر صلح کے لیے جھکیں تو ان سے صلح کر لی جائے۔ (انفال: ۶۱)

(۱۲) معاہدہ کا پیام لے کر کوئی قاصد آئے تو اس کی جان کی پوری حفاظت کی جائے، اگر اس سے اختلاف بھی ہو تو کسی حال میں قتل نہ کیا جائے۔

(۱۳) دشمنوں کے لیے جاسوسی کرنا کسی حال میں جائز نہیں، اس جرم کے ارتکاب میں جسمانی عقوبتیں، طویل قید اور قتل کی بھی سزا تجویز کی جاسکتی ہے۔

(۱۴) دشمنوں سے معاہدہ کی پابندی ہر حال میں کی جائے گی، صلح حدیبیہ میں یہ طے پایا تھا کہ کافروں یا مسلمانوں میں کوئی شخص اگر مدینہ جائے تو واپس کر دیا جائے لیکن اگر کوئی مسلمان مکہ میں جائے تو واپس نہیں کیا جائے گا، اس صلح کے بعد حضرت ابوجندلؓ قریش سے تنگ آکر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چلے آئے اور اپنے جسم کا داغ رو رو کر دکھایا، حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکرؓ ان کی تکلیف سے متاثر ہوئے، حضرت ابوبکرؓ نے ان کے لیے رسول اکرمؐ سے بار بار سفارش کی مگر آپؐ نے پابندیٔ عہد کے خیال سے ان کو پابہ زنجیر واپس کیا۔ (سیرۃ النبیؐ ج ا ص ۴۵۷)

(۱۵) اگر دشمن معاہدہ کی خلاف ورزی کریں تو ان کے خلاف جنگی کارروائی جائز ہے۔

(۱۶) قیدی اور مفتوح علاقہ کے لوگ جزیہ دینا قبول کرلیں تو وہ مسلمانوں کی طرح آزاد شہری بن کر رہ سکتے ہیں اور ان کو یہ حقوق دیے جائیں: کوئی ان پر حملہ کرے تو ان کی پوری مدافعت کی جائے، ان کو ان کے مذہب سے برگشتہ نہ کیا جائے، جزیہ دینے کے لیے ان کو محصل کے پاس جانے کی زحمت نہ دی جائے، ان کی جان، ان کی عزت، ان کے مال کی حفاظت کی جائے، ان کے قافلے اور تجارت کے کارواں کو محفوظ رکھا جائے، ان کی زمین ان ہی کے پاس رہے، جو چیزیں ان کے قبضہ میں ہوں بحال رکھی جائیں، ان کے پادری، رہبان اور پجاری اپنے عہدوں سے برطرف نہ کیے جائیں، صلیبوں اور مورتیوں کو نقصان نہ پہونچایا جائے، ان سے عشر نہ لیا جائے، ان کے ملک میں فوج نہ بھیجی جائے، ان کا مذہب اور عقیدہ بدلوایا نہ جائے، ان کے حقوق زائل نہ کیے جائیں۔ (فتوح البلدان ص ۶۵-۵۹، مقالات شبلی ج ا ص ۱۸۸-۱۸۹)

کیا اس سے بہتر جنگ و صلح کے قوانین آج کل کی اقوام متحدہ کی مجلس پیش کرسکتی ہے، مستشرقین الزام رکھتے ہیں کہ جزیہ کا ٹیکس لگا کر مسلم اور غیر مسلم شہریوں میں تفریق پیدا

کی گئی، یہ تفریق پیدا کرنے کی خاطر نہیں تھا بلکہ حفاظتی ٹیکس تھا، اگر غیر مسلم ممالک اپنے ان مسلمان باشندوں پر جو اقلیت بن کر ان کے یہاں آباد ہیں ایسے حفاظتی ٹیکس لگائیں تو وہ شاید اس کے خلاف کسی ناراضگی کا اظہار نہ کریں لیکن موجودہ دور کی فریب کار سیاست میں قول اور فعل کا تضاد ہوتا ہے، روس انسانی مساوات اور اخوت کا پیام لے کر اٹھا تو اس نے تہذیب وتمدن کو جس کی بنیادیں سیکڑوں بلکہ ہزاروں برس میں پختہ کی گئی تھیں مسمار کر کے رکھ دیا، سنگین کی نوکوں سے اللہ کے وجود کا انکار کرایا گیا، گرجاؤں اور مسجدوں میں جانے سے روکا گیا، انجیل مقدس کے اوراق کو سگریٹ کے کاغذ کے لیے استعمال کیا گیا، گرجاؤں اور خانقاہوں کے مال و اسباب لوٹے گئے، مذہبی مدارس کھولنے کی اجازت منسوخ کی گئی، کارل مارکس نے یہ نعرہ دیا کہ مذہب انسان کے دل و دماغ پر وہی اثر پیدا کرتا ہے جو افیون کرتی ہے، نکاح اور شادی کے دستور کو ختم کیا گیا، شادی کے رجسٹریشن کو بھی ضروری قرار نہیں دیا گیا، دو عورت مرد، زن وشو کی طرح جب تک چاہیں زندگی بسر کریں، جب چاہیں علاحدہ ہو جائیں، شراب پینا اور جوا کھیلنا بداخلاقی قرار نہیں دی گئی، شخصی ملکیت کا حق ختم کر دیا گیا اور جو لوگ اس کے دعویدار ہوں ان کا خاتمہ کر دیا جائے، جو شریف کہلاتا تھا اس کو رذیلوں سے بدتر بنا دیا گیا، کفر والحاد کی مستی کو اصلی عقیدہ قرار دیا گیا، ان تمام انقلابات کو لانے کے لیے ہر قسم کے ہنگامے اور سازش کو جائز قرار دیا گیا، خواہ ان ہنگاموں اور سازشوں میں خون کی ندیاں ہی کیوں نہ بہیں، لینن اہنسا اور سچ کا قائل نہیں تھا، وہ اپنے مقصد کی برآری کے لیے جائز اور ناجائز سب طریقے اختیار کرنا لازمی سمجھتا تھا، اس کے نزدیک اخلاق اور کردار کی اہمیت نہ تھی، اس کا خیال تھا کہ اخلاق اور کردار ضرورت اور مصلحت کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں، وہ مذہب کو کفر سے بھی بدتر سمجھتا، اس کے خیال میں یہ اوہام پرستی اور قدامت کی طرف لے جاتا ہے، اس نئی زمین اور نئے آسمان بنانے کے سلسلہ میں جو انقلاب لانے کی کوشش کی گئی اس کے مخالفوں اور حریفوں کو دار پر چڑھا دینا ایک معمولی سی بات ہوگئی، ابھی روس کے ایک وزیر اعظم خروشچیف نے انکشاف کیا کہ اسٹائن نے اپنے ہزاروں رقیبوں کو قتل کرا کے اس طرح چپکے سے دفن کرا دیا کہ عام لوگوں کو خبر نہ ہوئی، یہ انکشاف روس کی

برسراقتدار حکومت کو پسند نہ آیا، خروشچیف کو معزول کر کے ذلت اور گمنامی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا۔

جہاد: جہاد بڑا قابل اعتراض لفظ سمجھا جاتا ہے مگر اس پر اعتراض کرنے والے وہی لوگ ہیں جو ایسی جنگ لڑنے کے عادی ہو چکے ہیں جس میں غارتگری، خوں ریزی اور درندگی کی ہولناک ترین مثالیں ملتی ہیں، ۱۹۱۵ء میں جب پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی تو برطانیہ اور امریکہ میں قوم کے تمام نوجوانوں کو ہتھیار اٹھانے پر مجبور کیا گیا، یورپ ہی کے ایک مورخ اے. جی. گرانٹ نے اس جنگ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اللہ نہ کرے کہ دنیا میں پھر اس سے بڑی فوج وجود میں آئے، چند ہفتے کھلے میدان میں جو جنگ ہوئی تو مغربی محاذ کی فوجوں نے خندقیں کھود لیں، جن کا سلسلہ آئس لینڈ سے لوئٹزرلینڈ تک چلا گیا تھا، ان خندقوں میں جو ایک دوسرے سے بہت کم فاصلے پر تھیں ہوا میں، زمین کے نیچے اور اوپر لڑائیاں جاری تھیں، جن میں نہ کبھی عارضی طور پر صلح ہوئی اور نہ لڑنے والوں نے آرام کیا، اس جنگ کے متعلق اعداد و شمار پورے طور پر فراہم نہیں ہوئے ہیں، اندازہ لگانے میں بہت اختلاف ہے مگر اس میں پانچ کروڑ افراد شریک تھے، جن میں سے غالباً اسی لاکھ کام آئے، زخمیوں کی تعداد ان سے چوگنی تھی یعنی یورپ کے نوجوانوں کی ایک نسل ضایع ہوگئی جو اگر آج زندہ ہوتے تو یورپ کے مدبر، مذہبی پیشوا، سائنسداں اور فنون لطیفہ کے ماہر ہوتے، یہی مورخ لکھتا ہے کہ سائنس نے قدرت کے راز ہائے سربستہ معلوم کر لیے تھے مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لاکھوں بنی نوع انسان اس کی ایجادوں کے شکار ہوئے، سائنس ہی کی بدولت ایسے آلات حرب ایجاد ہوئے جن سے لاکھوں جانیں ضایع ہوئیں، جنگ کے اس پہلو پر عرصۂ دراز تک غور وخوض ہوگا، عدالت انسانی میں سائنس کی حیثیت اس وقت ایک ملزم کی ہے، اسی مورخ کا بیان ہے کہ کسی پیغمبر نے ایسی جنگ کی پیشین گوئی نہیں کی تھی جس میں دنیا کے تقریباً سب ممالک شریک ہوں۔ (تفصیل کے لیے دیکھو تاریخ یورپ مصنفہ اے. جی. گرانٹ باب ۲۲)

یہ جنگ کس لیے لڑی گئی، رواداری کا پیام پہونچانے، انسانیت کو سنوارنے، غربت وافلاس کو دور کرنے، سیرت و کردار کے معیار کو بلند کرنے، فضائل اخلاق کی ترویج اور رذائل اخلاق

کو ختم کرنے کے لیے لڑی گئی؟ نہیں مذکورہ بالا مورخ اے. جی. گرانٹ کے الفاظ میں اس کے اسباب یہ تھے کہ آسٹریا اور جرمنی جنگ آزمائی پر تلے ہوئے تھے، اس لیے ساری دنیا پر یہ بلائے عظیم نازل ہوگئی، بلقان میں روس اور آسٹریا کی شدید رقابت تھی، روس اور جاپان کی لڑائی کے موقع پر آسٹریا نے جرمنی کی مدد سے روس کو بلقان میں زک دی تھی، سرویا کو آسٹریا اپنا خاص دشمن سمجھتا تھا، آسٹریا نے ۱۹۱۳ء میں سرویا پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا تو اٹلی نے اس کو روک دیا، ۱۹۱۴ء میں ایک واقعہ کی بدولت اس کو موقع مل گیا، ۲۸ رجون کو سراجیوو میں آسٹریا کا ولی عہد قتل ہوگیا تو حکومت سرویا کی سازش کا شبہ کیا گیا، آسٹریا نے ایک اعلان کے ذریعہ دادرسی چاہی مگر یہ خود جنگ کا اعلان تھا، روس آسٹریا کے بیہودہ مطالبات پر سرویا کی امداد کرنے پر آمادہ ہوگیا، ادھر جرمنی آسٹریا کی مدد پر تیار ہوگیا، فرانس روس کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھا سکتا تھا اس لیے وہ بھی جنگ میں شریک ہوگیا، برطانیہ کو فرانس کی دوستی کی وجہ سے اس میں شرکت کرنی پڑی، یورپ کے بیشتر لوگ امن وصلح کے خواستگار تھے لیکن وہ ہلاکت آفریں جنگی مشینوں کے دندانوں کی گرفت سے بچ نہ سکے۔ (تاریخ یورپ از اے. جی. گرانٹ باب ۲۱) اس جنگ میں جرمنی کو بری طرح شکست ہوئی، تقریباً پچیس سال کے بعد وہ اپنی شکست کا انتقام لینے کے لیے پھر آگے بڑھا ایک اور بلائے عظیم دنیا کی دوسری عالمگیر جنگ کی شکل میں نازل ہوئی، جس کی ہولناکیوں کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔

سپہ سالاری کا مثالی نمونہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کن کن حالات میں اپنے دشمنوں سے جنگ کی، اس کا ذکر گذشتہ صفحات میں آچکا ہے، اگر توحید، رسالت، حق اور صداقت کی ترویج کی خاطر لڑائیاں لڑی بھی گئیں تو یہ ان لڑائیوں سے زیادہ بہتر ہیں جو محض کسی ولی عہد کے قتل یا کسی شکست کے انتقامی جذبے یا سائنس کے تجربات کی آزمائش یا کسی ملک میں سیاسی استحصال کے لیے ہوائی اڈے بنانے یا سیاسی اجارہ داری کے لیے سمندر پر قبضہ رکھنے کی خاطر کی جائیں، اور اگر جمہوریت، قومیت، اشتراکیت اور اشتمالیت کو عقیدہ بنا کر خوں ریزی اور غارت گری کی جاسکتی ہے یا ملک کی سرزمین کی حفاظت کی خاطر سرفروشی کا جذبہ ابھارا جاسکتا ہے تو اگر اللہ اور اس کے رسول کی تعلیمات کو عقیدہ بنا کر اس کی ترویج

میں جو محاذ آرائیاں ہوئیں تو ان پر طنز اور ملامت کیوں کی جائے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لڑائی لڑنے میں جو طریقہ اختیار کیا وہ بھی ایک مثالی نمونہ بن سکتا ہے، کتاب الخراج میں ہے کہ آپؐ نے کبھی کسی قوم سے اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف اسلام کی دعوت دیے بغیر جنگ نہیں کی (پندرھواں باب، قوانین جنگ فصل اول) اس کی تصریح اس طرح کی گئی ہے کہ جنگ کے اسباب خواہ کچھ بھی ہوتے اس کے شروع ہونے سے پہلے دشمنوں کے پاس یہ پیام بھیجا جاتا کہ وہ اسلام لے آئیں تو ان کو وہی حقوق حاصل ہوں گے جو مسلمانوں کے ہیں، اگر وہ اسلام نہیں لاتے تو وہ جزیہ دینا قبول کریں جس کے بعد عام مسلمانوں کی طرح ان کی جان، عزت، آبرو اور دولت کی بھی حفاظت کی جائے گی اور اگر اس کے لیے بھی وہ تیار نہ ہوتے تو جنگ کی جاتی، جب لشکر روانہ کیا جاتا تو آپؐ امیر لشکر اور لشکریوں کو یہ ہدایت دیتے کہ وہ تقویٰ اختیار کرنے والوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کریں، اللہ کا نام لے کر اللہ کی راہ میں اللہ سے انکار نے والوں کے ساتھ جنگ کریں، حملہ کرتے وقت غداری نہ کریں، مثلہ نہ کریں، کسی عورت، بوڑھے، بچے یا خانقاہ نشیں کو قتل نہ کریں، لڑائی میں جو مال غنیمت حاصل ہو اس کا ۴/۵ حصہ ان فوجیوں کے درمیان تقسیم کیا جائے جن کی وجہ سے یہ مال حاصل ہوا ہو، قیدیوں کو ہلاک نہ کریں، ان کو احسان کے طور پر یا فدیہ لے کر چھوڑ دیں۔

اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود جنگ میں شریک ہوتے تو روانہ ہونے سے پہلے یہ دعائیں کرتے کہ ”خدایا! تو سفر کا ساتھی اور گھر کا نگراں ہے، خدایا میں سفر کی ہولناکیوں اور واپسی کی مشکلوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں، یا اللہ! میرے لیے زمین کو مختصر اور سفر کو آسان بنادے“۔ دشمن کے علاقہ میں رات کے وقت پہونچ جاتے تو رات کو حملہ کرنے کی اجازت نہ دیتے، صبح ہونے پر اگر اذان ہوتی رہتی تو بھی حملہ کو روکے رکھتے، لڑائی شروع ہونے سے پہلے یہ دعا فرماتے: ”اللہ تعالیٰ! تو میرا سہارا اور مددگار ہے، تیرے ہی سہارے آگے بڑھتا ہوں اور تیرے ہی سہارے حملہ کرتا ہوں اور تیری ہی خاطر جنگ کرتا ہوں“، اور جب لڑائی سے واپس ہوتے تو یہ دعا فرماتے: ”ہم توبہ کرتے ہوئے اللہ کے عبادت گذار بن کر اس کی حمد کرتے ہوئے واپس ہوتے ہیں“ اور جب گھر پہونچ جاتے تو فرماتے: ”ہم اپنے رب کی

طرف لوٹ آئے، اللہ ہمیں کسی غم سے دوچار نہ کرے"۔ (کتاب الخراج پندرہواں باب، قوانین جنگ فصل تفصیل کے لیے دیکھو اردو ترجمہ از محمد نجات اللہ صدیقی)

کیا دنیا اس سے بہتر سپہ سالار پیش کر سکتی ہے؟

صحابۂ کرامؓ کا اسوۂ حسنہ: آپؐ کی وفات کے بعد صحابۂ کرامؓ نے تو مخالفوں اور دشمنوں سے حسن سلوک کرنے اور لڑائیاں لڑنے میں ان ہی تعلیمات پر عمل کرنے کی کوشش کی جو انھوں نے اپنے محبوب رسولؐ سے پائی تھیں۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کی رواداری: حضرت ابوبکر صدیقؓ اپنی عفت، پارسائی، رحم دلی، راست بازی، دیانتداری، معاملہ فہمی، عجز، تواضع، زہد و تقویٰ کی بدولت محبوب بارگاہ رسول اور محرم اسرار نبوت بن گئے تھے، انھوں نے اپنی زندگی اپنے رسول کے اسوہ کے مطابق ہی گذاری، اس لیے ان کے یہاں بھی عفو و درگذر اور رواداری کی اعلیٰ مثالیں ملتی ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی میں ہر قسم کی ایذائیں پہونچتی رہیں، ان صبر آزما حالات میں حضرت ابوبکر صدیقؓ نے آپؐ کا جس طرح ساتھ دیا وہ بھی سیرت و کردار کا مثالی نمونہ ہے، وہ اپنی دولت و ثروت کے لحاظ سے مکہ میں بہت ممتاز تھے، وہ چاہتے تو اپنے محبوب رسولؐ کے دشمنوں کے خلاف زبردست محاذ قائم کر سکتے تھے مگر ان سے جنگ کرنے کے بجائے ان سے برابر نرمی، صلح، رواداری اور آشتی سے پیش آتے رہے، ان ہی کی محبت بھری دعوت پر حضرت عثمانؓ بن عفان، حضرت طلحہؓ بن عبداللہ، حضرت عثمانؓ بن مظعون، حضرت ابوعبیدہؓ، حضرت ابوسلمہؓ، حضرت خالدؓ بن سعید بن العاص دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے، جن کے زریں کارناموں سے اسلام کی تاریخ بھری پڑی ہے۔ (تاریخ خمیس ص ۲۸۷، خلفائے راشدین از حاجی معین الدین ندوی ص ۵، اسوۂ صحابہ ج ۱ ص ۱۵۲) وہ آزردہ ہو کر کبھی غصہ یا اشتعال میں انتقام لینے کی فکر نہ کرتے، ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تقریر فرما رہے تھے، مشرکین اس پر بہت برہم ہوئے، انھوں نے آپؐ کو اس قدر زد و کوب کیا کہ آپؐ بیہوش ہو گئے، حضرت ابوبکر صدیقؓ جاں نثاری کے لیے آگے بڑھے، ان دشمنوں سے بدلہ لینے کے بجائے صرف اتنا کہا کہ خدا تم سے سمجھے، کیا تم صرف اس لیے آپؐ کو قتل کر دو گے کہ آپؐ

ایک اللہ کا نام لیتے ہیں، اسی طرح ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے کہ عقبہ بن معیط نے اپنی چادر سے آپؐ کے گلے میں پھندا ڈال دیا، اس وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ پہونچ گئے، انھوں نے اس سے سخت برتاؤ کرنے کے بجائے اس کو آپؐ سے علاحدہ کرکے فرمایا: "تم ان کو قتل کردوگے جو تمہارے پاس اللہ کی نشانیاں لائے ہیں اور کہتے ہیں کہ میرا رب اللہ ہے۔" (خلفائے راشدین از حاجی معین الدین احمد ندوی ص ٦، بخاری باب مالقی النبی صلی اللہ علیہ وسلم والصحابۃ من المشرکین بمکہ)

حقوق انسانی کی حمایت: جب حضرت ابوبکرؓ نے خلافت کی ذمہ داری سنبھالی تو اپنی پہلی تقریر میں لوگوں کو مخاطب کرکے کہا کہ اگر میں کج روی اختیار کروں تو مجھے سیدھا کردو، اگر میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کروں تو میری اطاعت لازم نہیں، تمہارا ضعیف فرد بھی میرے نزدیک قوی ہے یہاں تک کہ دوسروں سے اس کا حق اس کو نہ دلادوں اور تمہارا اقوی شخص بھی میرے نزدیک ضعیف ہے یہاں تک کہ میں اس سے دوسروں کا حق نہ حاصل کروں" (طبقات ابن سعد جلد ۳ ص ۱۲، خلفاے راشدین ص ۲۵، تاریخ اسلام از شاہ معین الدین احمد ندوی ج ا ص ۳۳)

عفوودرگذر کی مثالیں: بھٹکے ہوئے کو سیدھی راہ پر لانے، کمزوروں کو حق دلانے اور زبردستوں سے حق حاصل کرنے میں ان کی ساری روادارانہ سرگرمیاں رہیں، اپنے عہد خلافت میں مجرموں کے ساتھ بڑی نرمی اور رحمدلی سے پیش آتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اشعث بن قیس نے بھی اور جھوٹے مدعیان نبوت کی طرح اپنے نبی ہونے کا دعویٰ کیا، وہ جب گرفتار کرکے حضرت ابوبکرؓ کے سامنے حاضر کیے گئے تو انھوں نے توبہ کی، حضرت ابوبکرؓ نے نہ صرف ان کو معاف کردیا بلکہ اپنی ہمشیرہ ام فردہؓ سے ان کا نکاح بھی کردیا۔ (یعقوبی ج ۲ ص ۱۴۹، خلفاے راشدین ص ۵۷) اسی طرح طلیحہ نے بھی نبوت کا دعوی کیا لیکن جب حضرت ابوبکرؓ کے پاس معذرت لکھ بھیجی تو ان کا دل آئینہ کی طرح صاف ہوگیا اور ان کو مدینہ واپس آنے کی اجازت دے دی۔ (یعقوبی ج ۲ ص ۱۴۵)

انھوں نے حضرت مہاجرؓ بن امیہ کو یمامہ کا امیر مقرر کیا تو ان کی امارت کے زمانہ

میں وہاں دو گانے والی عورتوں میں سے ایک نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو میں گانا گایا اور دوسری نے گانے میں مسلمانوں کو برا کہا، حضرت مہاجر بن امیہؓ نے سزا میں ان کے ہاتھ کاٹ ڈالے اور دانت اکھڑوا ڈالے، حضرت ابوبکرؓ کو یہ معلوم ہوا تو سخت برہمی کا اظہار کیا، ان کو لکھ بھیجا کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو کرنے والی عورت اسلام کی پیرو ہے تو وہ مرتد ہوگئی اس کو ارتداد کی سزا ملنی چاہیے تھی اور اگر ذمیہ تھی تو اس نے خلاف عہد کیا لیکن جس عورت نے مسلمانوں کو برا بھلا کہا اس کو کوئی سزا نہ دینی چاہیے تھی کیونکہ اگر وہ مسلمان عورت ہے تو اس کو صرف معمولی تنبیہ کرنے کی ضرورت تھی اور اگر وہ ذمیہ ہے تو جب اس کے مشرک ہونے کو گوارا کرلیا گیا ہے تو مسلمانوں کو برا کہنے کی کیا سزا ہوسکتی ہے، بہرحال یہ تمہاری پہلی خطا تھی، اس لیے معاف کردیا جاتا ہے، مثلہ (یعنی جسم کا حصہ کاٹنا) نہایت نفرت انگیز گناہ ہے، صرف قصاص کی حالت میں مجبوراً مباح ہے۔ (خلفاے راشدین ص ۵۹، تاریخ الخلفاء ص ۹۶)

جنگ میں انسانی رحمدلی: وہ اپنی فوج کو بھی برابر ہدایت دیتے رہتے کہ وہ جہاں داخل ہو وہاں جنگی کارروائی کے علاوہ عام آبادیوں پر کوئی زیادتی نہ ہو یہی رسول اللہ ﷺ کی ہدایت رہی، حضرت ابوبکرؓ نے جب شام کی مہم پر لشکر روانہ کیا تو امیر لشکر کو مخاطب کرکے فرمایا:

> ''تم ایک ایسی قوم کو پاؤ گے جنھوں نے اپنے آپ کو خدا کی عبادت کے لیے وقف کردیا ہے ان کو چھوڑ دینا، میں تم کو دس وصیتیں کرتا ہوں: کسی عورت، بچے اور بوڑھے کو قتل نہ کرنا، پھلدار درخت کو نہ کاٹنا، کسی آباد جگہ کو ویران نہ کرنا، بکری اور اونٹ کھانے کے سوا بیکار ذبح نہ کرنا، نخلستان نہ جلانا، مال غنیمت میں غبن نہ کرنا اور بزدل نہ ہوجانا۔'' (تاریخ الخلفا ص ۹۶، خلفاے راشدین ص ۶۱)

غیر مسلموں کے حقوق کی نگہبانی: ان کے زمانہ میں جو ممالک فتح ہوئے وہاں کی غیر مسلم آبادی کو اپنی پناہ میں لے کر ان کے حقوق کی نگہبانی کا پورا ذمہ لیا، ذمیوں کو جو حقوق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دئے تھے وہی انھوں نے بھی دئے، جب حیرہ فتح ہوا تو وہاں کے عیسائیوں سے یہ معاہدہ کیا گیا کہ ان کی خانقاہیں اور گرجے منہدم نہ کیے جائیں گے، ان

کا وہ قصر نہ گرایا جائے گا جس میں وہ ضرورت کے وقت دشمنوں کے مقابلہ میں قلعہ بند ہوتے ہیں، ان کو ناقوس اور گھنٹے بجانے کی ممانعت نہ ہوگی، تہوار کے موقع پر صلیب نکالنے سے روکے نہ جائیں گے، کوئی بوڑھا آدمی جو کام سے معذور ہو جائے یا کوئی سخت مرض میں مبتلا ہو کر مجبور ہو جائے یا جو پہلے مالدار ہو پھر ایسا غریب ہو جائے کہ خیرات کھانے لگے تو ایسے لوگوں سے جزیہ نہیں لیا جائے گا اور جب تک وہ زندہ رہیں ان کے اہل وعیال کے مصارف مسلمانوں کے بیت المال سے پورے کیے جائیں، البتہ وہ کسی دوسرے ملک میں چلے جائیں تو ان کے اہل وعیال کی کفالت مسلمانوں کے ذمہ نہ ہوگی، اس معاہدہ میں یہ بھی تھا کہ یہاں کے ذمیوں کو فوجی لباس پہننے کے علاوہ ہر طرح کی پوشاک پہننے کی اجازت ہوگی، بشرطیکہ وہ مسلمانوں سے مشابہت پیدا کرنے کی کوشش نہ کریں، مشابہت سے احتراز کرنے کی ہدایت اس لیے دی گئی کہ مسلمانوں اور ذمیوں میں فرق باقی رکھ کر ان کی یعنی ذمیوں کی پوری حفاظت کی جائے، ذمیوں پر یہ بھی لازم قرار دیا گیا کہ وہ مسلمانوں سے دشمنی کا اظہار نہ کریں اور ان کے دشمنوں کو ان کی کمزوریوں سے آگاہ نہ کریں، اگر وہ ان شرائط کی خلاف ورزی کریں گے تو ان کا ذمہ ساقط ہو جائے گا اور ان کو دی ہوئی امان ختم ہو جائے گی اور اگر مسلمانوں پر کوئی اور طاقت غالب آجائے تو پھر ذمیوں کو آزادی ہوگی کہ جو کچھ چاہیں کریں، اس معاہدہ میں یہ بھی لکھا گیا کہ یہ معاہدہ اسی طرح پختہ ہے جس طرح اللہ اپنے نبی سے پختہ معاہدہ کرتا ہے۔ (کتاب الخراج باب ۱۳ فصل ۱۶ اردو ترجمہ ص ۲۱۳، ۴۲، الفاروق جلد دوم ص ۱۴۴، خلفاے راشدین ص ۶۷)

نجران کے عیسائیوں کو مراعات: نجران کے عیسائیوں کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو معاہدہ کیا تھا اس کی توثیق وتجدید حضرت ابوبکر صدیقؓ نے یہ تحریر لکھ کر کی کہ ان کی جان زمین، مال، عبادت، مذہب، ان کے پادری، راہب، ان کی عبادت گاہیں اور ان کے قبضہ میں جو کچھ بھی ہے وہ اللہ کی امان اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پناہ میں ہیں، انھیں نہ کوئی نقصان پہونچایا جائے گا نہ کسی تنگی میں مبتلا کیا جائے گا، کسی اسقف کو اس کی اسقفیت اور کسی راہب کو اس کی رہبانیت سے نہیں ہٹایا جائے گا، یہ عہد ان تمام وعدوں کی تکمیل میں کیا جارہا

ہے جو محمد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کیے تھے۔ (کتاب الخراج نواں باب)

عہد صدیقی میں عیسائی مذہب کا احترام: حضرت ابوبکرؓ ہی کے عہد میں حضرت خالدؓ نے عانات کے پادریوں سے بھی اسی طرح کا معاہدہ کیا کہ ان کے گرجے برباد نہ کیے جائیں گے، وہ نماز کے اوقات کے سوا رات دن جس وقت چاہیں ناقوس بجائیں، اپنے تمام تہواروں میں صلیب نکالیں (کتاب الخراج باب ۱۳ فصل ۶ اردو ترجمہ ص ۴۲۰) تاریخ طبری میں ہے کہ حضرت خالدؓ نے جن علاقوں کو فتح کیا وہاں کے غیر مسلم باشندوں سے جو معاہدے کیے ان میں تصریح کے ساتھ یہ درج ہوتا کہ جزیہ کے معاوضہ میں ان کے مال و جان کی حفاظت ہوتی رہے گی اور جب ان کی یہ حفاظت نہ ہو سکے گی تو ان سے جزیہ نہ لیا جائے گا۔ (تفصیل کے لیے دیکھو تاریخ طبری واقعات ۱۳ھ)

حضرت عمر فاروقؓ کی رواداری: حضرت عمر فاروقؓ عہد رسالت میں اپنی سپہ گری، بہادری، جانبازی اور قوت تقریر کے لیے مشہور تھے، جاں نثاری میں ہر موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست و بازو بنے رہے، آپ بھی ان کو بہت محبوب رکھتے، عشرہ مبشرہ میں ان کا بھی شمار ہوتا ہے، عدل پروری میں سخت گیری سے کام لیتے مگر حب رسول اور اتباع سنت کو کونین کی دولت سمجھتے، حق و صداقت کے اظہار کرنے میں پس و پیش نہ کرتے، اسلام کی خاطر ہر چیز کو قربان کرنے پر تیار رہتے، قرابت کا بھی لحاظ نہیں رکھتے، جنگ بدر میں اپنے ماموں عاصم بن ہشام بن مغیرہ کو اپنی تلوار سے ہلاک کیا، اس جنگ کے بعد بہت سے قیدی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیے گئے تو ان میں قریش کے بہت سے معزز سردار تھے، حضرت ابوبکرؓ کی رائے ہوئی کہ ان سے فدیہ لے کر ان کو چھوڑ دیا جائے مگر حضرت عمرؓ نے اپنے جوشِ ایمان سے مغلوب ہو کر یہ رائے دی کہ اسلام کے دشمنوں کو سزا دینے میں رشتے اور قرابت کا خیال نہ کیا جائے، ہم میں سے ہر شخص اپنے عزیز کو اپنے ہاتھوں سے قتل کرے، رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کی رائے پسند کی اور فدیہ لے کر سب کو رہا کر دیا، جو فدیہ ادا نہ کر سکتے تھے تو اگر وہ پڑھے لکھے تھے تو ان سے کہا گیا کہ وہ دس دس لڑکوں کو پڑھنا لکھنا سکھا دیں تو ان کی رہائی ہو جائے گی، اسی کے بعد کلام

پاک کی یہ آیت نازل ہوئی کہ کسی پیغمبر کے لیے یہ زیبا نہیں کہ اس کے پاس قیدی ہوں جب تک کہ وہ خوب خوں ریزی نہ کرے۔ (سورہ انفال: ۹، طبری ص ۱۱۵۵، مسند احمد بن حنبل ج ا ص ۲۴۶، الفاروق ج ا ص ۳۸)

اپنے عہد خلافت میں حضرت عمرؓ حکومت کے نظم و نسق میں تو بہت ہی سخت اور درشت رہے لیکن ممالک محروسہ کے غیر مسلم باشندوں کے لیے ان کا دل بہت ہی نرم رہا، ان سے ہر طرح کا فیاضانہ، شریفانہ اور روادارانہ برتاؤ کیا، ان کے زمانہ میں حضرت ابوعبیدہؓ کی سپہ سالاری میں شام فتح ہوا تو حضرت ابوعبیدہؓ نے وہاں کے لوگوں سے معاہدہ کیا کہ ان کے گرجے اور خانقاہیں محفوظ رہیں گی، ان کو اپنے تہوار میں جھنڈوں کے بغیر صلیب نکالنے کی اجازت ہوگی، حضرت عمر فاروقؓ نے اس معاہدہ کے بعد ان کو لکھ بھیجا کہ مسلمان ذمیوں پر ظلم نہ کرنے پائیں، نہ ان کو نقصان پہونچائیں، نہ ان کا مال بے وجہ غصب کریں اور جتنی شرطیں ان سے کی جائیں ان کو پورا کیا جائے۔ (کتاب الخراج باب ۱۳ فصل ۶، الفاروق ج ۲ ص ۱۴۰)

جب حضرت ابوعبیدہؓ دمشق سے حمص کی طرف بڑھے تو راستہ میں بعلبک پڑا، یہاں کے باشندوں نے ان سے امان کی درخواست کی تو انھوں نے ان کی جان و مال اور گرجے کو امان دے کر ان کے لیے تحریر لکھی:

> ”بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، یہ امان نامہ فلاں بن فلاں کے لیے، اور اہل بعلبک -اس کے رومیوں، اس کے فارسیوں اور اس کے عربوں- کے لیے ہے، ان کی جانیں، ان کے اموال، ان کے گرجے، ان کی محل سرائیں -خواہ وہ داخل شہر ہوں یا اس کے باہر- اور ان کی چکیاں امان میں ہیں، رومیوں کو اجازت ہے کہ وہ پندرہ میل کے اندر اپنے مویشی چرائیں اور کسی آباد گاؤں میں ماہ ربیع و جمادی الاولی گذارنے تک نہ اتریں، اس کے بعد جہاں چاہیں اتر سکتے ہیں ان میں سے جو اسلام لائے گا اس کے وہی حقوق ہوں گے جو ہمارے ہیں اور اس پر وہی فرائض ہوں گے جو ہم پر ہیں، ان کے تاجروں کو ان شہروں میں سفر کرنے کی اجازت ہے جن سے ہماری صلح

ہو چکی ہے، ان میں جو اپنے مذہب پر قائم رہے گا اس پر جزیہ وخراج ہے، اس پر اللہ شاہد ہے اور اس کی شہادت کفایت کرتی ہے'' (بلاذری عربی ص ۱۳۶، اردو ص ۸-۲۰۷)

شام پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا تو وہاں سے کچھ لوگ نکل کر انطاکیہ پہونچے اور اس کے حکمراں ہرقل کو ایک زبردست فوج لے کر حمص کی طرف بڑھنے کو آمادہ کیا، جہاں حضرت ابوعبیدہؓ اپنے ہمراہیوں اور ان کے متعلقین کے ساتھ سکونت پذیر ہو چکے تھے، حضرت ابوعبیدہؓ کو غنیم کے لشکر جرار کی خبر ملی تو مجلس مشاورت منعقد کی، جس میں یزید بن ابی سفیان نے رائے دی کہ وہ عورتوں اور بچوں کو شہر میں چھوڑ کر باہر لشکر آرا ہو جائیں، شرحبیل بن حسنہ نے اس سے یہ کہہ کر اختلاف کیا کہ ایسی حالت میں شہر کے عیسائی بچوں اور عورتوں کو مارڈالیں گے یا دشمنوں کے حوالہ کر دیں گے، یہ سن کر حضرت ابوعبیدہؓ نے کہا تو پھر ہم عیسائیوں کو شہر سے نکال دیں، شرحبیل نے اس کی بھی پرزور مخالفت یہ کہہ کر کی کہ جب ہم نے عیسائیوں کو اپنی پناہ میں لے لیا ہے اور ان کو شہر میں امن وامان سے رہنے کا حق دے دیا ہے تو نقض عہد کیونکر ہو سکتا ہے، حضرت ابوعبیدہؓ نے اپنی غلطی تسلیم کر لی، اس کے بعد یہ رائے ہوئی کہ حمص کو خالی کر کے دمشق کو محاذ بنایا جائے مگر حمص چھوڑنے سے پہلے حضرت ابوعبیدہؓ نے یہ حکم جاری کیا کہ اب وہ اس کے باشندوں کو دشمنوں سے بچا نہیں سکتے، اس لیے ان سے جو جزیہ یا خراج لیا گیا تھا وہ ان کو واپس کر دیا جائے کیونکہ جزیہ حفاظت کی خاطر وصول کیا جاتا ہے، یہ حفاظت کی ذمہ داری ختم ہو رہی ہے اس لیے ذمیوں کو ان کی رقم واپس ملنی چاہیے، اس حکم کے بعد کئی لاکھ کی رقم واپس کر دی گئی، اس رقم کی روادارانہ واپسی سے وہ بہت متاثر ہوئے، فتوح البلدان میں ہے کہ اس واپسی پر اہل حمص نے کہا ہمیں تمہاری حکومت اور تمہارا عدل اس ظلم وجور سے بہت زیادہ محبوب ہے جس میں ہم تمہارے آنے سے قبل مبتلا تھے، ہم ہرقل کی فوج کی مدافعت کریں گے اور تمہارے عامل کے ساتھ مل کر شہر کی حفاظت کریں گے، سندل یہودیوں نے بھی کہا تورات کی قسم ہرقل کا عمل حمص میں اس وقت تک داخل نہیں ہو سکتا جب تک وہ ہمیں مغلوب نہ کر لے اور ہماری تمام کوششیں ضایع نہ ہو جائیں۔

(فتوح البلدان عربی ج اص ۱۴۴، اردو ترجمہ ج اص ۲۲۱) جزیہ کی رقم مفتوحہ اضلاع میں واپس کردی گئی تو وہاں کے لوگ کہنے لگے: خدا تمہیں فتح عطا کرے اور دوبارہ ہم پر حکمراں بنا کر واپس لائے، آج اگر تمہاری جگہ رومی ہوتے تو ہمیں کچھ بھی واپس نہ دیتے بلکہ الٹے ہر وہ چیز چھین لیتے جو ہمارے پاس باقی رہ گئی ہے اور ہمارے پاس کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ (کتاب الخراج فصل ۶، اردو ترجمہ ۴۱۲، نیز دیکھو الفاروق ج اص ۱۲۸-۱۲۷)

بیت المقدس فتح ہوا تو حضرت عمرؓ کی موجودگی میں وہاں کے لوگوں سے یہ معاہدہ ہوا:

> ''یہ وہ امان ہے جو خدا کے غلام امیر المومنین نے ایلیا کے لوگوں کو دی، یہ امان ان کی جگہ، مال، گرجا، صلیب، تندرست، بیمار اور ان کے تمام مذہب والوں کے لیے ہے، اس طرح پر کہ ان کے گرجاؤں میں نہ سکونت کی جائے گی، نہ وہ ڈھائے جائیں گے، نہ ان کو یا ان کے احاطہ کو نقصان پہونچایا جائے گا، نہ ان کی صلیبوں اور ان کے مال میں کچھ کمی کی جائے گی، مذہب کے بارے میں ان پر جبر نہ کیا جائے گا، نہ ان میں کسی کو نقصان پہونچایا جائے گا، ایلیا میں ان کے ساتھ یہودی نہ رہنے پائیں گے، ایلیا والوں پر یہ فرض ہے کہ اور شہروں کی طرح جزیہ دیں اور یونانیوں کو نکال دیں ان یونانیوں میں سے جو شہر سے نکلے گا اس کی جان اور مال کو امن ہے تا آنکہ وہ جائے پناہ میں پہونچ جائے، جو ایلیا میں رہنا اختیار کرے تو اس کو بھی امن ہے، اس کو جزیہ دینا ہوگا، ایلیا والوں میں سے جو شخص اپنی جان اور مال لے کر یونانیوں کے ساتھ چلا جانا چاہے تو ان کو اور ان کے گرجاؤں اور صلیبوں کو امن ہے، یہاں تک کہ وہ اپنی جائے پناہ تک پہونچ جائیں اور جو کچھ اس تحریر میں ہے اس پر خدا کا، رسول کا، خلفا کا، مسلمانوں کا ذمہ ہے، بشرطیکہ یہ لوگ جزیۂ مقررہ ادا کرتے رہیں، اس تحریر پر گواہ ہیں خالدؓ بن الولید، عمروؓ بن العاص، عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور معاویہؓ بن ابی سفیان اور

۱۵ھ میں لکھا گیا۔" (تاریخ ابو جعفر جریر طبری فتح بیت المقدس ج ۵ ص ۲۴۲۰
الفاروق ج ۲ ص ۱۳۷-۱۳۶)

۲۰ھ میں مصر پر اسلام کا جھنڈا لہرایا تو وہاں کے مذہبی پیشواؤں کے سارے حقوق برقرار رکھے گئے، وہاں کا پٹریارک رومیوں کے ظلم سے تیرہ برس تک جلاوطن ہو کر ادھر ادھر زندگی بسر کر رہا تھا، حضرت عمروؓ بن العاص نے اس کو تحریری امان دے کر واپس بلایا اور اس کو اس کا پرانا منصب عطا کیا۔ (مقریزی ج ا ص ۴۹۲، الفاروق ج ۲ ص ۱۴۲-۱۴۱)
مصر ہی کے فتح کے موقع پر حضرت عمروؓ بن العاص نے لڑائیوں کی تلخیاں دل سے بھلا دیں جب وہاں کے عیسائیوں نے ان کو اپنے یہاں مدعو کیا تو اپنے ہمراہیوں کے ساتھ دعوت میں شریک ہوئے اور پھر ان کو اپنے یہاں جوابی دعوت میں مدعو کیا۔ (الفاروق ج ا ص ۱۲۰)
۲۱ھ میں اسکندریہ فتح ہوا تو وہاں حضرت عیسیٰؑ کی ایک تصویر کی ایک آنکھ کو اسلامی فوج کے کسی لشکری نے اپنے تیر سے پھوڑ ڈالا، عیسائیوں کو سخت تکلیف ہوئی انھوں نے حضرت عمروؓ بن العاص کے پاس پہونچ کر یہ مطالبہ کیا کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی تصویر بنا کر ان کو دی جائے تا کہ وہ بھی اس کی ایک آنکھ پھوڑ ڈالیں، حضرت عمروؓ بن العاص نے جواب دیا، تصویر دینے کی کیا ضرورت ہے ہم لوگ موجود ہیں تم جس کی آنکھ چاہو پھوڑ ڈالو، پھر اپنا خنجر ایک عیسائی کے ہاتھ میں دے کر اپنی آنکھیں سامنے کر دیں، یہ سن کر عیسائی کے ہاتھ سے خنجر گر پڑا، اپنے دعوی سے یہ کہہ کر باز آیا کہ جو قوم اس درجہ دلیر، فیاض اور بے تعصب ہو اس سے انتقام لینا سخت بے رحمی اور بے قدری ہے، یہ واقعہ مصر کے ایک عیسائی بشپ سعید بن البطریق نے اپنی تاریخ مصر میں لکھا ہے جو چھپ چکی ہے، یہ مصنف ۳۲۸ھ میں موجود تھا، اس واقعہ کو مولانا شبلیؒ نے جنوری ۱۹۰۳ء کی ایجوکیشنل کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں بھی بیان کیا تھا۔ (خطبات شبلی ص ۷۴-۷۳)

اسکندریہ ہی کی فتح کے موقع پر کثرت سے قبطی اور رومی گرفتار ہوئے، حضرت عمروؓ بن العاص نے حضرت عمر فاروقؓ سے ان کے متعلق رائے پوچھی تو انھوں نے لکھ بھیجا کہ ان قیدیوں کو اختیار ہے کہ مسلمان ہو جائیں یا اپنے مذہب پر قائم رہیں، اگر انھوں نے اسلام

قبول کرلیا تو ان کو وہی حقوق حاصل ہوں گے جو مسلمانوں کے ہیں ورنہ جزیہ دے کر وہ پناہ میں آجائیں گے، اس حکم کے بعد تمام قیدی ایک جگہ جمع کیے گئے، عیسائی سرداروں کو بھی بلالیا گیا، ہزاروں قیدیوں کے بیچ میں حضرت عمر فاروقؓ کا فرمان پڑھا گیا، ان قیدیوں میں سے جو اسلام قبول کرتا تو مسلمانوں کی طرف سے اللہ اکبر کا نعرہ بلند ہوتا اور جب کوئی اپنی عیسائیت برقرار رکھنے کا اعلان کرتا عیسائیوں میں مبارکباد کی صدا بلند ہوتی۔ (طبری ج ۵ ص ۳-۲۵۸۲، الفاروق ج ا ص ۱۹۶-۱۹۵)

حضرت عمر فاروقؓ کی ہدایت رہی کہ مفتوحہ علاقوں میں وہاں کے لوگوں کے مال، جان اور مذہب کو پورا امان دیا جائے، ۲۲ھ میں آذربائیجان کی تسخیر ہوئی تو وہاں کے باشندوں سے جو معاہدہ ہوا اس میں اس کی تصریح کی گئی کہ ان کے مال، جان، مذہب اور شریعت کو امان ہے۔ (طبری ج ۵ ص ۲۶۶۲، الفاروق ص ۱۴۲) اسی طرح حذیفہ بنؓ الیمان نے ماہ دینار والوں کو جو تحریر لکھی یا جرجان والوں سے جو معاہدہ کیا گیا اس میں بھی اس کی پوری وضاحت کی گئی ہے کہ ان کا مذہب نہ بدلا جائے گا، ان کے مذہبی امور میں دست اندازی نہ کی جائے گی، ان کی شریعت میں کوئی تغیر نہ کیا جائے گا۔ (طبری ج ۵ ص ۲۶۷۲، الفاروق ج ۲ ص ۱۴۲) ۲۳ھ میں سیستان فتح ہوا تو وہاں کے باشندوں سے اس شرط پر صلح ہوئی کہ ان کی تمام اراضی خمس سمجھی جائے، مسلمانوں نے اس شرط کو منظور کر کے یہ نمونہ پیش کیا کہ جب مزروعات کی طرف نکلتے تو تیزی سے گذر جاتے کہ زراعت چھو تک نہ جائے۔ (الفاروق ج ا ص ۱۸۳، طبری ج ۵ ص ۲۷۰۵)

ایک بار حضرت عمر فاروقؓ کہیں سے گذر رہے تھے کہ ایک بوڑھے اندھے سائل کو بھیک مانگتے دیکھا، تو اس سے پوچھا کہ تم کس مذہب کے پیرو ہو؟ اس نے جواب دیا کہ یہودی ہوں، پھر پوچھا بھیک کیوں مانگتے ہو؟ وہ بولا: بوڑھا ہو کر محتاج ہو گیا ہوں جزیہ کی بھی رقم ادا کرنی ہوتی ہے، یہ سن کر حضرت عمرؓ اس کو اپنے گھر لے گئے اور گھر سے لا کر کچھ دیا، پھر بیت المال کے خازن کو بلا کر حکم دیا کہ اس کا اور اسی کی طرح اور مجبور لوگوں کا خیال رکھو، یہ بات انصاف کے خلاف ہے کہ ایسے لوگوں سے جوانی میں تو جزیہ وصول کر کے فائدہ

اٹھایا جائے اور وہ بوڑھے ہوں تو ان کو بے سہارا چھوڑ دیا جائے پھر یہ آیت پڑھی انما الصدقات للفقراء والمساکین اس میں فقراء سے مراد مسلمان فقراء ہیں اور مسکینوں میں اہل کتاب بھی شامل ہیں، اس کے بعد اس یہودی اور اسی طرح کے اور معذور اہل ذمہ مسکینوں کا جزیہ معاف کر دیا۔ (کتاب الخراج باب ۱۳ فصل ۲)

ایک بار حضرت عمرؓ فاروق شام سے واپس آ رہے تھے تو ایک ایسی جگہ سے گذرے جہاں کچھ لوگ دھوپ میں کھڑے کر دئے گئے تھے اور ان کے سروں پر تیل ڈالا جا رہا تھا، دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ ان کو جزیہ دینے کی استطاعت نہیں مگر ان سے واجب الادا جزیہ وصول کرنا ضروری ہے، یہ سن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا ان کو چھوڑ دو، ان پر ان کی برداشت سے زیادہ بار نہ ڈالو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ لوگوں کو عذاب نہ دو، جو لوگ دنیا میں انسانوں کو عذاب دیتے ہیں ان کو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ عذاب دے گا۔ (کتاب الخراج باب ۱۳ فصل ۲)

حضرت عمر فاروقؓ نے اس کی پوری نگرانی کی کہ غیر مسلموں اور ذمیوں پر مسلمان غاصبانہ قبضہ نہ کریں، جب ممالک فتح ہونے لگے تو حضرت ابوعبیدہؓ نے حضرت عمر فاروقؓ کو لکھ بھیجا کہ مسلمان ان سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ مفتوحہ علاقہ کے شہر، وہاں کی زمین، کھیت اور درخت وغیرہ ان کے درمیان تقسیم کر دئے جائیں، اس کے جواب میں حضرت عمرؓ نے سورۃ الحشر اور توبہ کی بعض آیتوں سے استدلال کرتے ہوئے لکھا کہ وہاں کے باشندوں سے جزیہ وصول کر لینے کے بعد مسلمانوں کا کوئی اور حق نہیں رہ جاتا اور نہ کسی تعرض کی گنجایش باقی رہتی، مسلمانوں کو یہ حق کسی طرح نہیں پہونچتا کہ مفتوحہ علاقوں کی زمینوں کو آپس میں تقسیم کر لیں، وہاں کے باشندے بدستور سابق وہاں کی زمین کاشت میں لاتے رہیں کیونکہ وہ اس کام سے زیادہ واقف ہیں اور اس کی زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں جب تک وہ جزیہ ادا کرتے رہیں وہ غلام نہ بنائے جائیں، مسلمانوں کو ان پر ظلم کرنے، ان کو کسی طرح نقصان پہونچانے اور ان کا مال کھانے سے روکو (کتاب الخراج باب ۴ فصل ۱، باب ۱۳ فصل ۶)

حضرت عمر فاروقؓ نے تو غیر مسلموں سے زمینوں کا خریدنا بھی ناجائز قرار دیا تھا، ان پر

مال گذاری عائد کرتے وقت ہدایت کرتے کہ جمع سخت مقرر نہ کی جائے، ان سے پہلے استصواب بھی کر لیتے، عراق کا بندوبست ہونے لگا تو عجمی رئیسوں کو بلا کر ان سے مشورے کیے، مصر کے انتظام میں مقوقس کی رائے طلب کی۔ (مقریزی جلد اول ص ۷۴، الفاروق جلد دوم ص ۱۲۹)

عراق، مصر اور شام کے دفتر مال گذاری کا حساب کتاب وہاں کی زبانوں میں رکھا جاتا، اس لیے حضرت عمرؓ فاروق کے زمانہ میں وہاں کا حساب کتاب کرنے والے مجوسی، عیسائی یا قبطی تھے، ان کے ساتھ حضرت عمرؓ کے حکم کے مطابق عاملوں کا اچھا سلوک رہتا۔ (الفاروق ج ۲ ص ۲۶۲)

حضرت عمرؓ کو اپنے بستر مرگ پر بھی ذمیوں کا خیال رہا، انھوں نے فرمایا میں اپنے بعد آنے والے خلیفہ کو ذمیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی تلقین کرتا ہوں، ان سے جو عہد کیا جائے اس کی پابندی کی جائے، ان کے دشمنوں کے خلاف ان کا دفاع کیا جائے اور ان پر ان کی برداشت سے زیادہ بار نہ ڈالا جائے۔ (کتاب الخراج باب ۱۳ فصل ۲)

یہ بات بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ حضرت عمرؓ اگر محض روادار ہوتے تو وہ نہ کامیاب حکمراں اور نہ کامران فاتح ہوتے، جہاں انھوں نے اپنی رواداری کے اعلیٰ ترین نمونے پیش کیے وہاں ان کے مزاج کی تندی، تیزی اور سختی بھی مشہور رہی، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاطر نیام سے تلوار نکالنے کے لیے برابر تیار رہتے، ایک صحابی ابو حذیفہ اور ایک شخص خویصرہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے گستاخانہ باتیں کیں تو حضرت عمرؓ سے برداشت نہ ہو سکا، تلوار نکال کر ان کا سر قلم کرنے کے لیے تیار ہو گیے مگر آپؐ نے ان کو روکا۔ (ابن سعد قسم اول جزء ۴ تذکرۂ عباس ص ۴، خلفائے راشدین ص ۱۶۲ و ۱۶۴) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواج مطہرات سے آزردہ ہو کر کچھ دنوں علاحدگی اختیار کر لی تھی تو حضرت عمرؓ بے چین ہو کر اپنی بیٹی حضرت حفصہؓ کی گردن مارنے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ (فتح الباری ج ۹ ص ۲۵۱) ان کی سختی کی وجہ سے بقول حضرت علیؓ عرب کا سرکش سے سرکش اونٹ بلبلا اٹھا تھا،

کرسکتا تھا، حضرت عمار بن یاسرؓ اپنے زہد و تقا کے لحاظ سے بڑے رتبے کے صحابی سمجھے جاتے تھے لیکن سیاست اور تدبیر میں ان کا پایہ اونچا نہ تھا، حضرت عمرؓ نے ان کو کوفہ کا حاکم مقرر کیا، لیکن وہ اپنے فرائض منصبی میں ناکام رہے تو بلا تکلف ان کو معزول کردیا کہ وہ اپنے کو اس عہدہ کے لیے موزوں ثابت نہ کرسکے، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کوفہ کے حاکم ہوئے تو اپنے لیے ایک محل بنوایا، حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا تو انھوں نے ان کی ڈیوڑھی میں آگ لگوادی کہ اس سے اہل حاجت کو پہونچنے میں رکاوٹ پیدا ہوگی۔ (ابن اثیر ج ۲ ص ۴۱۸) حضرت عمرؓ نے حضرت خالدؓ کو شام سے معزول کرکے حضرت ابو عبیدہؓ بن الجراح کو وہاں کا حاکم مقرر کیا تو حضرت خالدؓ نے وہاں کے عوام کے سامنے ایک تقریر کی جس میں یہ کہا کہ امیر المومنین نے مجھے شام کا حاکم بنایا جب یہاں کے معاملات سدھر گئے، اس کے محاصل آسانی سے وصول ہونے لگے تو مجھے معزول کردیا اور دوسرے کو مجھ پر ترجیح دی، یہ سن کر ایک سپاہی نے کہا صبر کیجیے، ان باتوں سے فتنہ پیدا ہوسکتا ہے، حضرت خالدؓ نے کہا: جب تک ابن خطاب زندہ ہیں فتنہ کا دور نہیں آسکتا، حضرت عمرؓ کو یہ بات معلوم ہوئی تو انھوں نے فرمایا: میں خالدؓ کو ضرور معزول کروں گا تاکہ یہ واضح ہوجائے کہ اپنے دین کی مدد اللہ خود کرتا ہے نہ کہ خالد۔ (کتاب الخراج باب ۱۳ فصل ۶)

وہ عاملوں کی خطاؤں کی سخت گرفت کرتے، ایک بار عوام سے مخاطب ہوکر فرمایا: اللہ کی قسم میں اپنے عاملوں کو تمہارے یہاں اس لیے نہیں بھیجتا ہوں کہ وہ تمہارے منھ پر تم کو چانٹے ماریں، تمہارا مال چھین لیں، وہ اس لیے بھیجے جاتے ہیں کہ تم کو تمہارا دین اور تمہارے نبیؐ کی سنت سکھائیں، اگر کوئی عامل کسی سے دین اور سنت سے ہٹ کر سلوک کرے تو میں اس سے مظلوم کا بدلہ لے کر رہوں گا، یہ سن کر عمروؓ بن العاص کہہ اٹھے کہ اگر کوئی مسلمان عامل اپنی رعایا کی تادیب کرے تو کیا اس سے بھی قصاص لیا جائے گا، حضرت عمرؓ نے جواب دیا: ہاں! میں اس سے ضرور قصاص لوں گا، میں نے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خود اپنے سے قصاص دلواتے دیکھا ہے۔ (کتاب الخراج باب ۱۲ فصل ۱)

ایک حج کے موقع پر حضرت عمرؓ نے اپنے تمام عاملوں کو طلب کیا، جب ان کے

ساتھ اور لوگ بھی جمع ہو گئے تو ان سے مخاطب ہو کر فرمایا: لوگو! میں نے ان عمال کو تمہاری نگرانی کے لیے بھیجا ہے، ان کو اس لیے نہیں مقرر کیا ہے کہ تمہارے مال، جان، عزت اور آبرو پر دست درازیاں کریں، اگر تم میں سے کسی پر ظلم ہوا ہو تو وہ کھڑا ہو جائے، پورے مجمع میں صرف ایک آدمی کھڑا ہو کر بولا: امیر المومنین! آپ کے ایک عامل نے مجھے سو کوڑے مارے ہیں، حضرت عمرؓ نے اس آدمی کو حکم دیا کہ وہ بھی ان کے سامنے عامل کو سو کوڑے مارے، یہ سن کر حضرت عمرو بن العاصؓ اٹھے اور بولے: امیر المومنین! اگر ایسا کیا گیا تو یہ روایت بن جائے گی، حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ اس شخص کو اس عامل سے قصاص نہ دلواؤں جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خود اپنے سے قصاص لیتے دیکھا، حضرت عمرو بن العاصؓ نے بیچ بچاؤ کر کے مستغیث کو ایک ایک تازیانے کے بجائے دو دو اشرفیاں دے کر راضی کیا۔ (کتاب الخراج باب ۱۲ فصل ۱)

حضرت عمرؓ کو معلوم ہو جاتا کہ کوئی عامل اپنے نمود و ترفع کا اظہار کرتا ہے، بیمار کی عیادت نہیں کرتا ہے، کمزور اس کے دربار میں پہونچ نہیں پاتے ہیں تو اس کو معزول کر دیتے، انھوں نے اپنے عاملوں کو ہدایت دے رکھی تھی کہ وہ ترکی گھوڑے پر نہ سوار ہوں، باریک کپڑے نہ پہنیں، چھنا ہوا آٹا نہ کھائیں، دروازہ پر دربان نہ رکھیں، اہل حاجت کے لیے ہمیشہ دروازہ کھلا رکھیں، اگر کوئی ان ہدایتوں کی خلاف ورزی کرتا تو اس کے خلاف سخت تادیبی کارروائی کرتے، اس کے لیے جو سزا تجویز کرتے تو اس کی تعمیل ضرور ہوتی، ان کی ان سختیوں کی وجہ سے ان کا نظامِ مملکت ایسا اعلیٰ اور عمدہ رہا کہ آج وہ دنیا کے بہترین حکمرانوں میں شمار کیے جاتے ہیں، ان کی کامرانی کا راز یہ تھا کہ ان کا دل خدا کے بارے میں نرم ہوتا تو جھاگ سے بھی زیادہ نرم ہو جاتا اور سخت ہوتا تو پتھر سے بھی زیادہ سخت ہو جاتا۔

ان کو اپنی مملکت میں کسی باغیانہ سازش کی خبر مل جاتی تو اس کو فرو کرنے میں بھی پوری سختی سے کام لیتے، یہ سازش اگر غیر مسلموں کی ہوتی تو ان کو سزا دینے میں تامل تو نہیں کرتے لیکن اس میں بھی ان کی رحم دلی، لینت اور رواداری بروئے کار آ جاتی، شام فتح ہوا تو اس کی آخری سرحد پر ایک شہر عربوس تھا، یہاں کے لوگوں سے معاہدہ ہو گیا مگر وہ چپکے چپکے

ایشیائے کوچک کے رومیوں سے ساز باز کر کے مسلمانوں کے راز ان کو بتاتے تھے، حضرت عمرؓ کو اس کی اطلاع ہوئی تو وہاں کے حاکم عمیرؓ بن سعد کو لکھ بھیجا کہ ان کو ایک برس کی مہلت دو کہ وہ اپنی سازش سے باز آئیں اور اگر باز نہ آئیں تو ان کی جائداد، زمین، مویشی اور اسباب کو شمار کر کے ایک ایک چیز کی دو چند قیمت دے دو اور ان سے کہو کہ کہیں اور چلے جائیں، اس حکم کی تعمیل کی گئی۔ (بلاذری اردو ترجمہ ص ۲۵۵، عربی ص ۱۵۷، الفاروق ج ۲ ص ۴۶-۱۴۵)

نجران کے عیسائیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے معاہدہ کیا تھا، پہلے ذکر آچکا ہے کہ اس کی توثیق حضرت ابوبکرؓ صدیق نے کی لیکن عہد فاروقی میں پتہ چلا کہ وہ باہر کے لوگوں سے ساز باز کر کے اپنے پاس اسلحہ جمع کر رہے ہیں، حضرت عمرؓ کو اندازہ ہو گیا کہ اب وہ مسلمانوں کے لیے خطرہ بن کر نقصان پہونچائیں گے، اس لیے ان کو نجران یمن سے نکل کر نجران عراق میں چلے جانے کا حکم دیا لیکن اس جلاوطنی کے وقت یہ فرمان جاری کیا کہ نجران یمن چھوڑتے وقت وہ اللہ کی امان میں رہیں گے، کوئی مسلمان ان کو نقصان نہ پہونچائے، اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے معاہدہ کر کے ان کو امان دیا تھا اس کی توثیق حضرت ابوبکرؓ نے بھی کی تھی، شام اور عراق کے امیر ان کو کھیتی کرنے میں مدد کریں وہ اللہ کی راہ میں ان کو صدقہ بھی دیں، ان سے کسی طرح کا تاوان نہ لیا جائے، ان پر ظلم کرنے والوں کے خلاف کارروائی کی جائے، ان پر جو جزیہ عائد کیا گیا ہے وہ ان کے پہونچنے کے بعد سے دو سال تک معاف کر دیا جائے، ان پر کوئی زیادتی اور دست درازی نہ کی جائے۔ (کتاب الخراج باب ۹ فصل ۱)

خیبر کے یہودیوں نے ایسی باغیانہ روش اختیار کی کہ نہ صرف مسلمانوں کے معاملات میں خیانت کی اور ان میں تباہی پھیلانی چاہی بلکہ حضرت عمرؓ کے صاحبزادے عبداللہؓ کو بالا خانہ سے نیچے پھینک دیا جس سے ان کے ہاتھ ٹوٹ گئے، حضرت عمرؓ نے ان کو خیبر سے جلاوطن کیا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ان سے یہ معاہدہ ہوا تھا کہ وہ نصف زمین اور نصف پیداوار کے حصہ دار ہوں گے، اس لیے حضرت عمرؓ نے ان کو جلاوطن

کرتے وقت نصف زمین اور نصف پیداوار کے معاوضے میں سونے چاندی اور اونٹوں کے پالان دیے۔ (فتوح البلدان عربی ص ۳۲، ۲۵، اردو جز اول ص ۴۹ - ۳۸)

فدک کے یہودیوں نے بھی سیاسی بغاوت کی تو حضرت عمرؓ نے ان کو بھی جلاوطن کیا مگر انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی زمین اور اپنے نخلستان کے نصف حصہ پر مصالحت کی تھی اس لیے حضرت عمرؓ نے ان کو جلاوطن کرتے وقت نخلستان اور اراضی میں ان کا جتنا حصہ ہوتا تھا اس کی عادلانہ قیمت تجویز کرنے کے لیے چند واقف کاروں کو بھیجا اور انھوں نے جو تجویز کی اس کے مطابق قیمت دے دی گئی۔ (فتوح البلدان جزء اول اردو ص ۴۹، عربی ص ۳۰)

ایک بار قبیلہ بکر بن وائل کے ایک شخص نے حیرہ کے ایک عیسائی کو ہلاک کر دیا، حضرت عمرؓ کو اس کی خبر ہوئی تو حکم دیا کہ قاتل کو مقتول کے وارثوں کے حوالہ کیا جائے، اس حکم کی تعمیل ہوئی، قاتل حنین نامی کو مقتول کے وارثوں نے قتل کر ڈالا۔ (الدرایہ فی تخریج الہدایہ ص ۲۶۰، الفاروق ج ۲ ص ۱۳۸)

ایک بار حضرت عمرؓ بیٹھے حضرت علیؓ سے باتیں کر رہے تھے کہ ایک یہودی آیا اور بولا کہ وہ (حضرت) علیؓ پر دعوی کرنے آیا ہے، امیر المومنین حضرت عمرؓ نے یہ سن کر حضرت علیؓ کو مخاطب کر کے فرمایا: ابوالحسن! سامنے کھڑے ہو کر جواب دو، حضرت علیؓ اٹھے تو ان کے چہرہ پر بل تھا دعوی سنا گیا، مدعی جھوٹا ثابت ہوا وہ چلا گیا تو حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ سے پوچھا: جب ان کو کھڑے ہو کر جواب دینے کو کہا گیا تو وہ چیں بہ جبیں تھے کیا وہ یہودی کے برابر کھڑے ہو کر جواب دینا پسند نہیں کرتے تھے، حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ یہودی کے برابر کھڑے ہونے میں چیں بہ جبیں ہونے کا سوال نہ تھا مگر جب ان کو ابوالحسن کہہ کر کھڑے ہونے کو کہا گیا تو کنیت سے پکارنا نشانِ عزت ہے، خیال ہوا کہ کہیں یہودی یہ نہ سمجھے کہ عدالت کو مدعا علیہ کا خاص لحاظ ہے، اسی لیے مدعی کے مقابلہ میں عزت کے ساتھ مخاطب کیا گیا ہے، اگر وہ ایسا سمجھ لیتا تو ہماری عدالت پر دھبہ لگتا۔ (رحمۃ للعالمین ج ۳ از قاضی محمد سلیمان منصور پوری ص ۴۵۱)

حضرت عمرؓ کا ایک غلام عیسائی تھا، اس کو وہ اسلام قبول کرنے کی ترغیب تو دیتے مگر اس پر کبھی دباؤ نہیں ڈالا، فرماتے کہ مذہب میں زبردستی نہیں، غلام ان کی زندگی میں عیسائی ہی رہا۔ (کنزل العمال بحوالہ طبقات ابن سعد جلد پنجم ص ۴۹، الفاروق ج ۲ ص ۱۴۳)

حضرت عمرؓ نے اپنے عمال اور لشکریوں میں اسلام کی سچی تعلیمات کی ایسی روح پھونک دی تھی کہ ان کے خوف خدا، اتباع سنت، تقوی، زہد، تواضع، خدمت گذاری، خلق، مہمان نوازی، راست بازی، عدل، ترحم، مساوات، مخالفین سے حسن سلوک سے متاثر ہوکر مفتوحہ ممالک کے غیر مسلم خود بخود اسلام قبول کرتے چلے گئے، شام میں اسلامی لشکر پہونچا تو رومیوں کے سفیر جارج نے اسلام قبول کرلیا۔ (طبری ص ۲۰۹۸) مصر کے شہر شطاء کا رئیس دو ہزار آدمیوں کے ساتھ مشرف بہ اسلام ہوا (مقریزی ج ۱ ص ۲۲۶) دمشق میں وہاں کا بشپ حضرت خالد بن ولیدؓ کے سامنے آکر مسلمان ہوا (معجم البلدان ج ۷ ص ۱۷۳) جلولہ کی فتح کے بعد یہاں کے امراء و رؤوسا خود اسلام لے آئے۔ (فتوح البلدان عربی ص ۲۷۴ اردو ج ۱ ص ۴۵۸) قادسیہ کے معرکہ کے بعد ایران کا شاہی رسالہ چار ہزار لشکریوں کے ساتھ مسلمان ہوگیا (فتوح البلدان عربی ص ۲۸۹، اردو ج ۱ ص ۸۴-۴۸۳) یزدگرد کے بعض فوجی افسر مسلمان ہوئے تو سیابچہ، زط اور اندغار جیسی قومیں بھی اسلام لے آئیں (فتوح البلدان ص ۳۸۲، اردو ج ۲ ص ۹۷) مصر کے بعض قصبے کے لوگ بھی مسلمان ہوئے (مقریزی ج ۱ ص ۱۶۲) دمیاط کی فتح کے بعد بقارہ سے لے کر عسقلان تک پوری آبادی مسلمان ہوگئی (مقریزی ج ۱ ص ۱۸۴ نیز دیکھو تاریخ اسلام ج ۱ ص ۲۱۹، از شاہ معین الدین احمد ندوی) اور پھر اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ عراق، شام، مصر اور ایران کے سارے علاقے کی آبادی رفتہ رفتہ اسلام اس طرح قبول کرتی گئی کہ ان میں مسلمانوں کی اکثریت بڑھتی گئی اور وہ اسلامی ممالک کہلانے لگے، یہاں مسلمان اپنے روادارانہ کردار کا اعلیٰ نمونہ پیش نہ کرتے تو ان کا اسلام کی طرف مائل ہونا کیسے ممکن تھا، تھوڑے سے لوگوں پر تو جبر اور دباؤ ڈالا جاسکتا ہے مگر پورے علاقے کو زور اور چیرہ دستی سے کسی مذہب کی طرف مائل کرنا انسانی فطرت کے سراسر خلاف ہے۔

حضرت عثمانؓ ذی النورین کی رواداری: حضرت عمرؓ کے زمانہ میں غیر مسلموں کے ساتھ جتنے معاہدے ہوئے تھے سب حضرت عثمانؓ کے عہد میں برقرار رہے اور جو نئے علاقے فتح ہوتے گئے وہاں بھی وہی روادارانہ اسپرٹ باقی رہی، جس کی تعلیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی، وہ تو اپنے ہر چھوٹے بڑے عمل میں اپنے محبوب آقا کی اتباع کرتے رہے، ان کا عہد بعض اسباب کی بنا پر پرآشوب رہا پھر بھی اسلام کے لشکریوں کی جانبازی سے طرابلس، الجزائر، قبرص، طبرستان، آرمینیہ وغیرہ کے علاقے فتح ہوئے، ان کے زمانہ میں بغاوتیں بھی بہت ہوتی رہیں، ان کی طبیعت میں لینت، نرمی اور مروت بہت تھی مگر ان بغاوتوں کو تشدد اور تلطف کی حکمت عملی سے فرو کرتے رہے، مفتوحہ ممالک کی خوشحالی اور بدحالی سے باخبر رہنے کے لیے جلیل القدر صحابیوں کے وفود وہاں بھیجا کرتے، جمعہ کے دن منبر پر پہونچ کر اطراف ملک کی خبریں پوچھتے اور عام اعلان کر رکھا تا کہ جس کسی کو کسی والی سے شکایت ہو وہ حج کے موقع پر آکر بیان کرے، اس موقع پر تمام عمال کو بھی لازمی طور پر طلب کر لیتے تا کہ شکایتوں کی تحقیقات آسانی سے ہو سکے۔ (طبری ص ۲۹۴۳، مسند ابن حنبل ج ا ص ۳۷)

ان کے زمانہ میں نجران کے عیسائیوں کے ساتھ مسلمانوں نے کچھ زیادتیاں کیں تو انھوں نے حضرت عثمانؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر اس کی شکایت کی، اس وقت وہاں کے حاکم ولید بن عتبہؓ تھے، حضرت عثمانؓ نے ان کو لکھ بھیجا کہ عراق میں نجران کے جو باشندے ہیں ان کے اسقف، عاقب اور سردار نے میرے پاس آکر شکایت کی ہے اور مجھے وہ شرط دکھائی ہے جو عمرؓ نے ان کے ساتھ طے کی تھی، مجھے معلوم ہوا کہ مسلمانوں سے ان لوگوں کو کیا نقصانات پہونچے ہیں، میں نے ان کے جزیہ میں سے تیس جوڑوں کی تخفیف کر دی، انھیں میں نے اللہ جل شانہ کی راہ میں بخش دیا ہے اور میں نے ان کو وہ ساری زمین دے دی جو عمرؓ نے ان کو یمنی زمین کے عوض صدقہ کی تھی، اب تم ان کے ساتھ بھلائی کرو کیونکہ یہ ایسے لوگ ہیں جنھیں ذمہ حاصل ہے، میرے اور ان کے تعلقات بھی اچھے رہے ہیں، عمرؓ نے ان کے لیے جو صحیفہ تحریر کیا تھا اس کو غور سے دیکھ لو اور اس میں جو کچھ درج ہے وہ پورا کرو۔

(کتاب الخراج اردو ترجمہ ص ۲۷۶)

ان کی خواہش رہی کہ ان کے محبوب آقا کی تعلیمات کی تبلیغ زیادہ سے زیادہ ہوتی رہے مگر ان کا خود طریقہ یہ رہا کہ جو قیدی گرفتار ہوکر ان کی خدمت میں پیش کیے جاتے تو ان پر کسی قسم کا دباؤ ڈالنے کے بجائے دین متین کے صرف محاسن بیان کرتے، ایک بار بہت سی رومی لونڈیاں گرفتار ہوکر آئیں، معمول کے مطابق ان کے پاس جا کر اسلام کی خوبیاں ان کو بتائیں، ان میں سے صرف دو لونڈیوں نے متاثر ہوکر اسلام قبول کیا، بقیہ اپنے حال پر قائم رہیں۔ (خلفائے راشدین از حاجی معین الدین ندوی ص ۲۴۶ بحوالہ ادب المفرد باب خفض المرأۃ)

حضرت علیؓ کی مذہبی رواداری: حضرت علی مرتضٰی رضی اللہ عنہ کا عہد خلافت بھی زیادہ تر پرآشوب اور پرشور رہا، ان کی خلافت کی مدت پانچ سال رہی، حضرت عثمانؓ کی شہادت کے قصاص کے جھگڑے، خارجیوں اور سبائیوں کی فتنہ انگیزیوں کے خلاف جنگ، امیر معاویہؓ سے اختلاف، اور لیلۃ الحریر کی لڑائیوں، عجم، کرمان اور فارس میں بغاوتوں کی بدولت ان کو وہ سکون حاصل نہ ہوسکا جو حکمرانی کے لیے ضروری ہے مگر انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سایہ میں تربیت پائی تھی اس لیے زہد، تقویٰ، عبادت، تواضع، انفاق فی سبیل اللہ اور حسن سلوک میں جو اعلیٰ نمونے پیش کیے جاسکتے ہیں وہ ان کی زندگی میں ملتے ہیں، شجاعت میں کوئی معاصران کا حریف نہ تھا مگر وہ برابر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث پر عمل فرماتے رہے کہ بہادر وہ نہیں ہے جو دشمن کو پچھاڑ دے بلکہ وہ ہے جو اپنے نفس کو زیر کرے، ان کی زندگی کا یہ واقعہ بہت مشہور ہے کہ ایک لڑائی میں ایک یہودی کو پچھاڑ کر اس کے سینے پر سوار ہوگئے اور اس کو ہلاک کرنا چاہتے تھے کہ اس نے ان کے منھ پر تھوک دیا تو یکایک اس کے سینے پر سے اتر کر علاحدہ ہوگئے، یہودی نے متعجب ہوکر اس طرح علاحدہ ہونے کی وجہ پوچھی تو بتایا کہ پہلے تم کو اللہ کی خاطر ہلاک کرنا چاہتا تھا، تم نے میرے منھ پر تھوکا تو اب میں تم کو ہلاک کرتا تو اپنے نفس کی خاطر کرتا جو صحیح نہیں ہوتا، یہ سن کر یہودی مسلمان ہوگیا۔

وہ اپنے حسن سلوک کی وجہ سے بے حد مقبول رہے، ان کے اسی وصف پر بھروسہ

کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے اشاعت اسلام کا کام برابر لیتے رہے، فتح مکہ کے بعد حضرت خالدؓ ابن ولید بنو خذیمہ میں تبلیغ اسلام کے لیے مامور ہوئے، اس قبیلہ نے پہلے تو اسلام قبول کر لیا پھر منحرف ہو گیا، حضرت خالدؓ نے ان میں سے کچھ لوگوں کو قید اور کچھ کو قتل کر دیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معلوم ہوا تو آپؐ کو دکھ ہوا، آپؐ کو حضرت علیؓ کے حسن معاملہ کی کارکردگی پر پورا اعتماد تھا، اس لیے آپؐ نے اس غلطی کی تلافی کے لیے ان کو بنی خذیمہ کے پاس بھیجا، حضرت علیؓ نے رواداری سے کام لیا، قیدیوں کو رہا کر دیا اور مقتولین کے وارثوں کو خونبہا دیا (فتح الباری ج ۸ ص ۴۶) اسی طرح حضرت خالدؓ یمن تبلیغ کے لیے بھیجے گئے تو وہ وہاں بھی ناکام رہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر وہاں کے لیے حضرت علیؓ کا انتخاب کیا، حضرت علیؓ نے پہلے تو اس کام کو دشوار سمجھا مگر آپؐ نے ان کے سینہ پر دست مبارک رکھ کر دعا فرمائی کہ "اے خدا! اس کی زبان کو راست گو بنا اور اس کے دل کو ہدایت کے نور سے منور کر دے۔" اس کے بعد ان کے سر پر عمامہ باندھا اور سیاہ علم دے کر یمن کی طرف روانہ کیا، حضرت علیؓ نے اپنے حسن تدبیر اور حسن سلوک سے وہاں کا رنگ کچھ ایسا بدل دیا کہ ہمدان کا پورا قبیلہ مسلمان ہو گیا۔ (فتح الباری ج ۸ ص ۵۲، خلفائے راشدین ص ۲۸۳-۲۸۲)

خارجی حضرت علیؓ کے خلاف برابر سازش کرتے رہے، وہ مجوسیوں، مرتدوں، نومسلموں اور ذمیوں کو بغاوت پر آمادہ کرتے رہتے مگر حضرت علیؓ نے ان بغاوتوں کو بڑے صبر و تحمل سے فرو کیا اور جب وہ زیر ہو گئے تو ان سے لطف و ترحم کا برتاؤ کیا، ایرانی باغی ان کے فیاضانہ سلوک سے یہ کہہ اٹھے تھے کہ امیر المومنین علیؓ بن ابی طالب کے طریق جہاں بانی نے تو نوشیروانی طرز حکومت کی یاد بھلا دی۔

وہ مسلمانوں کی مذہبی بے اعتدالیوں کو گوارا نہیں فرماتے، سبائی ان کو اللہ کہنے لگے تو فرمایا کہ ان کو سزا دینا بھی مذہب کی بڑی خدمت ہے، اللہ کی وحدانیت کے غلبہ میں کچھ زندیقوں کو انھوں نے زندہ جلا دینے کی سزا دی مگر جب حضرت ابن عباسؓ نے ان کو بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سزا کی ممانعت فرمائی ہے تو اس سے ندامت کا اظہار فرمایا (کتاب الخراج ص ۹۹) مگر ذمیوں کے ساتھ ہمیشہ شفقت و محبت کا برتاؤ رکھا، حضرت عمرؓ

نے ان سے جتنے معاہدے کیے تھے ان کو برقرار رکھا، حضرت عمرؓ نے حجاز کے عیسائیوں کو نجران یمن سے، جلاوطن کر کے نجران عراق میں آباد کرادیا تھا کیونکہ انھوں نے مسلمانوں کے خلاف گھوڑے، اور اسلحہ جمع کرنے شروع کردئے تھے، حضرت علیؓ کے زمانہ میں وہ واپس آنا چاہتے تھے اور جب حضرت علیؓ سے اس کے لیے درخواست کی تو انھوں نے منظور کرنے سے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ عمرؓ کے فیصلے بہت موزوں ہوتے تھے پھر بھی ان کے لیے یہ تحریر لکھ دی کہ تم لوگ میرے پاس اللہ کے نبیؐ کی ایک تحریر لے کر آئے ہو جس میں تمہارے لیے تمہاری جان، تمہارے مال کے سلسلے میں شرط لکھی ہے، تمہارے لیے محمد صلی اللہ علیہ وسلم، ابوبکرؓ اور عمرؓ نے، جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ میں نے پورا کردیا، لہٰذا اب جو مسلمان ان کے یہاں جائے اسے ان وعدوں کو پورا کرنا چاہیے جو ان کے ساتھ کیے گئے ہیں نہ ان کو دبایا جائے، نہ ان کے ساتھ ظلم کیا جائے، نہ ان کے حقوق میں سے کسی قسم کی کمی کی جائے۔ (کتاب الخراج ص ۷۸-۷۷ اردو ترجمہ)

حضرت علیؓ ذمیوں کے حقوق کی پامالی کسی حال میں گوارا نہیں کرتے، ان کے ایک عامل عمرو بن مسلمہؓ کی درشتی اور سخت مزاجی کی شکایت ذمیوں نے کی تو انھوں نے ان کو لکھ بھیجا کہ "مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہارے علاقہ کے ذمی دہقانوں کو تمہاری درشت مزاجی کی شکایت ہے اس میں کوئی بھلائی نہیں ہے، تم کو نرمی اور سختی دونوں سے کام لینا چاہیے، لیکن سختی ظلم کی حد تک نہ پہونچ جائے اور نرمی نقصان کی حد تک نہ ہو، ان پر جو مطالبہ واجب ہے اس کو وصول کیا کرو لیکن ان کے خون سے اپنا دامن محفوظ رکھو۔" اسی طرح ذمیوں کی آبپاشی کی ایک نہر پٹ گئی تھی تو وہاں کے عامل قرظ بن کعبؓ کو حضرت علیؓ نے لکھ بھیجا کہ اس نہر کو آباد کرنا مسلمانوں کا فرض ہے، میری عمر کی قسم مجھے اس کا آباد رہنا زیادہ پسند ہے بہ نسبت اس کے کہ وہاں کے لوگ ملک سے نکل جائیں یا عاجز و درماندہ رہ کر ملک کی بھلائی میں حصہ لینے کے قابل نہ رہیں۔ (یعقوبی ج ۲ ص ۲۴۰-۲۳۹، تاریخ اسلام از شاہ معین الدین احمد ندوی ج ۱ ص ۳۶۸)

ایک مرتبہ حضرت علیؓ کی زرہ کہیں گر پڑی، اس کو ایک نصرانی نے اٹھالیا، انھوں

نے اس کو دیکھ کر پہچان لیا، نصرانی نے زرہ دینے سے انکار کر دیا، حضرت علیؓ نے خلیفہ وقت ہونے کے باوجود قاضی شریح کی عدالت میں دعویٰ کیا، قاضی نے ان سے پوچھا کہ آپ کے پاس آپ کی اس زرہ ہونے کا ثبوت ہے؟ وہ کوئی ثبوت پیش نہ کر سکے تو قاضی شریح نے نصرانی کے حق میں فیصلہ کر دیا، جس سے وہ متاثر ہو کر بولا یہ تو انبیاء کے جیسا انصاف ہے، امیر المومنین مجھ کو اپنی عدالت کے قاضی کے سامنے پیش کرتے ہیں اور قاضی ان کے خلاف فیصلہ دیتا ہے، اس کے بعد وہ مسلمان ہو گیا۔ (ابن اثیر ج۳ ص۱۶۰، تاریخ اسلام ج۱ ص۳۶۹)

حضرت علیؓ جب کوئی فوجی دستہ کہیں روانہ کرتے تو اس کو مخاطب کر کے فرماتے:

> ''میں تم کو اس اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہوں جس سے تمہیں لامحالہ ملنا ہے، اس کے علاوہ تمہاری منزل کوئی اور نہیں ہو سکتی کہ وہی دنیا اور آخرت کا مالک ہے، دیکھو! جس مہم پر تم روانہ کیے جا رہے ہو اس کا پورا اہتمام کرنا اور ایسے کام کرنا جو تمہیں اللہ عزوجل سے قریب کریں، کیونکہ دنیا کی وہی چیز کام آئے گی جو اللہ کے پاس پہونچ گئی۔ (کتاب الخراج فصل ۱۲ اردو ترجمہ ص ۱۳۶)

حضرت علیؓ کے فیضانہ سلوک کی اعلیٰ ترین مثال وہ ہے جب ان کا قاتل ابن ملجم ان کے بستر مرگ کے پاس لایا گیا تو اس کو دیکھ کر فرمایا: اس کو اچھا کھانا کھلاؤ، اس کو نرم بستر پر سلاؤ، اگر میں زندہ بچ گیا تو اس کو معاف کرنے یا قصاص لینے کا اختیار مجھے حاصل ہوگا اور اگر میں مر گیا تو خدا کے سامنے اس سے جھگڑ لوں گا، پھر یہ بھی وصیت کی کہ اس سے قصاص معمولی طور پر لیا جائے یعنی اس کے ہاتھ پاؤں وغیرہ نہ کاٹے جائیں۔ (طبقات تذکرۂ علی بن ابی طالب، تاریخ اسلام ج۱ ص۳۶۲)

اصلی اسلامی تعلیمات: اسلام کی تعلیمات وہی ہیں جو قرآن مجید اور حدیث شریف میں ہیں یا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ یا خلفائے راشدین کے حالات کے سلسلہ میں پائی جاتی ہیں، ان کے خلاف اگر کسی مسلمان فاتح یا حکمراں نے کچھ کیا تو وہ اس کا ذاتی

فعل تھا جو سراسر اسلامی تعلیمات کے خلاف تھا۔

عیسائیوں کی عدم رواداری: اب تک تو اسلام میں مذہبی رواداری کی جو تعلیمات دی گئی ہیں اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین نے ان پر عمل کر کے جو اسوۂ حسنہ پیش کیا ان کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں اب اس کتاب میں توجہ اس طرف بھی دلانی ہے کہ عیسائیت اور عیسائی حکمرانوں نے خود عیسائیوں اور ان کے مختلف فرقوں اور پھر مسلمانوں پر کتنے مظالم ڈھائے ہیں، ان کی تفصیل بیان کی جائے تو کئی ضخیم جلدیں تیار ہو جائیں گی لیکن یہاں پر ہم ان کی کچھ جھلکیاں ضرور دکھائیں گے تاکہ یہ موازنہ ہو سکے کہ کس کی رواداری انسانیت کے لیے پیام رحمت بنی اور کس کی عدم رواداری سے انسانیت کی تذلیل ہوئی؟

رومۃ الکبری کی عدم رواداری: رومن امپائر پر عیسائیوں کو بجا طور پر فخر ہو سکتا ہے لیکن جہاں ان کے حکمرانوں کے بعض بڑے روشن کارنامے ہیں وہاں ان کی سیہ کاریاں بھی ایسی ہیں جن سے خود عیسائیوں کی گردنیں شرم سے جھکتی رہیں گی، اس کی تاریخ خوں ریزی، سفا کی، قتل اور غارت گری سے بھری پڑی ہے۔

اس امپائر کا سرکاری مذہب عیسائیت ہو گیا تو اس کے حکمرانوں نے اس کی سچی تعلیم پر عمل کرنے کے بجائے اس کو اپنے ذاتی اقتدار کا ذریعہ بنالیا، انھوں نے مذہب کو اپنے لیے استعمال کرنے کی کوشش کی تو کلیسا بھی مذہبی شہنشاہیت کا خواب دیکھنے لگا، دونوں نے مذہب کو اپنے لیے آلۂ کار بنانا چاہا، نتیجہ یہ ہوا کہ ایک صدی کے اندر اس میں بیسیوں فرقے پیدا ہو گئے، باہمی فتنہ، فساد اور نفاق کا بازار گرم ہوا تو یہی رومن امپائر کبھی گریک امپائر، کبھی لیٹن امپائر اور کبھی بازنطینی امپائر میں تقسیم اور علاحدہ ہوتا رہا، اس کے ساتھ بعض حکمراں اپنی رندی، سرمستی اور بوالہوسی میں مذہب سے دور ہو گئے بلکہ مذہب کو ذلیل کرتے رہے، بعض حکمراں تو مذہب کو بالائے طاق رکھ کر خواجہ سراؤں اور داشتاؤں کے ہاتھوں گروی ہوتے رہے، وہ بعض اوقات خواجہ سراؤں کی طرف ایسے مائل ہو جاتے کہ وہی حکومت کے مالک بن جاتے، شروع کے حکمرانوں میں کراٹی سانی ایس اور امان ٹی ایس اور سولومن جیسے خواجہ سراؤں کے کرتوت اور غیر رواداری سے حکومت کو بڑا نقصان پہونچا۔

(ہسٹورین ہسٹری آف دی ورلڈ ج ۷ ص ۵۸، ۶۴، ۹۸) ان بادشاہوں کے یہاں ایکٹرسوں اور داشتاؤں کی بھی حکومت رہی اور ان کی وجہ سے جو بدعنوانیاں اور عدم رواداریاں ہوئیں ان کی پرواہ شہنشاہوں کو نہیں ہوئی، جسٹی نی ان (۵۲۵ء-۵۴۸ء) نے ایک طوائف تھیوڈرا کو اپنی محبوبہ بنا کر اس سے شادی کر لی تو وہ اپنی ہر قسم کی عیاشی اور بدمستی کے باوجود حکومت پر چھا گئی، وہ ایسی غیر روادار تھی کہ اس کے جاسوس جس کے متعلق بھی اس کی مخالفت کی خبر دیتے تو وہ ان کو تہ خانہ میں بند کرا دیتی، ان کے جسم کے کسی عضو کو کٹوا دیتی، ان کو ایسی سزا دیتی کہ اپنی بقیہ زندگی میں ہوش وحواس سے محروم رہتے، ان کی کھال جسم سے اتر والیتی، سینٹ کا کوئی رکن یا کوئی پادری اس کا مخالف ہو جاتا تو اس کو وہ پکڑ وا منگواتی اور یہ کہہ کر کسی کے حوالہ کر دیتی کہ اس کی سزا اس کے حکم کے مطابق نہیں کی گئی تو خود اس کی کھال جسم سے اتار لی جائے گی۔ (ایضاً ص ۶۸)

تیسری صدی سے لے کر ساتویں صدی عیسوی تک اس رومن امپائر میں کلیسا اور ایوان حکومت میں جو کچھ ہوتا رہا اس کی تصویر سیل صاحب نے اپنے ترجمۂ قرآن کے دیباچہ میں اس طرح پیش کی ہے۔

> ”گرجا کے پادریوں نے مذہب کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے تھے اور امن، محبت اور نیکی کو مفقود کر دیا تھا، اصل مذہب کو بھول گئے تھے اور اس کے متعلق اپنی خیال آرائیوں پر جھگڑتے تھے، اسی تاریک زمانہ میں اکثر وہ توہمات جو رومن چرچ کے لیے باعث ننگ ہیں، مذہبی صورت میں قائم کیے گئے خصوصاً ولیوں اور مجسموں کی پرستش نہایت بے شرمی سے ہونے لگی، بنس کی کاونسل کے بعد مشرقی چرچ روزانہ کے مناظرات میں مشغول ہو گیا اور اریئنس، سلینس، نسطورینس اور یوٹیکنیس کے جھگڑوں میں ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا انصاف علانیہ فروخت کیا جاتا تھا اور ہر طرح کی بدعنوانیاں ہوتی تھیں، مغربی چرچ میں ڈیسس اور ارسی فس نے بشپ کی جگہ حاصل کرنے کے لیے قتل تک نوبت پہونچا دی اور آخر ڈیسس کی فتح

ہوئی، اس موقع پر کہا جاتا تھا کہ سی نینس کے گرجا میں ایک روز میں ۱۳۷ آدمی قتل کیے ہوئے پائے گئے اور کوئی حیرت نہیں کہ یہ لوگ ان جگہوں کے اس قدر خواہاں ہوتے تھے، اس لیے اس ذریعہ سے ان کو گراں بہا تحفے ملتے تھے، اپنی گاڑیوں پر نہایت تزک و احتشام سے نکلتے تھے اور ان کے دستر خوان پر بادشاہوں سے زیادہ شان و شوکت ہوتی تھی، ان مناقشات کا سبب زیادہ تر شہنشاہ ہوا کرتے تھے، جسٹینین کے وقت میں حالت اور زیادہ خراب ہوگئی، اس کے نزدیک اپنے عقیدہ کے مخالفوں کو مار ڈالنا کوئی جرم ہی نہ تھا، بادشاہوں اور پادریوں میں عقائد اور اخلاق کی جو خرابیاں پھیلی ہوئی تھیں اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ عوام کی حالت بھی تبدیل ہوگئی، ان کا مقصد صرف روپیہ پیدا کرنا رہ گیا، خواہ کسی ذریعہ سے ہو اور اس روپیہ کو نفاست اور عیاشی میں اڑاتے تھے۔ (بحوالہ سیرۃ النبیؐ ج ۴ ص ۲۶-۲۲۵)

پھر ان رومی شہنشاہوں نے ظالم بن کر کس کس طرح مظالم ڈھائے اس کی بھی کچھ جھلکیاں دیکھیں۔

شہنشاہ فوکس (۶۰۲ء - ۶۱۰ء) کسی سے خفا ہوتا تو اس کی آنکھیں نکلوا لیتا، اس کی زبان گدی سے کھنچوا لیتا، ہاتھ پاؤں کٹوا دیتا، اتنے درے لگواتا کہ وہ ہلاک ہو جاتا، کبھی اس کو آگ کے شعلوں پر پھنکوا دیتا، کبھی تیروں سے اس کا بدن چھلنی کرا دیتا، اس نے اپنے پہلے شہنشاہ کی ملکہ، لڑکیوں اور اس کی ماں سے کسی بات کا اعتراف کرانا چاہا تو ان کو ایسی وحشیانہ سزائیں دی کہ تمام لوگ چیخ اٹھے، آخر میں اس کے خلاف بغاوت ہوئی، اس کو ہر طرح ذلیل و رسوا کیا گیا اور اس کا سر قلم کر کے اس کے جسم کو آگ کے شعلوں میں جھونک دیا گیا۔ (ہسٹورین ہسٹری آف دی ورلڈ ج ۷ ص ۱۵۴-۱۵۵)

کانسٹنٹائن پنجم (۷۴۱ء - ۷۷۵ء) کے سامنے انسانوں کی ناکیں کاٹ کر ایک طشت پر پیش کی جاتیں تو وہ خوش ہوتا، وہ غیر عیسائیوں پر مظالم ڈھانے کے لیے مشہور تھا، اس کا خیال تھا کہ روٹی اور شراب ہی کی پوجا صحیح ہے، اسی لیے یسوع مسیح دار پر چڑھے، وہ کسی

سے ناخوش ہوتا تو اس کے ہاتھ پاؤں اس طرح کٹواتا جیسے کسی مردہ کا کاٹا جاتا ہو۔ (ایضاً ص ۲۱۵-۲۱۰)

شہنشاہ لیو چہارم (۷۷۵ء - ۷۸۰ء) کی ملکہ اپنی سنگدلی کے لیے مشہور تھی، اس کی وجہ سے دربار سازشوں کا مرکز بن گیا تھا جس کے بعد لوئی معزول ہوا اور اس کو قید و بندگی زندگی گذارنی پڑی اور اس کے لڑکے کو اندھا کر دیا گیا اور اس کی ملکہ ایرین کے پاؤں میں زنجیر ڈال کر اس کو جیل بھجوا دیا گیا۔ (ایضاً ص ۲۱۰)

یہی حکمراں کلیسا سے بھی برسر پیکار رہے، شہنشاہ جسٹن (المتوفی ۵۲۵ء) چونتیس برس تک پادریوں سے لڑتا رہا (ایضاً ص ۶۴) کانسٹنٹائن دوم (۶۴۱ء-۶۶۸ء) نے اپنی بالا دستی گرجا پر چاہی تو کلیسا کے پادری اور پوپ اس کے مخالف ہو گئے لیکن شہنشاہ نے ان پر بغاوت کا الزام رکھ کر ان میں سے کچھ کو تو جلاوطن کر دیا اور کچھ کو سخت سزائیں دیں، اس زمانہ کے پوپ کی وفات اسی جلاوطنی کی عالم میں ہوئی۔ (ایضاً ص ۱۸۴)

لیوایسوری کس (۷۱۷ء-۷۴۱ء) تو کلیسا کا اتنا مخالف ہو گیا تھا کہ عیسائیت اس کے زمانہ میں کفر کی حد تک پہونچ گئی تھی۔ (ہسٹورین ہسٹری آف دی ورلڈ ج ۷ ص ۲۰۷)

شہنشاہ میکائیل دوم (۸۵۷ء-۸۴۲ء) کے نام کا جز شرابی تھا، پادریوں کو مسخرے اور بھانڈ سے زیادہ حیثیت دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ (ایضاً ص ۲۲۴)

ان ہی حکمرانوں نے اپنی بوالہوسی میں داشتاؤں کے رکھنے کا عام رواج قائم کر رکھا تھا، وہ تو شادی شدہ بیویوں سے بھی زیادہ ظالم بن جاتیں، لیو ششم (۹۱۱ء-۸۸۶ء) نے ایک خوبصورت عورت زوکو رکھ لیا تھا، اس سے ایک لڑکا پیدا ہوا تو اس کی خواہش ہوئی کہ وہ تخت کا جائز وارث قرار دیا جائے، اس وقت کے بشپ نے شہنشاہ کے حکم کی تعمیل نہیں کی تو وہ جلاوطن کر دیا گیا۔

شہنشاہ ایک کے بعد دوسری شادی کر لیتے اور اپنی کثرت ازواج کے سلسلہ میں پادریوں کے روک ٹوک کی پرواہ نہیں کرتے۔ (ایضاً ص ۲۲۸)

اقتدار کی خاطر بعض بیوہ ملکائیں اپنے شوہروں کو کم سن جانشینوں سے شادی کر لینے

پسند کر لیتیں۔ (ایضاً ص ۱۴۶)

ساتویں صدی عیسوی میں عیسائیوں کے مظالم: ساتویں صدی عیسوی میں مغربی یورپ کے سیاسی حکمرانوں اور مذہبی پیشواؤں کا ذکر کرتے ہوئے لیکی اپنے ہسٹری آف یورپین مارلس میں لکھتا ہے کہ اس زمانہ میں ان ہی پادریوں کو عہدے دئے جاتے جو حرص وہوا اور عیش پرستی میں خاص شہرت رکھتے، ان کا اپنے دشمنوں کو اپنے ہاتھوں سے ہلاک کر دینا معمولی سی بات ہوگئی تھی، ہر جگہ ظلم و شقاوت اور بدچلنی کے مناظر دیکھنے میں آتے تھے، مخالفوں کے ہاتھ، پاؤں یا ناک کاٹ ڈالنا ایک عام بات تھی، ہر بادشاہ کے لیے اپنے اعزہ کو قتل کرنا تو گویا لازمی تھا، ایک بادشاہ نے اپنے باغی بیٹے، بہو اور پوتیوں کو زندہ جلوادیا، ایک شہزادہ کی یہ تفریح تھی کہ وہ اپنے غلاموں کو آگ میں جلواتا تھا، اپنے دو غلاموں کو اس جرم میں زندہ دفن کرادیا کہ انھوں نے اس کی اجازت کے بغیر شادی کر لی تھی۔

ملکہ برونہاٹ جب قلوپطرہ کے ہاتھوں گرفتار ہوگئی تو اس کو طرح طرح کی اذیتیں دے کر ایک شریر گھوڑے کی دم میں باندھ کر اسے تیز دوڑایا گیا، جس سے اس کی لاش کے پراخچے اڑ گئے۔ (تاریخ اخلاق یورپ اردو ترجمہ ص ۱۵۱-۱۵۰)

اوپر رومی شہنشاہوں کے سیرت وکردار کا بہت ہی سرسری جائزہ لیا گیا ہے لیکن ان کی جو سیہ کاریاں، بدعنوانیاں اور کمزوریاں رہیں وہ بھی آگے چل کر شاہانہ سطوت وعظمت کی روایتیں بن گئیں اور دوسرے ممالک اور مذاہب کے فرماں رواؤں کو ان کی تقلید اور ریس کرنے کا جواز مل گیا، اوپر کی تھوڑی سے تفصیل سے معلوم ہوا ہوگا کہ خواجہ سراؤں کی پرورش کرنا، داشتاؤں اور طوائفوں کو حرم میں ڈال لینا اوران کا دربار کی سازش میں ملوث ہو جانا، جائز اور ناجائز اولاد کی جانشینی کے لیے جنگ کرنا، مخالفوں سے بڑی سنگدلی سے پیش آنا، ان کے ناک کان اور زبان کٹوادینا، ان کو اندھا کر دینا، مذہبی طبقہ اور کلیسا سے محاذ آرائی کر کے ان کو ہر طرح ذلیل کرنا حکمرانی کے لوازم سمجھے جانے لگے، یہ لعنتیں اور معصیتیں ایسی پھیلیں کہ یہ ساری چیزیں عام لوگوں کی نظروں میں قابل نفرت نہیں رہ گئیں اور حکمرانی کے تقاضے تصور کی جانے لگیں اور یہی چیزیں عیسائی حکمرانوں نے دنیا کو دیں۔

اسلام کا عروج: جب انسانیت اس طرح گر رہی تھی اور اس کا استحصال بری طرح ہو رہا تھا تو اسلام انسانی محبت، انسانی ہمدردی، انسانی اخوت اور انسانی مروت کا پیام لے کر آیا، جس سے دنیا میں ایک نیا پن پیدا ہوا، جس کی طرف خداوند تعالیٰ کی مخلوق مائل ہوتی نظر آئی، اس کی اخلاقی تعلیم کے فضائل اور رذائل کا مقابلہ دوسرے مذاہب سے کیا گیا تو اس کے ذریعہ انسانیت سنورتی نظر آئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا جو روادارانہ پیام دنیا کو دیا اس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفائے راشدین نے عیسائیوں کے ساتھ جو حسن سلوک کیا اس کا بھی ذکر پہلے آچکا ہے، یہاں پر ذرا اس کا بھی مختصر بیان آجائے کہ مسلمانوں اور رومیوں کا تصادم کب کب ہوا، ان رومیوں نے تقریباً سات سو برس تک مسلمانوں سے ٹکر لی اور اپنی عدم رواداری میں ان کی بیخ کنی کی کوشش ہر جگہ کی، اس سے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ اس طویل مدت میں کون زیادہ روادار اور کون زیادہ ظالم رہا۔

خلافت راشدہ اور رومی: رومی فرماں رواؤں کو اپنی قوت پر بڑا غرور رہا لیکن اسلام ان کے مقابلہ میں اپنی قوت نافذہ سے برابر بڑھتا گیا، رومی مسلمانوں کو اپنے لیے بہت بڑا خطرہ سمجھتے رہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں رومیوں کی مرکزی حکومت تو قسطنطنیہ میں تھی مگر عرب کے پڑوس میں ہرقل رومیوں کا ماتحت بن کر حکومت کرتا تھا، وہ عیسائی تھا، عیسائیوں کی نظر ہمیشہ مکہ پر تھی، رومیوں ہی کے اشارہ سے اسلام سے پہلے حبشہ کے عیسائیوں نے عربوں کی مرکزیت کو توڑنے کے لیے کعبۂ یمانی بنایا تھا، اسلام کا عروج ہوا تو شام کے عیسائی مسلمانوں کے سخت دشمن ہو گئے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیصر روم کے پاس جب اسلام کا پیام لے کر حضرت دحیہ کلبیؓ کو بھیجا تھا تو عیسائیوں نے ان کی ساری چیزیں لوٹ لیں۔ (تاریخ اسلام ج ۲ مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی ص ۱۴۰۹) اسی طرح جب حضرت حارث بن عمرؓ کو بصری کے حاکم کے پاس بھیجا تو ان عیسائیوں نے ان کو قتل کر دیا تھا، اسی کا انتقام غزوۂ موتہ میں لیا گیا تھا (سیرۃ النبیؐ ج ۱ ص ۵۰۵) ۹ھ میں تو رومی

مدینہ منورہ پر حملہ آور ہونا چاہتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدافعت کے لیے تیاری بھی کر چکے تھے مگر اس حملہ کی نوبت نہیں آئی۔ (سیرۃ النبیؐ ج ۱ ص ۵۶۴)

حضرت ابوبکر صدیقؓ کو تو ان عیسائیوں سے حمص، دمشق اور فلسطین میں نمٹنا پڑا، ان لڑائیوں میں حضرت یزید بن سفیانؓ، حضرت شرحبیل بن حسنہؓ، حضرت عمروؓ بن العاص، حضرت خالدؓ بن ولید اور حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراح نے اپنی سپہ گری کا پورا جوہر دکھایا، ہرقل کی بہت بڑی فوج ان کے مقابلہ میں تھی چھوٹی بڑی لڑائیاں ہوتی رہیں، بصری میں مسلمانوں کو فتح ہوئی تو رومیوں اور مسلمانوں کی ایک بڑی لڑائی اجنادین میں بھی ہوئی، رومی ہارے اور جب مسلمان دمشق کے محاصرے میں مشغول تھے تو حضرت ابوبکرؓ کی وفات ہوگئی۔ (تفصیلات کے لیے دیکھیے: تاریخ اسلام از جناب شاہ معین الدین احمد ندوی ج ۲ ص ۱۴۰-۱۴۶)

حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ میں بھی رومیوں سے برابر ٹکر رہی اور جب حضرت عمر فاروقؓ اعظم کے جانباز سپہ سالاروں نے دمشق، فحل، اردن اور حمص پر قبضہ کر لیا تو ہرقل بہت سراسیمہ ہوا، اس نے اپنے فوجی امراء کو بلا کر پوچھا کہ کیا وجہ ہے کہ عرب تعداد و اسلحہ اور سروسامان میں ہم سے بہت کم ہیں پھر بھی وہ کامیاب ہوتے ہیں اس کی وجہ کیا ہے، اس کا جواب ایک تجربہ کار شخص نے دیا کہ عرب کے اخلاق ہمارے اخلاق سے اچھے ہیں، وہ رات کو عبادت کرتے ہیں، دن کو روزہ رکھتے ہیں، کسی پر ظلم نہیں کرتے، آپس میں برابری کے ساتھ رہتے ہیں، ان کے مقابلہ میں ہمارا حال یہ ہے کہ ہم شراب پیتے ہیں، بدکاریاں کرتے ہیں، وعدہ کی پابندی نہیں کرتے، دوسروں پر ظلم کرتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے ہر کام میں جوش اور استقلال ہوتا ہے اور ہمارے کام ان سے خالی ہوتے ہیں۔ (تاریخ اسلام از جناب شاہ معین الدین احمد ندوی ج ۱ ص ۱۷۲)

ان فتوحات سے قیصر روم کو بڑا اشتعال آیا، اس نے مسلمانوں کے استیصال کے لیے اپنی پوری مملکت میں فوج جمع کرنے کے لیے ایک فرمان بھیجا، جس نے آگ لگا دی اور عیسائی ٹڈیوں کی طرح ہر طرف چھا گئے، یرموک کے میدان میں ایک زبردست جنگ ہوئی،

لیکن مسلمانوں کو اس میں بھی فتح ہوئی، یرموک کے بعد رومیوں اور عیسائیوں سے بیت المقدس میں مڈبھیڑ ہوئی اور مسلمانوں کو فتح ہوئی۔ (تاریخ اسلام از شاہ معین الدین احمد ندوی ج ۲ ص ۱۸۷-۱۸۵)

ان معرکہ آرائیوں میں مسلمانوں کے سپہ سالاروں اور فوجی سرداروں نے رومیوں کے مقابلہ میں جو کردار دکھایا اس پر بھی نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔

فحل کی لڑائی میں رومی صلح کے خواہاں ہوئے تو عربوں کے سپہ سالار حضرت ابوعبیدہؓ کے پاس پیغام بھیجا کہ کوئی شخص سفیر بن کر آئے اس کے بعد کا حال مولانا شبلی کی تحریر کے ذریعہ سے سنیئے:

"ابوعبیدہؓ نے معاذؓ بن جبل کو بھیجا، معاذؓ رومیوں کے لشکر میں پہونچے تو دیکھا کہ خیمے میں دیبائے زریں کا فرش بچھا ہوا ہے، وہیں ٹھہر گئے، ایک عیسائی نے آکر کہا کہ گھوڑا میں تھام لیتا ہوں آپ دربار میں جا کر بیٹھیے، معاذؓ کی بزرگی اور تقدس کا عام چرچا تھا اور عیسائی تک اس سے واقف تھے، اس لیے وہ واقعی ان کی عزت کرنا چاہتے تھے، ان کا باہر کھڑا رہنا ان کو گراں گذرتا تھا، معاذؓ نے کہا میں اس فرش پر جو غریبوں کا حق چھین کر تیار ہوا ہے بیٹھنا نہیں چاہتا، یہ کہہ کر زمین پر بیٹھ گئے عیسائیوں نے افسوس کیا اور کہا کہ ہم آپ کی عزت کرنا چاہتے تھے لیکن آپ کو اپنی عزت کا خیال نہیں تو مجبوری ہے، معاذؓ کو غصہ آیا گھٹنوں کے بل کھڑے ہوگئے اور کہا کہ جس کو تم عزت سمجھتے ہو مجھ کو اس کی پرواہ نہیں، اگر زمین پر بیٹھنا غلاموں کا شیوہ ہے تو مجھ سے بڑھ کر خدا کا غلام کون ہوسکتا ہے، رومی ان کی بے پروائی اور آزادی پر حیرت زدہ تھے، یہاں تک کہ ایک شخص نے پوچھا کہ مسلمانوں میں تم سے بھی کوئی بڑھ کر ہے؟ انھوں نے کہا: معاذ اللہ! یہی بہت ہے کہ میں سب سے بدتر نہ ہوں، رومی چپ ہوگئے۔" (الفاروق ص ۱۱۸)

حضرت معاذ بنؓ جبل سے صلح کی گفتگو آگے نہ بڑھ سکی تو رومیوں نے حضرت

ابوعبیدہؓ سے براہ راست گفتگو کے لیے ان کے پاس ایک قاصد بھیجا، جس وقت وہ حضرت ابوعبیدہؓ کے پاس پہونچا تو وہ زمین پر بیٹھے تھے، ہاتھ میں تیر لیے اس کو الٹ پلٹ رہے تھے، قاصد کا خیال تھا کہ سپہ سالار بڑا جاہ و حشم والا ہوگا جس سے وہ اس کو پہچان لے گا لیکن وہ جس طرح نظر اٹھا کر دیکھتا تھا، سب ایک رنگ میں ڈوبے نظر آتے تھے، آخر گھبرا کر پوچھا: تمہارا سردار کون ہے؟ لوگوں نے ابوعبیدہؓ کی طرف اشارہ کیا، وہ حیران رہ گیا۔ (الفاروق ص ۱۱۹)

جنگ یرموک کے بعد کا واقعہ ہے کہ ایک قاصد جارج نامی صلح کا پیام لے کر حضرت ابوعبیدہؓ کے پاس پہونچا، مسلمان اس وقت مغرب کی نماز پڑھ رہے تھے، ان کی محویت اور خضوع کو دیکھ کر وہ بے حد حیرت زدہ ہوا، نماز ختم ہوچکی تو حضرت ابوعبیدہؓ کی خدمت میں پیش کیا گیا، اس نے جو چند سوالات کیے، ان میں ایک یہ بھی تھا کہ حضرت عیسیٰ کی نسبت کیا خیال ہے؟ حضرت ابوعبیدہؓ نے قرآن کی یہ آیتیں پڑھیں جن کا مطلب یہ تھا: اے اہل کتاب اپنے دین میں غلو نہ کرو اور اللہ کے بارہ میں حق بات کہو، مسیح عیسیٰ بن مریم تو صرف اللہ کے رسول اور ایک کلمہ ہیں جس کو اللہ نے مریم کے اندر ڈالا تھا، مسیح کو اس سے ہرگز انکار نہیں کہ وہ اللہ کے ایک بندے ہیں، ان کو سن کر جارج بے اختیار ہوکر بول اٹھا کہ حضرت عیسیٰ کے یہی اوصاف ہیں، بے شک تمہارا پیغمبر سچا ہے، یہ کہہ کر کلمۂ توحید پڑھا اور مسلمان ہوگیا، وہ اپنی قوم کے پاس جانا نہیں چاہتا تھا مگر یہ رسول اللہ کی تعلیم کے خلاف تھا کہ کسی کے سفیر کو روک لیا جائے، حضرت ابوعبیدہؓ نے اس کو یہ کہہ کر واپس کیا کہ ابھی تو تم جاؤ، وہاں جا کر تمہارا جی چاہے تو چلے آنا۔ (الفاروق ص ۱۳۲) یہ رواداری کی کتنی بلند مثال تھی۔

حضرت عمر فاروق اعظمؓ بیت المقدس جس سادگی سے پہونچے، اس کا ذکر مورخوں نے طرح طرح سے کیا ہے، مشہور انگریز مصنف ایچ.جی. ویلس نے اس واقعہ کو اپنے انداز میں اس طرح لکھا ہے:

> ''حضرت عمرؓ ۶۳۸ء میں یروشلم آئے اور جس طرح یہاں پہونچے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی سادگی اور پرجوش ہمت کی وجہ سے اس زمانہ میں ان کو کامیابی حاصل ہورہی تھی، چھ سو میل کی مسافت تھی مگر ان

کے ساتھ صرف ایک آدمی ہم سفر تھا، ایک اونٹ پر سوار تھے، ایک تھیلی میں جواور دوسری میں کچھ کھجوریں تھیں، پانی کا ایک مشک اس کے علاوہ تھا، کھانے کے لیے لکڑی کا ایک Phalta تھا، شہر سے باہر ان کے ایک فوجی سردار نے ان کا استقبال کیا، جو ریشم کے کپڑوں میں شاندار طریقہ سے ملبوس تھا، اس کے گھوڑے پر بھی مرصع جھولیں تھیں، ان کو دیکھ کر اس بوڑھے آدمی کو غصہ آ گیا، وہ کجاوہ پر سے اترے، گرد اور پتھر اٹھا لیے اور ان امیروں پر برسانے لگے، ان کو برا بھلا کہنے لگے، یہ ذلت آمیز رویہ کس لیے تھا؟ وہ پوچھنے لگے یہ زینت و آرائش کس لیے ہے؟ لشکری کہاں ہیں؟ وہ صحرانشیں کہاں ہیں؟ یہ لوگ میری معیت میں نہ چلیں، وہ اپنے ساتھ والے اکیلے ہم سفر کے ساتھ آگے بڑھے اور فوجی امرا ان سے اتنے دور رہے کہ ان کے پتھروں کی چوٹ سے محفوظ رہیں، وہ یروشلم کے سردار سے ملے جن کے حوالے رومی فرماں روا یروشلم کو کر چکے تھے، خلیفہ نے اس سے تفریحی باتیں کیں، دونوں نے اس مقدس شہر کی سیر ساتھ ہو کر کی اور جب عمرؓ کا غصہ فرو ہو گیا تو اپنے آراستہ پیراستہ ساتھیوں سے ہنسی مذاق کی باتیں کرنے لگے''۔ (دی آرٹ لائن آف ہسٹری ۱۹۲۹ء اڈیشن ص ۸۹-۵۸۸)

حضرت عثمان غنیؓ کے زمانہ میں رومیوں سے اسکندریہ، آذربیجان، آرمینیہ، ایشیائے کوچک اور قبرص میں معرکہ آرائیاں ہوئیں مگر وہ ہر جگہ پسپا ہوئے، ۳۱ھ میں وہ پانچ سو جہازوں کے بیڑے کے ساتھ شام پر حملہ آور ہوئے لیکن امیر معاویہؓ اور حضرت عبداللہؓ بن ابی سرح نے اپنی جانبازی سے ان کو شکست فاش دی اور وہ تباہ ہو کر بمشکل قسطنطنیہ پہنچ سکے۔ (فتوح البلدان و تاریخ اسلام از جناب شاہ معین الدین احمد ندوی ص ۲۵۷-۲۴۷)

خلفائے راشدین کے زمانہ میں ان کی پوری مملکت میں عیسائیوں کے ساتھ جو نرمی اور رواداری، لطف اور کرم برتا گیا اس کی پوری تفصیل گذشتہ صفحوں میں آ چکی ہے، رواداری کی اس سے بہتر مثالیں اور کیا پیش کی جا سکتی ہیں۔

بنوامیہ اور رومی: رومیوں نے بنوامیہ کو بھی چین نہیں لینے دیا، حضرت معاویہؓ کے زمانہ میں ہر سال بحری جنگ کرتے، یہاں تک کہ حضرت معاویہؓ کو قسطنطنیہ کے خلاف ۹۹ھ میں فوج کشی کرنی پڑی مگر اس مہم میں یہ فتح نہ ہو سکا مگر عیسائیوں سے لڑ کر روڈس اور ارواڑ کے جزیروں پر ضرور قبضہ کر لیا۔ (تفصیلات کے لیے دیکھو تاریخ اسلام ج ۲ از جناب شاہ معین الدین احمد ندوی ص ۲۰-۱۸)

رومیوں نے عبدالملک بن مروان کے زمانہ میں شام پر حملہ کر کے اس کو تنگ کرنے کی کوشش کی، ولید بن عبدالملک کے زمانہ میں رومیوں نے مصیصہ پر حملہ کیا تو ولید کو بہت سے جنگی مقامات مثلاً حصین ابق، حصین اخرم، حصین بولس، طمانہ، انطاکیہ وغیرہ کی مورچہ بندی کرنی پڑی، سلیمان بن عبدالملک تو رومیوں کے بار بار حملہ سے قسطنطنیہ پر حملہ آور ہو گیا مگر غیر معمولی سردی اور برف باری کی وجہ سے یہ حملہ ناکام رہا، بنوامیہ کے ہر حکمراں کے دور میں رومیوں سے چھیڑ چھاڑ اور لڑائی رہی، ان ہی معرکہ آرائیوں میں ہشام بن عبدالملک کے زمانہ میں رومیوں سے مڈبھیڑ صقلیہ میں ہوئی تو سرقوسہ کے علاقہ پر بنوامیہ کا تسلط ہو گیا۔ (ایضاً ص ۱۶۷-۱۶۶)

بنوامیہ کی رواداری کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ ان کے مفتوحہ علاقوں خصوصاً شام اور عراق میں دفتری زبان عربی کے بجائے رومی و فارسی ہی رہی، خراج کے محکمہ میں عربوں کے بجائے دوسری قومیں ہی سیاہ و سپید کی مالک بنی رہیں۔ (المامون ص ۱۶۱)

بنوامیہ کی علمی رواداریاں: امیر معاویہؓ نے اپنی حکومت کے زمانہ میں غیر قوموں کی بڑی حوصلہ افزائی کی، انھوں نے ایک عیسائی کو دربار کا میر منشی مقرر کیا، ابن آثال ایک عیسائی تھا، امیر معاویہؓ نے حمص میں اس کو ایک معزز عہدہ دیا وہ طبیب بھی تھا اس لیے امیر معاویہؓ کے لیے طب کی بعض کتابیں یونانی زبان سے ترجمہ کی گئیں۔ (مقالات شبلی ج ۶ ص ۴)

امیر معاویہؓ کا پوتا خالد تھا، اس کو اسلامی علوم و فنون سے بڑا لگاؤ تھا لیکن جب اس کو طب اور کیمیا سے واقفیت حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا تو اس نے عیسائی طبیبوں کی شاگردی اختیار کر لی اور مریانس نامی ایک راہب عالم سے علم کیمیا سیکھا اور اس فن میں تین مختصر کتابیں

بھی لکھیں، اس نے عیسائی عالموں کو بلا کر یونانی اور نبطی زبانوں کی کتابوں کے ترجمے کرائے ان میں مشہور مترجم اصطفن تھا۔ (مقالات شبلی ص ۵)

مروان بن الحکم کے دربار کا مشہور طبیب ماسرجیس تھا جو یہودی تھا اس نے بشپ ایرن کی قرابادین کا عربی ترجمہ سریانی زبان سے کیا۔ (ایضاً ص ۵)

اس وقت مال گذاری اور خراج کے دفتروں میں سارا حساب کتاب یا تو لاطینی یا نبطی زبان میں رکھا جاتا تھا۔

ہشام بن عبدالملک کے زمانہ میں علوم وفنون کی بڑی ترقی ہوئی، اس نے غیر قوموں کی بڑی سرپرستی کی، اس کے زمانہ میں خالد بن عبداللہ قسری عراق کا حاکم اعلیٰ مقرر ہوا، وہ اپنی علمی بے تعصبی کے لیے بے حد مشہور ہوا، شہنشاہ ایران نے فرقۂ مانویہ کے پیشوا مانی کو قتل کرادیا تھا اور حکم دیا تھا کہ اس فرقہ کا ایک آدمی بھی زندہ نہ رہنے پائے، چنانچہ اس کے پیرو پناہ لینے کے لیے ہر جگہ مارے مارے پھرتے تھے، خالد نے ان کو پناہ دی اور اس فرقہ کے لوگ اس کو مربی سمجھنے لگے تھے، ہشام کا میر منشی سالم غیر زبانوں میں مہارت رکھتا تھا، اس نے ارسطو کے رسالوں کا ترجمہ عربی زبان میں کیا، اس کے بیٹے جبلہ نے فارسی زبان کی بہت سی کتابوں کا ترجمہ عربی میں کیا، ہشام کو شاہان عجم کے علمی ذخیرہ میں ان کی ایک مصور تاریخ بھی ہاتھ آئی تھی جس میں قواعد سلطنت، تعمیرات اور دوسرے علوم وفنون بھی درج تھے، ہشام نے اس کا ترجمہ عربی میں کرایا۔ (مقالات شبلی ج ۶ ص ۷-۶)

سسلی میں مسلمانوں کی حکومت: عیسائیوں نے افریقہ اور ایشیا یا دنیا کے کسی خطہ میں جاکر خوں ریز لڑائیاں لڑکر اپنی ملک گیری کی دھاک جمالی اور سامراجیت کا پرچم لہرایا تو اس کو کسی نہ کسی طرح حق بجانب ثابت کیا مگر یورپ میں مسلمانوں نے کسی جگہ اپنا قدم جمایا تو وہ اس کو کبھی گوارا نہ کرسکے اور ان کی بیخ کنی کے لیے ہر قسم کی کوشش جاری رکھی، صقلیہ یعنی سسلی میں نویں صدی عیسوی میں عربوں کی حکومت قائم ہوئی اور وہ ۸۴۲ء سے ۱۰۷۲ء تک وہاں حکومت کرتے رہے، ان کی حکمرانی کی تعریف عیسائی مورخوں نے بھی کی، انھوں نے بقول مصنف ڈریپر یورپ کی عقلی اور دماغی ترقی کو بڑی تقویت پہونچائی اور ان کے تمدن کی

وجہ سے پورا صقلیہ بہت سرسبز بن گیا، وہاں پانچ قسم کی مختلف قومیں آباد تھیں، ان کے رسم ورواج میں بھی بڑا اختلاف تھا، یہ پانچ قومیں فرانسیسی، یونانی، لانگوبار، یہودی اور عرب تھیں لیکن عربوں کی حکومت کی رواداری کی وجہ سے یہ قومیں اپنے اپنے قوانین کی پابند تھیں، یونانیوں کا عمل جسٹینین کے قانون پر تھا، لانگوباروں کا قانون خاص تھا، نارمنوں کا قانون فرانسیسی تھا اور عرب پابند قرآن تھے، ان مختلف اقوام کو ایک ہی حکومت کے تحت میں رکھنے کے لیے بہت ہی بڑے انصاف اور رواداری کی ضرورت تھی، اس نکتہ سے عرب خوب واقف تھے (تمدن عرب از موسیو لیبان ص ۲۸۸) سکوں پر عبارت نصف عربی میں اور نصف یونانی یا لاطینی میں ہوا کرتی تھی، بعض پر صلیب کی علامت ہوتی اور بعض پر اسلامی نشان اور بعض سکوں پر یہ دونوں علامتیں ہوتی تھیں۔ (ایضاً ص ۲۸۰)

صقلیہ کو عربوں نے جس طرح سنوارا اس کا ذکر کرتے ہوئے ایس. پی. اسکاٹ لکھتا ہے کہ اس کے دارالسلطنت پلرمو کو تمام شہروں پر تفوق حاصل تھا، بہت دولت مند شہر بن گیا تھا اس کے باشندے نہایت مہذب اور ذہین تھے، یہاں پانچ سو مسجدیں تھیں اس کی جامع مسجد میں سات ہزار آدمی بہت آسانی سے نماز پڑھ سکتے تھے، دولت مندوں کے مکانات ایسے ہوتے تھے جن کی نظیر قرطبہ کے سوا اور کسی اسلامی شہر میں نہ ملتی تھی، ان مکانات کی دیواریں مختلف رنگوں کے پتھروں کی تھیں، فرش میں مختلف رنگوں کی پچی کاری ہوتی تھی، چھتوں میں مارپیچ وضع کے ساتھ ہندی قاعدہ کے مطابق پھول بوٹے بنے ہوتے تھے، جگہ جگہ ان کو مختلف رنگوں سے مزین کیا جاتا تھا یا ان پر سونے کا کام ہوتا تھا، صحنوں میں خوشبودار پھولوں کے درخت ہوتے تھے جن سے تمام مکان طبلۂ عطار بنا رہتا تھا، غرباء کے مکانات بھی آرام دہ ہوتے تھے، اس زمانہ کے لندن اور پیرس کے غرباء سے ان کے مکانات بدرجہا بہتر تھے، عیسائیوں اور مسلمانوں کے لباس میں، عادات اور طرز بود ماند میں کوئی فرق نہ تھا، مسلمانوں نے سائنس کو بڑی ترقی دی تھی، جغرافیہ، کیمیا اور طب کے علم کا بڑا شوق تھا، جغرافیہ اور فلسفہ میں انھوں نے ایسی شہرت حاصل کی کہ ان کے دو دمان عالی کی طرف کسی کو خیال بھی نہ آیا ہوگا، انھوں نے ایک کرۂ مسطحہ راجر ثانی کو بنا کر دیا تھا، جس سے سطح ارضی و

سماوی کی کیفیت معلوم ہو جاتی ہے، عرب ہیئت دان پلرمو کی مسجدوں کے میناروں میں بیٹھ کر سیاروں کی حرکات، کسوف وخسوف کے اوقات، فضائے آسمانی میں ستاروں کی تقسیم اور ایک دوسرے کے مقابلہ میں ان کے مقامات کا مطالعہ کیا کرتے تھے، جب مسلمان اپنی مقدس عبادت گاہوں کے میناروں سے سائنٹفک تحقیقات کا کام لیا کرتے تھے اس وقت کلیسا کے پادری ایسی چیزوں کو مبغوض نظروں سے دیکھا کرتے تھے، صقلیہ کے عرب اطبا اپنے اندلسی بھائیوں کی طرح یورپ بھر میں سب سے بڑے حاذق سمجھے جاتے تھے، ان کو طب اور جراحی میں دستگاہ کامل حاصل تھی، علم الآلات میں اپنے لایق ترین ہم عصروں سے کسی طرح کم نہ تھے، پانی کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہونچانے اور بلندی پر چڑھانے وغیرہ کے طریقے اور اس کے آلات ان کے ایسے مکمل تھے جیسے ان ترقی یافتہ ممالک کے تھے جہاں کی خشک آب و ہوا کی وجہ سے اراضی کا مصنوعی آبپاشی کی ضرورت رہتی تھی، ہر ایک دریا اور نہر کے کنارے ان کے سینکڑوں کارخانے تھے، ان کارخانوں میں پہیوں کو چلانے کے لیے پانی سے کام لیا جاتا تھا، ان کے کرگھوں کا کپڑا بہ لحاظ باریکی اور مضبوطی وخوبصورتی نہایت مشہور تھا، وقت کا اندازہ لگانے اور ناپنے کے آلات میں بھی بڑی اختراعات کیں، انھوں نے پانی کی گھڑی بھی ایجاد کی تھی جو اس گھڑی کے برابر تھی جو ہارون رشید نے شارلمین کو تحفہ میں بھیجی تھی، اس میں کسی قوت داخلیہ کی حرکت سے خودبخود گھنٹے بجتے تھے، ترکیب یہ تھی کہ جتنے گھنٹے بجانے ہوتے تھے اتنی ہی گولیاں ایک برتن میں تھوڑے وقفہ کے بعد گرتی تھیں اور اس سے آواز نکلتی تھی، یہ زمانۂ حال کے کلاک کا باوا آدم تھی، انھوں نے اصطرلاب بھی ایجاد کیا، علوم کے وہ عجیب وغریب خزانے جو اسکندریہ کے مذہب والوں نے جمع کیے تھے وہ یہاں پہونچ گئے تھے، یہاں کے کتب خانے ان سے مالامال تھے اور صقلیہ کے علما کے دماغ کو منور کر چکے تھے، اقلیدس اور بطلیموس کی کتابیں تو عام تھیں، بطلیموس کے قواعد صرف ونحو، جغرافیہ اور علم النور والبصر صرف مسلمانوں کی وجہ سے محفوظ تھے، پادریوں کی یہ کوشش تھی کہ یہ ضایع کردی جائیں، عربوں کا دماغ طبعی اور ارضی جغرافیہ کے لیے نہایت موزوں تھا۔

(اخبار الاندلس از ایس. پی. اسکاٹ مترجمہ محمد خلیل الرحمن ج ۲ ص ۷۵-۷۶)

عرب سیاسی حیثیت سے بھی یہاں جاندار رہے، ان کی حکومت صقلیہ سے بڑھ کر اٹلی کے جنوبی حصہ تک پھیل گئی تھی، وہ بحر اڈریا نگ تک پہونچ گئے اور راطالیہ کے کئی بندرگاہوں اور جزیروں مثلاً کارسیکا، کیاندی، مالٹا اور بحر متوسط کے جزیروں پر بھی ان کا تسلط ہوگیا، عیسائیوں کو بھلا ان کی یہ حکومت کیسے گوارا ہوسکتی تھی۔

صقلیہ میں عربوں کی حکومت دوسو برس تک رہی مگر عربوں میں جب آپس میں نفاق اور اختلاف پیدا ہوا تو نارمنوں نے اس سے فائدہ اٹھا کر ان سے جنگ کی، ۱۰۷۲ء میں عرب پلرموں کی لڑائی میں شکست کھا گئے، ان کو جس طرح تباہ کیا گیا وہ بھی ایک عیسائی مورخ کی زبانی سنیے، پلرموں میں پانچ سو مسجدیں تھیں، ان کو منہدم کرکے گرجا گھر میں تبدیل کردیا، وہاں علماء، صوفیہ، اور حکما کی جتنی قبریں تھیں، سب نیست و نابود کردی گئیں، چارلس دوم کے زمانہ میں سسلی کے مسلمانوں کو زبردستی عیسائیوں کا بپتسمہ دے دیا گیا، نوسیرا اور بوسیرا کے مسلمانوں کی تعداد اسی ہزار تھی، ان کو زبردستی عیسائی بنالیا گیا، ساری جگہیں مسلمانوں سے خالی کرالی گئیں، اس کی تفصیل ہسٹورین ہسٹری آف دی ورلڈ ج ۹ ص ۸۳-۸۲ میں پڑھی جاسکتی ہے۔

ایس. پی. اسکاٹ بڑے دکھ اور درد کے ساتھ لکھتا ہے کہ صقلیہ میں مسلمانوں کے ہزاروں محل اور مسجدیں تھیں، ان کی خوبصورتی، موزونیت اور شان مسلمانوں کے شہروں کے لیے مایۂ ناز تھی، اب ایک بھی وہاں باقی نہیں ان کو یا تو عوام کالانعام نے پامال کرڈالا یا وہ کلیسا کے تعصب وحقارت کی نذر ہوگئیں۔ (اخبار الاندلس ج ۲ ص ۷۵)

نارمنوں نے صقلیہ کے باشندوں پر جو مظالم ڈھائے تو بقول موسیو لیبان ان کو احساس ہوا کہ نارمنوں کی دوستی عربوں کی دشمنی سے بدتر ہے (تمدن عرب ص ۲۷۷) ان نارمنوں سے عاجز ہوکر وہاں کے لوگوں نے اس زمانہ کے پوپ سے فریاد کی تو پوپ نے شہنشاہ قسطنطنیہ کو ایک خط لکھ کر بتایا کہ نارمنوں کی خودسری اور شرارت کفار کے فسق و فجور سے بھی بدتر ہے، وہ عیسائیوں کا گلا کاٹتے ہیں، کلیساؤں کو لوٹ لیتے ہیں، ان میں آگ لگادیتے ہیں، قتل کرنے میں مرد وزن کی تفریق نہیں کرتے، پوپ نے ان کے خلاف مقدس جنگ

کرنی چاہی مگر قسطنطنیہ کے شہنشاہ نے اس کا ساتھ نہیں دیا، آخر پوپ نے مدد غیبی پر تکیہ کر کے خود ان پر حملہ کیا لیکن اس کو شکست ہوئی اور وہ قید کر لیا گیا اور ایک سال کے بعد اس سے عہد و پیمان کر کے رہا کیا گیا، اس کے بعد نارمنوں نے صقلیہ کی غارت گری اچھی طرح کی، یہاں تک کہ وہاں کی رعیت ان عامیان دین عیسوی کی غارت گری اور خوں ریزی کی عادی ہو گئی۔ (تمدن عرب ص ۲۷۷-۲۷۸)

اندلس کے مسلمان اور عیسائی: آٹھویں صدی کے شروع میں عرب افریقہ پہونچے تو بربروں نے اسلام قبول کیا اور بحر روم تک مسلمانوں کا قلمرو ہو گیا، جس پر رومی برابر حملہ آور ہوتے رہے لیکن بنی امیہ کے جواں مرد، جواں حوصلہ قومی سردار موسیٰ نے بنو امیہ کا تسلط مجورکہ، منورکہ اور انی ویکہ پر قائم کر دیا، رفتہ رفتہ ان کے قلمرو کا دائرہ مصر کی مغربی سرحد سے بحر اوقیانوس کے ساحل تک پہونچ گیا، ان کی سرحد رومیوں کی سرحد سے مل گئی۔

افریقہ میں مسلمانوں کی حکومت شروع ہوئی تو وہاں ہر قسم کی خوشحالی اور ترقی نظر آنے لگی لیکن اسپین گوتھ حکمراں کے ماتحت رہ کر بڑی اذیت میں مبتلا تھا، وہاں متمول طبقہ پر کوئی ٹیکس نہیں لگایا جاتا، مڈل کلاس کے لوگوں پر ٹیکس کے ادا کرنے کا سارا بار تھا، صنعت اور تجارت میں کوئی ترقی نہیں تھی، ملک مختلف حصوں میں منقسم تھا ان پر یا تو کلیسا کی طرف سے حکومت تھی یا متمول لوگ قابض تھے، وہ بڑے بڑے محلوں میں رہتے، عیاشی اور رندی میں زندگی گذارتے، کھیتی غلاموں سے کرائی جاتی، جن کی زندگی مصیبت سے بھری رہتی، ان سے کوڑے مار مار کر کام لیا جاتا، وہ کسی چیز کو اپنی نہیں بنا سکتے تھے، وہ اپنے آقا کی مرضی کے بغیر شادی بھی نہیں کر سکتے تھے، ان کی اولاد کی بھی تقسیم متمول لوگ کر لیتے، وہاں یہودی بھی آباد تھے، وہ اپنی مصیبت سے تنگ آجاتے تو بغاوت کرتے لیکن ان کو عبرتناک سزائیں دی جاتیں، ان کے مال، اسباب اور جائداد ضبط کر لی جاتی، وہ غلام بنا لیے جاتے، بوڑھوں کو تو ان کے مذہب پر چھوڑ دیا جاتا لیکن جوان اور بچے عیسائی بنا لیے جاتے، وہ اپنے ہم مذہبوں سے شادی نہیں کر سکتے تھے، ایک یہودی غلام کی شادی عیسائی غلام کے یہاں ہوتی۔
(ہسٹری آف سراسینز از امیر علی ص ۱۰۶-۱۰۷)

افریقہ میں عربوں کی حکومت قائم ہوئی تو وہاں کی روادارانہ حکومت کی ساری باتوں کو اہل اسپین دیکھتے اور ان کی زندگی پر رشک کرتے، اسپین میں اس وقت روڈرک کی حکومت تھی، اس کے مظالم سے تنگ آکر اسپین کے لوگوں نے افریقہ میں موسیٰ سے درخواست کی کہ وہ ان کو ان کی مصیبتوں سے نجات دلائے، موسیٰ نے اپنے خلیفہ ولید بن عبدالملک سے اجازت لے کر اپنے جواں ہمت فوجی سردار طارق بن زیاد کو اسپین کی طرف بھیجا تو اس کی سپہ گری اور پامردی سے اس جزیرہ کی تاریخ بدل گئی اور اسپین ۷۱۱ء میں بنوامیہ کے قبضہ میں آ گیا، جس کے بعد وہاں کے لوگوں نے بڑا انقلاب دیکھا۔

یہاں کے کچھ حکمرانوں کی سیرت وکردار کے کچھ نمونے لکھنے کے قابل ہیں۔

اس کا پہلا باضابطہ حکمراں عبدالرحمٰن الداخل تھا، دمشق میں بنوامیہ کو عباسیوں نے ختم کیا تو وہاں سے فرار ہوکر اسپین پہونچا، جب وہ اس کے ساحل پر پہلی دفعہ اترا تو اس کے سامنے شراب پیش کی گئی، اس نے یہ کہہ کر اس کی طرف سے منھ موڑ لیا کہ اس کو تو ایسی چیز کی ضرورت ہے جو اس کی عقل کو بڑھائے نہ کہ اس کو کم کرے، اسی طرح اس کو ایک موقع پر بہت ہی حسین وجمیل کنیز پیش کی گئی، اس نے یہ کہہ کر اس کو واپس کر دیا کہ اس کو اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کا سرور بنالے گا تو اپنے اصلی مطلوب کو چھوڑ دے گا اور اگر اپنے اصلی مطلوب کی فکر میں برابر لگا رہا تو اس کنیز پر صریحاً ظلم ہوگا، ان ہی اوصاف کے ساتھ اس نے ایسی حکومت قائم کی جس کی مثال بقول یورپین مصنفین یورپ میں نہیں دیکھی گئی، عوام کے لیے عبدالرحمٰن الداخل کا قصر کھلا رہتا، وہ ممالک محروسہ کے دورے کر کے حکام کے اعمال پر کڑی نظر رکھتا، رعایا کی ضروری باتوں سے باخبر رہتا، صنعت وحرفت اور علوم وفنون کی ترقی کی ترغیب دلائی، قرطبہ کو عمارتوں اور سیرگاہوں سے اس طرح سجا دیا تھا کہ خود ہی اس پر ناز کرنے لگا تھا۔

عبدالرحمٰن الداخل کے بیٹے ہشام اول نے اپنے سیرت وکردار میں اور طرز حکمرانی میں حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز کی یاد تازہ کردی تھی، اس کے زمانہ میں قرطبہ علماء وفضلا اور صلحا کا بہت بڑا مرکز بن گیا تھا، اپنی وفات سے پہلے اپنے جانشین حکم کو یہ نصیحتیں کیں کہ عدل

وانصاف میں امیر وغریب کا امتیاز نہ کرنا، جو لوگ تمہارے دست نگر ہیں ان سے لطف وکرم سے پیش آنا، یہ سب لوگ خداوند تعالیٰ ہی کی مخلوق ہیں، صوبوں اور شہروں کی حفاظت نمک حلال اور تجربہ کار لوگوں پر چھوڑنا، رعایا کو تنگ کرنے والے حکام کو بے رحم ہو کر سزا دینا۔ اپنے سپاہیوں کے ساتھ اعتدال سے پیش آنا اور یہ خیال رکھنا کہ ان کو اسلحہ ملک کی حفاظت کے لیے نہ کہ اس کو تباہ کرنے کے لیے دیئے جاتے ہیں، ہمیشہ اس کی کوشش کرنا کہ تمہاری رعایا تم سے ڈرنے اور نفرت کرنے کے بجائے تم سے محبت کرے، اگر لوگ تم سے ڈرتے رہے تو وہ خطرناک ہو جائیں گے، اور نفرت کرتے رہے تو تم کو برباد کرنے کی کوشش کریں گے، کاشتکاروں کی پوری حفاظت کرنا کہ وہ روٹی مہیا کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ، جہاں بانی کے ان ہی اصولوں کا وہ خود پابند رہا۔

اس خاندان کے حکمران عبدالرحمٰن ثانی کو یونانی فلسفہ سے بڑی دلچسپی تھی، قرطبہ کو عالیشان عمارتوں، حماموں، سیرگاہوں اور فواروں سے سج سجا کر بغداد ثانی بنا دیا تھا، اس کے عہد میں تہذیب وتمدن کو ایسا فروغ ہوا کہ یورپ کے فرماں روا اس کی نقل کرنا فخر سمجھتے تھے۔

اس خاندان کا لائق ترین فرماں روا عبدالرحمٰن ثالث تھا، اس کے انتقال کے بعد اس کے کاغذوں میں ایک بیاض نکلی، جس میں اس نے خود لکھا تھا کہ میں نے نہایت امن و امان اور کامیابی کے ساتھ پچاس برس حکمرانی کی، میری رعایا مجھ پر فدا تھی جب میرے دشمن مجھ سے لرزاں تھے، میرے حلیف اور دوست مجھ سے خوش تھے، دنیا بھر کے بادشاہ میری دوستی کے طلبگار رہتے تھے، کوئی ایسی چیز نہ تھی جس کی خواہش انسان کے دل میں ہوا کرتی ہے، وہ مجھ کو میسر نہ ہوئی، شہرت، قوت اور عیش سب کچھ مجھے حاصل تھا، میں نے اس طویل زندگی میں ان دنوں کو گنا ہے جن میں بے فکر رہا ہوں اور مجھے حقیقی خوشی نصیب ہوئی، وہ شمار میں صرف چودہ تھے، کیا دنیا کا کوئی حکمراں اپنی حکمرانی میں یہ دعویٰ کرسکتا ہے، ایس. پی. اسکاٹ لکھتا ہے کہ عبدالرحمٰن ثالث نے رفاہ عام کے کام بڑے وسیع پیمانے پر انجام دئے اور اپنے دربار میں بڑی شان وشوکت پیدا کی، ڈوزی لکھتا ہے کہ عبدالرحمٰن ثالث کی فوج دنیا کی بہترین فوج تھی، یورپ کے فرماں روا اس سے سفارتی تعلقات رکھنے میں فخر کرتے، اس کی

رواداری کا یہ حال تھا کہ ہر مذہب وملت کے لوگوں کو مشورہ کے لیے بلاتا، وہ ازمنہ وسطی کے بجائے موجودہ دور کا فرماں روا ہونے کے لائق تھا۔ (ان تینوں حکمرانوں کے تفصیلی حالات تاریخ اندلس شائع کردہ دارالمصنفین میں ملیں گے)

عربوں نے جس رواداری سے اندلس میں حکومت کی اس کا اعتراف یورپین مورخین بھی کرتے ہیں، موسیو لیبان لکھتا ہے کہ عربوں نے اندلس کے باشندوں کے ساتھ وہی سلوک کیا جو انھوں نے شام اور مصر میں کیا تھا، ان کے مال، قلعے، ان کے قوانین، ان کے ہم قوم حکام کے زیر انصاف رہنے کے حقوق انھیں عطا کیے گئے، ایک سالانہ جزیہ بہ چند شروط ان پر لگایا گیا، جو امرا کے لیے ایک دینار اور عام رعایا کے لیے نصف دینار تھا، یہ شرائط اس قدر نرم تھیں کہ رعایا نے بلا تکرار قبول کرلیا، عربوں کو پھر بڑے بڑے جاگیرداروں میں سے کسی سے مقابلہ کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ (تمدن عرب ص ۲۴۹-۲۴۸)

اور یہ بھی حقیقت ہے کہ عربوں کی حکومت کی وجہ سے وہاں جو انقلاب آیا اس سے متمول لوگوں کی ساری رعایتیں ختم کردی گئیں، کلیسائی بالادستی جاتی رہی، بھاری محصولات ختم کردیئے گئے، جس سے صنعت کو فروغ ہونے لگا، مذہبی ایذا رسانی اور تعصب کا دور ختم ہوگیا، یہودیوں کو اپنے مذہب میں آزادی دی گئی، عیسائیوں پر بھی کوئی پابندی نہیں رکھی گئی، ان کے لیے قاضی علاحدہ مقرر ہوئے، جو ان کے مقدمے ان کے قوانین کے مطابق فیصلہ کرتے، ملازمتوں میں کوئی تخصیص نہیں کی جاتی تھی، یہودی اور عیسائی دونوں مسلمانوں کے ساتھ بحال ہوتے، غلاموں کو وہ زمین دے دی گئی جن کی وہ کھیتی کرتے تھے، جو غلام عیسائی آقاؤں کے ماتحت تھے ان کو چھوڑ کر اسلام قبول کرنے لگے۔ (ہسٹری آف ساراسینز ازسید امیر علی ص ۱۱۲-۱۱۴)

عربوں نے اسپین کو ترقی دے کر جس طرح اس کو یورپ کا زریں راج ہنس بنادیا وہ قوموں کی تاریخ کی ایک بہت ہی دلآویز کہانی ہے، فراخ دل یورپین مصنفوں نے اعتراف کیا ہے کہ مسلمان اسپین پہنچے تو انھوں نے اس کو علمی اور مالی ترقی کے لحاظ سے ایسا بدل دیا کہ یہ یورپ کا سرتاج بن گیا، انھوں نے عیسائیوں کو دوسرے مذاہب کے ساتھ

رواداری برتنا، مفتوحوں کے ساتھ مہربانی سے پیش آنا اور قول پر قائم رہنا، یورپ کے عیسائیوں کو سکھایا، نہروں کا جال بچھا کر وہاں کے بنجر علاقوں کو سرسبز و شاداب باغات میں بدل دیا، پارچہ بافی کو ایسی ترقی دی کہ یورپ میں یہیں کے کپڑے مقبول تھے، شکر، روئی، لوہے، اسپات اور کاغذ کے کارخانے کھول کر تجارت اتنی بڑھا دی کہ ان کے تجارتی بیڑے بحر اسود اور بحر قلزم سے افریقہ اور مدغاسکر تک پہونچا کرتے تھے۔

عربوں نے اسپین کو ترقی دے کر جس طرح زریں راج ہنس بنا دیا، اس کا اعتراف یورپ کے مؤرخوں نے اپنی تحریروں میں بھی کیا ہے۔ مثلاً اسٹینلی لین پول لکھتا ہے:

''مسلمانوں نے قرطبہ میں وہ حیرت انگیز سلطنت قائم کی جو ازمنۂ وسطی میں ایک اعجوبۂ روزگار بن گئی، اس زمانے میں سارا یورپ وحشیانہ جہالت اور باہمی جنگ میں مبتلا تھا، مسلمانوں کا اسپین تنہا علم اور تہذیب کی جگمگاتی مشعل کی طرح مغربی دنیا میں دکھائی دے رہا تھا، یہ خیال کرنا صحیح نہیں کہ عرب بھی ان وحشیوں کی طرح تھے جو ان سے پہلے اسپین آئے تھے، اس کے برعکس عربوں نے جس نرمی، انصاف پسندی اور تدبر سے یہاں حکومت کی، ویسی حکومت یہاں پہلے کبھی نصیب نہیں ہوئی، یہاں کے لوگ مجموعی حیثیت سے عربوں سے مطمئن تھے یعنی اس قدر مطمئن جتنے کہ ایک قوم کے لوگ اپنے سے مختلف قومیت، نسل اور مذہب کے لوگوں سے ہو سکتے تھے، اسپین والے جس درجہ کے عیسائی تھے اسی درجہ کے مجوسی بھی تھے، کونسٹن ٹائن نے ان کو عیسائی ضرور بنا لیا تھا مگر اس مذہب نے ان پر بہت کم اثر ڈالا تھا، وہ محض نمایشی طور پر رومی وضع رکھے ہوئے تھے، وہ مذہب نہیں چاہتے تھے بلکہ ان کی خواہش تھی کہ کوئی ایسی قوت آ جائے جس کے سہارے وہ امن و عافیت کی زندگی بسر کر سکیں، یہ چیز ان کے عرب آقاؤں نے ان کو دی۔

شروع میں ایک تھوڑی سی مدت میں آتش زنی، لوٹ مار اور قتل کا

سلسلہ رہا لیکن عرب حاکموں نے اس پر قابو پالیا، جب ہر چیز پر سکون ہو گئی تو رعایا یہ محسوس کرنے لگی کہ وہ پہلے سے بدتر حالت میں نہیں ہے، پھر کچھ دنوں کے بعد وہ یہ سمجھنے لگی کہ حکمرانوں کی تبدیلی سے وہ منفعت میں رہی، انھیں اجازت تھی کہ وہ اپنے قوانین اور احکام باقی رکھیں، ان ہی کے قوم کے لوگ ان کے علاقے کا انتظام کرتے، وہی ٹیکس وصول کرتے، آپس کے جھگڑے چکاتے، شہریوں کے متوسط طبقہ پر سلطنت کے اخراجات کا بار نہیں ڈالا گیا، صرف جزیہ ادا کر دیتے، جس کی شرح بہت زیادہ نہ تھی، اس کے ادا کرنے کے بعد تمام ذمہ داریوں سے آزاد ہو جاتے، البتہ اگر ان کے پاس کھیتی ہوتی تو ان کے جزیہ کے علاوہ زمین کا خراج بھی ادا کرنا پڑتا، جزیہ کی شرح حیثیت کے مطابق مقرر کی جاتی، یہ رقم بارہ سے اڑتالیس درہم سالانہ ہوتی، اس کی وصولی بارہ مہینوں میں ہوتی، اس لیے اس کا ادا کرنا بھی آسان تھا، جزیہ کفر کا جرمانہ ہے(۱)، یہ صرف عیسائیوں اور یہودیوں سے لیا جاتا، خراج آراضی کی پیداوار کے لحاظ سے عیسائیوں، یہودیوں اور مسلمانوں سے یکساں طور پر لیا جاتا، زمین کے مالک کو اس کو منتقل کرنے کا حق دیا گیا، مذہبی آزادی میں ان کو شکایت کا کوئی موقع نہیں دیا گیا، پہلے ان پر تبدیل مذہب کے لیے جبر کیا جاتا تھا لیکن عربوں نے ان کو آزادی دے رکھی تھی کہ جس چیز اور جس شخص کی چاہیں پرستش کریں، عیسائی اپنے نئے حکمرانوں سے ایسے خوش رہے کہ آٹھویں صدی کے اندر ان کے خلاف کوئی مذہبی بغاوت نہیں ہوئی، اس تبدیلی سے غلام اپنے آپ کو مبارک باد دیتے تھے، عیسائی اور گوتھ ان سے بہت برا سلوک کرتے تھے، پیغمبر اسلامؐ کی یہ تعلیم تھی کہ وہ شخص جو اپنے غلام کے ساتھ برا سلوک کرتا ہے، فردوس میں داخل نہیں ہوگا، عرب زمین کا جوتنا نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اس

(۱) یہ صحیح نہیں، جزیہ کا مطالعہ صحیح طور پر کیا جائے تو یہ رائے غلط معلوم ہوگی۔

لیے اپنی خوشی سے اپنے غلاموں کو کاشت کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا تھا اور وہ صرف پیداوار کا واجبی حصہ ان سے لیتے تھے، اس طرح غلام بھی ان سے خوش رہے، وہ خوشی سے آزاد ہو کر دین اسلام قبول کر لیتے تھے، عربوں نے بڑے بڑے امرا اور کلیساؤں کی ضرورت سے زیادہ زمیں داریوں کو ختم کر دیا اور چھوٹی چھوٹی ملکیتیں بنا دیں، غلاموں کو کثرت سے آزاد کرنے کی ترغیب دلائی اور جو آزاد نہ ہوئے ان کی حالت کو سدھارنے کی کوشش کی، اس طرح یہ غلام اپنے غیر کاشت کار مسلمان آقاؤں کی ملازمت میں خود مختار اجارہ دار بن گئے۔'' (مورس ان اسپین ص ۴۲-۵۷)

اسپین کو تمدنی حیثیت سے عربوں نے جس طرح آراستہ و پیراستہ کر کے یورپ کی سرزمین کے لیے ایک مایۂ ناز اور فخر روزگار ملک بنا دیا تھا، ذرا اس کی بھی روداد اسٹینلی لین پول کی تحریروں کے ذریعہ سے ملاحظہ کر لیں:

''قرطبہ کے بارے میں اسٹینلی لین پول لکھتا ہے کہ یہ اپنے وقت میں قابل فخر دارالسلطنت تھا، اپنی خوب صورتی، خوش اسلوبی، بود و باش کے تعلقات، صفائی اور باشندوں کی تعلیم اور سلیقہ مندی میں اس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا ہے، اس وقت سارا یورپ وحشیانہ اور بہیمانہ تاریکی میں تھا، ٹوٹی پھوٹی رومی سلطنت میں تہذیب و تمدن کی کچھ نشانیاں باقی رہ گئی تھیں یا قسطنطنیہ اور اطالیہ کے بعض حصوں میں شائستگی دکھائی دیتی، اس کے مقابلہ میں قرطبہ کی حیرت انگیز فضا تھی۔'' (مورس ان اسپین ص ۱۲۹)

یہاں کی وادی الکبیر کی زینت و آرائش کے متعلق لکھتا ہے:

''وادی الکبیر کے سواحل، سنگ مرمر کے مکانوں، مسجدوں اور باغوں سے جگمگاتے تھے، جن میں غیر ملکوں کے نہایت ہی نادر اور کمیاب پھول اور پودے بڑی صناعی سے لگائے گئے تھے، عربوں نے ان کی سیرابی کے لیے خاص اپنا طریقہ جاری کیا تھا جو اسپین کو پہلے کبھی نصیب نہ ہوا،

خاندان بنی امیہ کے پہلے سلطان نے ملک شام کے کھجور کا ایک درخت منگوا کر نصب کیا تھا تاکہ اس کو پرانے وطن کی یاد دلاتا رہے، اس نے اپنے کارپردازوں کو تمام دنیا میں روانہ کیا تھا کہ اجنبی ملکوں کے عمدہ اور کمیاب درخت، پودے اور بیج لے آئیں اور ان کے باغبان ایسے ہوشیار تھے کہ ان کی صناعی سے اجنبی ملکوں کی چیزیں جلد وہاں کی طبیعت قبول کر لیتی اور شاہی محل سے نکل کر تمام ملک میں پھیل جاتی تھیں، اسی طرح سے نمونہ کے طور پر دمشق سے انار لایا گیا تھا اور جس پانی سے ان متعدد باغوں کی سیرابی ہوتی تھی وہ پہاڑوں سے لایا جاتا تھا، پہلے تو سیسے کے نلوں کے ذریعہ سے پانی متعدد خزانوں میں پہنچتا تھا، بعض سونے چاندی اور بعض پیتل کے ہوتے تھے، یہ پانی جھیلوں، حوضوں، تالابوں اور یونانی سنگ مرمر کے چشموں میں جمع ہوتا تھا۔'' (مورس ان اسپین ص ۱۲۹-۱۳۱ اردو ترجمہ از سید عبدالغنی وارثی ص ۱۰۱)

قرطبہ کی مسجد کے متعلق اسٹینلی لین پول لکھتا ہے کہ اس کی تعمیر ۷۸۴ء میں عبدالرحمٰن الداخل اول نے شروع کی، اس میں اسی ہزار اشرفیاں خرچ ہوئیں، بعد کا ہر سلطان اس کے حسن میں کچھ نہ کچھ اضافہ کرتا رہا یہاں تک کہ یہ دنیا کی تعمیرات میں عمدہ ترین نمونہ بن گیا، اس میں ستونوں اور دیواروں پر پچی کاری کے اعلیٰ نمونے دکھائی دیتے تھے، مشرق سے مغرب تک انیس اور شمال سے جنوب تک اکیس محرابیں تھیں، نمازیوں کے اندر آنے کے لیے اکیس دروازے چمکیلے پیتل کے تھے، ایک ہزار دو سو ترانوے ستونوں پر اس کی چھت قائم تھی، اس کے مصلوں میں چاندی کا فرش تھا، جس پر زریں پچی کاری تھی، ستونوں میں منبت کاری کا کام تھا جو سونے اور لاجورد سے مرصع تھے، اس کا منبر ہاتھی کے دانت کا بنا ہوا تھا جو چھتیس ہزار الگ الگ تختیوں سے مرکب تھا، ان میں سے اکثر میں جواہرات جڑے ہوئے تھے اور سونے کی کیلیں لگی ہوئی تھیں، اس میں وضو کے لیے چار حوض تھے، جن میں برابر پہاڑوں سے پانی آیا کرتا تھا، مسجد کے پچھم جانب بہت سے مکانات بنے ہوئے

تھے، یہاں غریب مسافر آ کر ٹھہرتے، ان کی خاطر تواضع حکومت کی طرف سے کی جاتی، سیکڑوں برنجی قندیلیں رات کے وقت اس مسجد کو منور کرتی تھیں اور ایک بڑی سی مومی شمع تھی جس کا وزن پچاس پونڈ تھا، رمضان کے مہینے میں شب و روز یہ جلا کرتی تھی، تین سو خادم بخور دانوں میں عود و عنبر جلایا کرتے، قندیلوں میں دس ہزار بتیاں جلا کرتی تھیں۔ (مورس ان اسپین باب ہشتم اردو ترجمہ ص ۱۰۴)

عبدالرحمٰن ناصر ثالث نے قرطبہ کے پاس جبل الفردوس میں اپنی بیوی زہرا کے لیے ایک محل مدینۃ الزہرا کے نام سے بنوایا تھا جو اس کے جانشین کے زمانے میں بھی بنتا رہا، اس کے بنوانے میں چالیس سال لگ گئے، اس میں پندرہ ہزار دروازے تھے جس کے اوپر لوہا جلا کیا ہوا پیتل چڑھا ہوا تھا، اس کے دیوانِ عام کی چھت اور دیواریں سنگ مرمر کی تھیں، اس میں پتھر کا ایک تراشیدہ فوارہ تھا، دیوان عام کے وسط میں پارے کا حوض تھا، اس کے دونوں جانب آٹھ دروازے تھے جن پر ہاتھی دانت اور آبنوس منڈھے ہوئے تھے جو جواہرات سے بھی مرصع تھے، جس وقت ان دروازے سے آفتاب کی شعاعیں آتی تھیں اور پارے کے حوض میں جنبش پیدا کرتی تھیں تو سارے کمرے میں بجلی کی چمک پیدا ہو جاتی اور درباریوں کی آنکھیں چکا چوندھ ہو جاتی تھیں، محل کے باغ کے زینے سفید سنگ مرمر کے تھے، اس میں بڑے بڑے طلائی کمرے اور مدورشہ نشین تھے، جن میں انواع و اقسام کی صناعی تھی۔

پوری عمارت کی صناعی، بیل بوٹوں کی خوش نمائی، تناسب کی خوبصورتی، نقش و نگار کی صفائی، ستونوں کی ہمواری اور ان کی رنگ آمیزی سے بہت ہی عمدہ منظر دکھائی دیتا، اسٹینلی لین پول لکھتا ہے کہ جو سیاح یہاں آتے وہ کہتے کہ ایسی چیزیں کہیں نہیں دیکھی جو اس کے برابر ہو سکے۔ (مورس ان اسپین ص ۱۴۲-۱۳۹ اردو ترجمہ ص ۱۰۷-۱۰۵)

ایک دوسرے انگریز مورخ ایس. پی. اسکاٹ نے غرناطہ کی تمدنی، تہذیبی، تجارتی اور اقتصادی اہمیت اور وہاں کے محل الحمراء کی شان و شوکت کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے، اس کے جستہ جستہ ٹکڑوں کو ہم اختصار کے ساتھ ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔

غرناطہ: ۱۲۷۵ء میں جزیرہ نمائے اندلس کا وہ حصہ جو عیسائی صوبے قرطبہ و مرسیہ سیرالویرا

اور سمندر سے گھرا ہوا تھا، دنیا بھر میں سب سے زیادہ دولت مند اور سب سے زیادہ مہذب و متمدن تھا، وہاں جو طریقہ زراعت مستعمل تھا وہ عراق عرب کا ایجاد کردہ تھا، اس کی نشو ونما میں بہت سی نسلوں کی محنت و مشقت اور تجربہ کا دخل تھا، آخر وہ اس حد تک پہونچ گیا کہ اس نے اپنی زرخیزی اور سرسبزی سے دنیا بھر کو حیران کر دیا، یہاں دنیا کی ہر چیز پیدا ہوتی تھی، کھجور، انجیر و انار کے پہلو بہ پہلو آلو بالو اور لیموں ہوتے تھے، یہ چیزیں اندلس یا غرناطہ میں پہلے کبھی نہیں دیکھی گئیں، یہاں کے انگور بے دانہ ہوتے تھے اور نو مہینے تک لطافت کے ساتھ اپنی خوش بو کو قائم رکھتے تھے، زیتون کے باغات کثرت سے تھے، سیاح ان کو شاہ بلوط کے جنگل سے تشبیہ دیتے تھے، گیہوں، جو، جوار اور باجرہ کی فصلیں مسلسل پیدا ہوتی تھیں، ریشم کے کیڑوں کی پرورش کے لیے شہتوت کے درخت بہ کثرت لگائے گئے تھے، ریشم کی صنعت کو بڑا فروغ تھا، ساحل کے نزدیک روئی اور کتان کی کاشت ہوتی تھی، جن سے باریک کپڑے بنے جاتے تھے اور بحر روم کے ملکوں میں ہاتھوں ہاتھ بکتے تھے، دھان، گنے کے کھیت، باداموں کے درختوں کے جھنڈ، لیموں اور نارنگیوں کے باغات، قیمتی لکڑیوں کے جنگلات، بھیڑ بکریوں اور عام چوپایوں کی چراہ گاہیں غرناطہ کی زراعت، دولت کا بڑا وقیع حصہ تھے، دواؤں میں استعمال ہونے والے پودے اور بوٹیاں سلیقے سے کاشت اور پرورش کی جاتی تھیں، جو قرابادین کے لیے بہترین ذخیرے مہیا کرتی تھیں، یہ ان ہی کا طفیل ہے کہ زمانۂ حال کے اطبا اور دواساز یورپ میں علاج معالجہ کر رہے ہیں، کرم دانہ کی کاشت کر کے وہ ایسا رنگ بناتے تھے کہ خوب صورتی اور شوخی میں ارغوانی رنگ سے بڑھ جاتا تھا، یہاں کی کانوں سے سنگ مرمر، عقیقِ ابیض، سنگ سلیمانی، سنگ رخام اور لاجورد نکال کر ان کا بہترین مصرف لیا گیا یعنی نیلم اور حجر یمانی سے عورتوں کے لیے سنگار کی چیزیں تیار کی گئیں۔

ہندوستان سے فرانس تک اور شام سے یمن تک کے تمام ملکوں نے مسلمانان اندلس کے علما اور علم نباتات کے محقق دماغوں کے سامنے اپنا اپنا خراج پیش کیا، نور ریز آفتاب اور زرریز زمین کے فیضان سے ممالک غیر کی نایاب جڑی بوٹیاں اس بہتات کے ساتھ پیدا ہوتی تھیں کہ اپنے اصل وطن میں بھی اس سے زیادہ نہ ہوتی ہوں گی، ہندستان سے کبابہ اور

ایلوا، یمن سے بلسان اور لوبان، ایران سے ریحان، آس اور چنار یہاں مسلمانوں نے پہونچایا۔

مسلمانوں کے چند ہی افراد ایسے ہوتے جن کو سائنس اور تجارت کی تدابیر نہ آتی ہوں، وہ علاقے کے علاقے جنت بنا کر چھوڑتے، آبپاشی کے لیے بلوریں نہریں جاری کیں۔

مادی دولت کے ساتھ ادبی، علمی اور دماغی ترقی بھی خوب ہوتی رہی، جب تمام شہر سوتا تھا، ہیئت کے مسلمان علمارات کو آسمان کا مطالعہ کرتے رہتے اور سیاروں کی سیر کرتے رہتے، یہاں کے دلکش مقامات نے شاعروں میں ایک نئی روح پیدا کر دی تھی، مورخوں نے ان کو قلم بند کر کے جادو کا رنگ بھر دیا ہے۔

جو سیاح یہاں آتا، اپنی آنکھوں سے یہاں کا منظر دیکھ کر متعجب ہوتا، یہاں وہ دنیا بھر کے تاجروں کو اپنا کام کرتے ہوئے پاتا، ہر قوم کے جہاز کھڑے ہوتے، بڑی بڑی منڈیاں ہر ضلع میں ہوتیں، انجیر اور انار کے باغات مسلسل دکھائی دیتے، ریشم، اون، کتان اور روئی کے کپڑے اس طرح بنے جاتے کہ بعض پیاز کے چھلکے سے بھی باریک ہوتے، ان پر عجیب وغریب کشیدہ کاری ہوتی، مٹی، پیتل، تانبے یا کسی اور دھات کے جو برتن یہاں بنائے جاتے، ان کی بڑی شہرت تھی، زیورات اور جواہرات سے بازار بھرے رہتے۔

تین سو شہر اور قصبے تھے، شہر کا ایک ایک حصہ خاص خاص صناعوں کے لیے مخصوص تھا، جو کپڑے شاہی خاندان کے لیے تیار ہوتے ان پر بادشاہ کی تصویر اور طغرے مختلف رنگوں اور کلابتوں سے کڑھے ہوتے، زیورات ایسے تیار کیے جاتے جن کو دیکھ کر آدمی محوِ حیرت ہو کر رہ جاتا، یہاں کی میناکاری، پچی کاری اور منبت کاری بہت مشہور تھی۔

جتنی سڑکیں تھیں ان کے کنارے سدا بہار جھاڑوں کی پٹیاں ہوتیں، جگہ جگہ نہایت خوب صورتی سے لیموں، نارنگی، کھجور اور سرو کے درخت لگے ہوتے، ہر جگہ پانی کے گرنے کی خوش گوار آواز سے کانوں کی ضیافت کا سامان مہیا ہوتا، سرو وصنوبر کے درمیان خوشنما عمارتوں کے سرخ کھپرے نظر آتے تھے، ان کی دیواریں دودھ جیسی سفید ہوتی تھیں، وہ گلاب کے پھولوں سے ڈھکی رہتی تھیں، ان کو دیکھ کر عرب شاعر کہتے تھے کہ یہ معلوم ہوتا

ہے کہ زمرد کی پیالی میں موتی جڑے ہوئے ہیں، متعدد مسجدوں کے سیکڑوں مینار ایک عجیب دلکش منظر پیش کرتے تھے، ان میں مختلف رنگوں کی اینٹیں ہوتیں، سونے کے کتبے بھی ہوتے جو دور سے چمکتے، ہر مسجد کے وسیع صحن میں سنگ مرمر کا ایک حوض اور فوارہ ہوتا، نارنگی کے درختوں اور خوشبودار پھولوں کی قطاریں ہوتیں، جن کی خوشبو اونچے اونچے جالی دار دروازوں میں سے چھن چھن کر نمازیوں کی تواضع کرتی تھیں۔

عین وسط شہر میں القصبہ تھا، جو قلعہ کا قلعہ اور محل کا محل تھا، اس کے برج، مورچے، مثمر باغوں، سرسبز زمینوں، بلوریں نہروں اور فواروں کے مقابلہ میں نہ صرف سیاحوں ہی کو دلکش معلوم ہوتے تھے بلکہ خود اس محل جنت نظیر کے رہنے والے اس کا لطف اٹھاتے تھے۔

اس زمانہ کی رسم کے مطابق مسجد اور مدرسہ بالکل ملحق ہوتے، چنانچہ یہاں بھی مسجد کے ساتھ غرناطہ یونیورسٹی تھی، جس کا دروازہ قومی دشمنوں کے لیے بھی ویسا ہی کھلا ہوا تھا جیسا کہ مسلمانوں کے لیے تھا، اہالی قستانہ اپنے دشمنوں کے دارالسلطنت میں رہ کر وہ علم سیکھتے تھے جن کا ان کے ملک میں نام ونشان بھی نہ تھا اور جن کا خواب وخیال بھی ان کو اپنے وطن میں نہ آیا تھا۔

الحمراء: غرناطہ میں نو محل تھے، لیکن وسعت اور حسن میں ان سب کا سرتاج الحمراء تھا، جو سیرا کی بنی کوہ کی ایک چوٹی پر بنا ہوا تھا اور شہر کی سطح سے پانچ سو فٹ اونچا تھا، اس کی فصیل کے مرغولوں اور مورچوں پر سفید رنگ تھا، پوری عمارت بڑی وسیع مربع شکل کی تھی، اس کے وسط میں اور ہر ایک گوشہ میں بہت بڑے بڑے صحن تھے اور ان کے گرد دالان، مقصورہ اور غلام گردش وغیرہ تھے، اس میں دربارِ عام کی بھی عمارت تھی جس میں تخت نشینی کے علاوہ اور بھی مراسم ادا کیے جاتے تھے، اس کمرہ کا قبہ ساٹھ فٹ بلند تھا، اس کے فرش پر نیلے، سرخ اور سبز رنگ کی پچی کاری تھی، جس کے بیچ میں ہاتھی دانت اور سونے کا کام تھا، اس کی دیواروں پر شوخ رنگ کی زمین دے کر بہت خوبصورتی سے سونا چڑھایا گیا تھا، فرش سنگ مرمر کی بہت بڑی بڑی سلوں کا تھا اور اس کے عین وسط میں نہایت خوبصورت حوض اور فوارہ تھا، دیواروں پر نقش ونگار نہایت نزاکت کے ساتھ بنائے گئے تھے، ان کو دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ گویا

کسی ریشمی کپڑے پر ریشمی دھاگے اور کلابتوں کا کام ہے، قبے اس طرح بنائے گئے تھے کہ گویا وہ آدھا انار ہے جس میں سے دانے نکال کر پھینک دیئے گئے ہیں، اس حیرت انگیز عمارت پر کلام پاک کی آیتیں کھودی گئی تھیں، نقش و نگار قواعد ہندسی کے مطابق تھے، ایک حصہ کے پھول بوٹے دوسرے سے بالکل مختلف تھے، حارہ کے پھول بڑی خوب صورتی سے دکھائے گئے تھے، اس عمارت کے ایک کمرہ کے اندرونی حصہ کی تعمیر میں جو کمال دکھایا گیا تھا اس کو دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ انسان کے ہاتھ یا دماغ کا نتیجہ ہے، بلکہ حقیقت میں کسی مافوق البشر کا بنایا ہوا ہے، دیواروں پر کشیدہ کار پردے اور پتھر کی بنی ہوئی موٹی چیزیں لٹکی رہتیں، روشنی کے لیے جو کھڑکیاں تھیں ان میں مختلف رنگ کے شیشے تھے، جن پر شاہی طغرا کے علاوہ قرآن مجید کی آیتیں کندہ تھیں، اس عمارت میں قرآن کی آیتوں کے علاوہ کلماتِ حکمت، شعرا کی نظمیں، کہیں محرابوں کی پیشانی پر سلام علیک اور کہیں بارک اللہ لکھا تھا، کمروں میں نہایت لطیف ہوا حوضوں کے پانی سے سرد ہو کر پہونچا کرتی تھی، کمرہ میں پانی ہر وقت ٹپکتا رہتا اور کہیں اچھلتا رہتا، وہاں بیٹھ کر یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ اس ملک میں گرمی بھی کبھی ہوتی ہے، موسم سرما میں انگیٹھیاں جلتی رہتی تھیں، زیادہ سردی ہوتی تو دھات کے گولوں میں ایک خاص ترکیب سے جلتے ہوئے کوئلے بھر کر فرش پر لڑھکا دیئے جاتے تھے۔

الحمراء کی مسجد: یہ امیر محمد ثالث کی بنائی ہوئی تھی، اس پر تمام مسلمانوں کا اتفاق تھا کہ وہ دنیائے اسلام کی نفیس ترین مسجدوں میں سے ایک تھی، اس کے ستون سنگ یشب، سماق، مرمر اور زبر جد خام کے تھے، محرابوں میں نہایت نازک چینی کا کام تھا، جگہ جگہ لاجورد اور سنگ سلیمانی کی تحریریں تھیں، اس کی کرسی خالص چاندی کی تھی جس پر زخرفۃ العرب کا کام تھا، اسی ترکیب سے پھول بنے ہوئے تھے، چھت نیلے رنگ کی تھی، اس پر سنہرا کام تھا، اس میں سیپ، پیتل اور چاندی کی قندیلیں لٹکی رہتی تھیں ان پر گلابی رنگ کے ریشمی غلاف چڑھے رہتے تھے، جن سے چھن چھن کر جو روشنی نکلتی تھی وہ نہایت خوش آئند معلوم ہوتی تھی، اس کی چینی کی اینٹوں، کتبوں اور پچی کاری کے رنگوں کی موزونیت میں اندلس کے مسلمان صناعوں نے اپنی کاری گری کا پورا کمال صرف کر دیا تھا۔ (اخبار الاندلس از ایس. پی. اسکاٹ مترجمہ

محمد خلیل الرحمٰن ص ۵۴۸-۵۵۲)

عیسائیوں کو عربوں کی حکومت اپنی تمام خوبیوں کے باوجود ان کی مذہبی عدم رواداری کی وجہ سے پسند نہیں آتی، ایس. پی. اسکاٹ نے لکھا ہے کہ عیسائی ان عربوں سے آٹھ سو برس تک متواتر لڑتے رہے اور ان کو پانچ ہزار لڑائیاں لڑنی پڑیں، ظاہر ہے کہ اتنی طویل مدت تک وہی قوم دوسرے ملک میں جا کر حکومت کر سکتی ہے جس کے زیادہ تر فرماں روا اچھے رہے ہوں۔

اندلس میں عیسائیوں کے مظالم: مگر عیسائیوں نے اسپین کی مسلمان حکومت کو جس طرح ختم کیا اور وہاں کے مسلمانوں پر جو مظالم کیے اس کی تفصیل یورپین مورخوں ہی کی زبانی سنیے، اسٹینلی لین پول رقم طراز ہے:

> ''لڑائیوں میں بیس ہزار مسلمان مارے جا چکے تھے، پچاس ہزار وہاں رہ گئے تھے، جہاں ۱۵۷۰ء کی یاد میں تمام مذہبی پیشواؤں کا یوم منایا جانے والا تھا، اس سال جو عیسائی پیشوا شہید ہوئے تھے ان کی یاد میں ان بے چارے باقی ماندہ مسلمانوں سے انتقام لیا جانے والا تھا، بغاوت میں جو پکڑے گئے ان کو تو غلام بنا لیا گیا، بقیہ کو فوج کی نگرانی اور مکمل تحفظ میں پہاڑوں میں جلا وطن کر دیا گیا، بہت سے بدنصیب تو راستے ہی میں تھک کر اور ٹھنڈک سے راستہ ہی میں ہلاک ہو گئے، جو افریقہ پہونچے وہ بھیک مانگنے لگے، زمین کا کوئی ایسا ٹکڑا ان کو نہیں دیا گیا جس پر وہ کھیتی کرتے، وہ فرانس بھی پہونچے لیکن وہاں ان کی کوئی خاص پذیرائی نہیں ہوئی، اگر چہ ہنری چہارم کو اسپین کے خلاف سازش کرنے کے لیے ایسے لوگوں کی ضرورت تھی، یہ جلا وطنی ۱۶۱۰ء تک ختم نہیں ہوئی، اس وقت تک پانچ لاکھ مسلمان جلا وطن کر کے برباد کیے جا چکے تھے، کہا جاتا ہے کہ غرناطہ کے سقوط کے بعد سترہویں صدی کے پہلے دس سال میں بیس لاکھ مسلمان جلا وطن کیے گئے۔

اسپین والے اپنی غلط قسم کی مآل اندیشی کی وجہ سے سمجھ نہیں رہے تھے کہ وہ کیا کر رہے ہیں، مسلمانوں کی جلاوطنی کی وجہ سے وہ خوش تھے، ان کے لیے یہ بہت ہی دل آویز اور رومانی واقعہ تھا، انھوں نے اس پر گیت لکھے، تصویریں بنائیں اور اس کو حق بہ جانب قرار دیا لیکن ان کو معلوم نہ تھا کہ انھوں نے ایک زریں راج ہنس کو ہلاک کیا، صدیوں اسپین تمدن کا مرکز بنا رہا، یہ آرٹ، سائنس، علوم اور ہر قسم کے عمدہ ذوق اور روشن خیالی کا منبع تھا، یہاں جو ترقی ہوئی یورپ کا کوئی ملک بھی اس کا مقابلہ نہ کر سکا، فرڈینینڈ اور آئی سی بیلا اور چارلس پنجم کے زمانہ میں اسپین کو ترقی ہوئی لیکن وہ مسلمانوں کے اندلس کے معیار پر نہیں پہونچ سکا، مسلمان وہاں سے جلاوطن کیے گئے تو عیسائی اسپین میں چاند ضرور چمکا لیکن اس کی روشنی مستعار تھی پھر اس میں جو گرہن لگا وہ برابر باقی رہے۔'' (مورس ان اسپین ص ۲۷۹-۸۰)

اندلس میں عیسائیوں کی سفاکی، درندگی اور بہیمیت کی مزید کہانی ایک اور انگریز مورخ کی زبانی بھی سنیے:

''غرناطہ کے سقوط کے معنی ان تمام عربوں کی موت تھی جنھوں نے اسپین پر سات سو اکیاسی سال (۷۱۱-۱۴۹۲ء) تک حکومت کی، فرڈی ننڈ سے معاہدہ تو ضرور ہو گیا لیکن اس پر عمل کرنے کا اس کا مطلق ارادہ نہ تھا، اس نے غرناطہ پر قبضہ کر لیا، یہی اس کی زندگی کا مقصد تھا، وہ اپنی سیاسی زندگی میں اپنے ذاتی مفاد کی خاطر ہر چیز کو قربان کر سکتا تھا، اس نے سوچ رکھا تھا کہ وہ عربوں کو مجبور کرے گا کہ وہ اپنے مذہب اور طرز زندگی کو ترک کر کے یہاں کے باشندوں میں ضم ہو جائیں، وہ اپنے مذہبی قوانین میں تبدیلی اس طرح کرتا رہا کہ سارے مسلمان کیتھولک بن کر رہیں، پہلے اس نے یہودیوں کی خبر لی، انھوں نے اپنا مذہب چھوڑنے سے انکار کیا تو ان کو

طرح طرح کی اذیتیں دی گئیں ان کو سولی پر چڑھایا گیا، یہ اس لیے بھی کیا گیا کہ عرب اس سے سبق سیکھیں کہ انھوں نے اپنا مذہب چھوڑنے سے انکار کیا تو ان کے ساتھ بھی یہی سب کچھ کیا جائے گا، مسلمانوں پر عبادت کرنے پر پابندی عاید کی گئی پھر وہ کھل کر اس اعلان کے ساتھ سامنے آ گیا کہ وہ مسلمان جو عیسائیت قبول نہ کریں وہ دربہ در کر دیے جائیں، غرناطہ میں کہرام مچ گیا مگر کوئی سماعت نہیں ہوئی، مسلمان گرجا جاتے، عیسائیوں کی عبادت کرتے مگر گھر آ کر توبہ استغفار کرتے، البوزاراس کے پہاڑی قبیلہ والے مسلمان عیسائی ہونے سے انکار کر کے بغاوت پر آمادہ ہوئے تو فرڈی ننڈ ایک بڑے لشکر کے ساتھ ان پر حملہ آور ہوا، اس کی سرزمین کو تباہ و برباد کر دیا، اس کی ساری چیزیں ضبط کر لیں اور ان کو جلاوطن ہونے کا حکم دیا، ویلن شیا کے مسلمانوں کی صنعت و حرفت کی وجہ سے ملک میں بڑی خوشحالی پیدا ہو گئی تھی، چارلس پنجم کے زمانہ تک ان کو برداشت کیا گیا لیکن امراان مسلمانوں کو عیسائی مذہب قبول کرنے کے لیے مجبور کرتے، ۱۵۲۵ء میں سیویل کے آرک بشپ کی طرف سے یہ فرمان جاری ہوا کہ سارے مسلمان اپنے رسم و رواج، زبان اور پوشاک کے طرز کو ترک کر دیں، ۱۵۶۵ء میں مسلمانوں نے فلپ دوم کو ایک بڑی رقم دے کر رعایتیں حاصل کیں، لیکن وہاں کے باشندوں کی مذہبی غیر رواداری انتہا کو پہونچ گئی، وہ مسلمانوں کو کہیں چین نہیں لینے دیتے، وہ پہاڑوں میں جا کر چھپ جاتے تو وہاں بھی ان کا پیچھا کرنے اور عیسائی مذہب قبول کرنے پر مجبور کرتے۔''

(دی ہسٹورین ہسٹری آف دی ورلڈ ج ۸ حصہ دوم ص ۲۵۹-۲۵۸)

پھر ایک فرانسیسی مورخ موسیو لیبان کی المیہ داستان بھی سنیے، وہ اندلس میں مسلمانوں کے شاندار کارناموں کی یاد بھی دلاتا جاتا ہے اور عیسائیوں نے ان کو جس طرح برباد کیا اس کی المناکی بیان کر کے اپنے ناظرین کو رلانے کی بھی کوشش کرتا ہے:

''عربوں کی مستعدی علوم، فنون اور حرفت کی شاخوں پر چھائی ہوئی تھی، ان کی تعمیرات عام رومیوں سے کم نہ تھیں، سڑکیں، پل، مسافر خانے، شفا خانے اور مساجد ہر طرف بہ کثرت بن گئی تھیں، جس وقت رئیس الاساقفہ زمی تیز نے اپنے وقت میں غرناطہ کی کل کتابوں کو جن کی تعداد اسی ہزار تھی، جلوایا تو وہ یہ سمجھا تھا کہ اس نے دشمنانِ مذہب عیسوی کی یادگار کو ہمیشہ کے لیے صفحۂ تاریخ سے مٹا دیا لیکن اسے یہ نہ معلوم تھا کہ ان تحریری یادگاروں کے علاوہ وہ تمام ملک میں ایسی زبردست یادگاریں چھوڑ گئے ہیں جو ان کے نام کو ابدالآباد تک قائم رکھنے کے لیے کافی ہیں۔'' (تمدن عرب ص ۲۵۶)

دارالخلافت قرطبہ علوم، فنون، تجارت و حرفت کا بہت بڑا مرکز بن گیا، موسیو لیبان کا بیان ہے کہ اس کا مقابلہ یورپ کا کوئی دارالسلطنت نہیں کرسکتا تھا مگر اس کو موسیو لیبان اپنے زمانہ میں دیکھنے گیا تو اس کے جو تاثرات ہوئے اس کو اس طرح قلم بند کرتا ہے:

''یہ پرانا شہر اب بھی موجود ہے لیکن موجودہ حالت میں تو اسے ایک مقبرہ کہنا چاہیے، مجھ پر بہت کم ایسے دردناک خیالات کا ہجوم ہوا جیسا کہ اس کو دیکھ کر ہوا، جہاں اس عظیم الشان ویرانہ میں کسی وقت دس لاکھ آدمی رہتے تھے، یہاں داخل ہوا تو ایک خاموشی کی حالت میں دیواروں ہی کے سایہ میں پھرتے پھرتے مجھے گھنٹوں گزر جاتے تھے، اس میں شک نہیں کہ عیسائیوں نے قرطبہ میں ہلال کی جگہ صلیب کو قائم کرکے بڑی کامیابی حاصل کی مگر جس شہر پر ہلال کا سایہ تھا وہ دنیا کے شہروں میں بہت ہی پررونق، خوب صورت اور آباد شہر تھا، برخلاف اس کے مسیحی صلیب آج کے دن اس اعلیٰ تمدن کے ویرانہ پر سایہ فگن ہے جسے صلیب کے پوجنے والوں نے برباد کیا مگر اس کی جگہ پر دوسرا تمدن نہ قائم کرسکے۔'' (تمدن عرب ص ۲۵۶)

وہ مسجد قرطبہ کا بھی ذکر کرتا ہے کہ اس میں ایسی عجیب آرائشیں اور گل کاریاں تھیں کہ ہیکل سلیمانی کی وہ عمارت بھلادی گئی تھی جس کو رومیوں نے برباد کیا تھا، اس کا مینار زمین سے اکہتر گز بلند تھا، اس کی چھت ایک ہزار ترانوے مختلف رنگ کے سنگ مرمری ستونوں پر قائم تھی، اس میں انیس گلیاں تھیں، اس کا جنوبی روکار دریائے کاڈل کوئی ڈر (رودالکبیر) کی جانب واقع تھا، اس میں انیس دروازے تھے، جن پر نہایت باریک کام کی ہوئی کانسے کی پتریاں جڑی ہوئی تھیں، بیچ کی پتریاں سونے کی تھیں، مشرقی اور مغربی روکار میں اسی قسم کے نو دروازے تھے، مسجد کی چھت ستونوں پر قائم تھی، ان پر نہایت پرتکلف نعل ایسی محرابیں تھیں، چھت زمین سے دس گز کے قریب بلند تھی، مسجد میں کہیں تاریکی نہ تھی، محرابوں کے نیچے اور تعمیر اور آرائشوں کی خاص ترتیب کی وجہ سے اس میں جو جدت پیدا ہوگئی تھی وہ کہیں اور نہیں دکھائی دیتی تھی، اس کو عیسائیوں نے برباد کر کے وہاں اپنے کلیسے بنائے، دیواروں کی آرائشوں اور کتبوں پر چونے کی استرکاری کردی گئی، مسجد کے فرش کی پچی کاری کا کام برباد کردیا گیا، پرتکلف چھتوں کی کندہ کی ہوئی لکڑیاں اکھاڑ کر فروخت کردی گئیں۔ (تمدن عرب ص ۲۶۳-۲۶۲)

قرطبہ سے چند فرسخ پر طلسمی قصر زہرا تھا، جس میں ہزاروں قسم کی گل کاریاں تھیں، سنگ مرمر کی استرکاری تھی، چھتوں میں سنہری اور زرنگاری رنگ آمیزیاں پیچ در پیچ تھیں یعنی دالانوں میں خوش نما فوارے تھے، ایک سنگ یشب کا حوض تھا جس کے اوپر سونے کا بگلا بیٹھا دکھائی دیتا، اس میں دست کاری کا اعلافن دکھایا گیا تھا، اس کی چھت سے وہ مشہور موتی لٹکتا رہتا جو شہنشاہ غربی نے عبدالرحمٰن کے لیے بہ طور تحفہ بھیجا تھا، یہاں سنگ سماق کا مشہور حوض تھا، جس میں پارہ بھرا ہوا تھا، اس پر آفتاب کی شعاعیں نہایت لطف کے ساتھ پڑتی رہتی تھی، یہاں ایک شاہی حمام بھی تھا جس کے حوض

سنگ مرمر کے تھے اور اس میں انواع واقسام کے ریشمی، پشمینی اور سوتی
قالین بچھے ہوتے تھے، جن میں کسی پر پھل بنے ہوتے اور درخت بنے
ہوتے تھے اور کسی پر جانور ایسی عمدگی سے بنے ہوتے تھے کہ اصلی معلوم
ہوتے تھے۔ (تمدن عرب ص۲۶۴-۲۶۲)

اس قسم کی دل فریب عمارتیں طلیطلہ میں، اشبیلیہ اور غرناطہ وغیرہ میں بنی ہوئی تھیں
الحمراء کی کھڑکیوں سے جہاں تک نظر پہونچتی تھی آسمان نظر آتا، اس کے باغوں کے دیکھنے
سے انواع واقسام کے منظر آنکھوں کے سامنے پھر جاتے تھے، یہاں شاہی محل کی حسین بیگمات
خیموں کے سبزے اور بہار دیکھنے اور پھولوں کی مہک سونگنے آیا کرتی تھیں (تمدن عرب
ص۲۶۹) ان سب کو عیسائیوں نے راکھ کا ڈھیر بنا دیا، اس سے زیادہ ان کی عدم رواداری کا
کیا ثبوت ہوسکتا تھا، عربوں پر ان کا تسلط قائم ہوگیا تھا تو کم از کم ان کے شاندار تمدن سے اپنی
دشمنی کا اظہار نہ کرتے۔

انکیوزی شن: اندلس پر مسلمانوں کے شدید مظالم کے سلسلہ میں یہ بات بھی یہاں پر
قابل ذکر ہے کہ اسپین سے مسلمانوں کے انخلا اور جلاوطنی کی ہیروئن ملکہ ائی زی بیلا سمجھی جاتی
ہے، جس کے تدبر، ہوشمندی اور زیرکی پر عیسائی اسپین کو اب تک ناز ہے، اس کا کارنامہ یہ
بھی بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے کلیسا کے پادریوں کے مشورے اور اصرار سے ۱۴۸۱ء میں
انکیوزیشن کا مذہبی قانون نافذ کیا، اس کی رو سے جو ملحد یا کیتھولک مذہب کا منکر قرار پائے گا
وہ آگ میں زندہ جلا دیا جائے گا، اس مذہبی قانون کی زد سب سے پہلے یہودیوں پر پڑی،
۱۴۹۲ء میں اندلس میں دو ہزار یہودی نذر آتش کردئے گئے جو سترہ ہزار باقی رہ گئے ان سے
کہا گیا کہ وہ یا تو اپنی ساری دولت اور جائداد حکومت کے حوالہ کردیں تاکہ وہ چھوٹی سزائیں
دے کر یا قید خانہ بھیج کران کی جانیں محفوظ کردی جائیں، یہ یہودی اندلس کے مسلمانوں کے
علاقہ میں جاکر پناہ لینا چاہتے تھے لیکن ان کو اس کی اجازت نہیں دی گئی، مورخین کا بیان ہے
کہ عیسائی اس طرح یہودیوں کی دولت پر قبضہ کرنا چاہتے تھے تاکہ اس کے سہارے اندلس
کے مسلمانوں کا صفایا کر کے اندلس کو عیسائی اندلس بنایا جائے۔ (اسپین از ہنری ایڈورڈ واٹ

ص۹۰-۲۸۹)

لیکی نے اپنی کتاب ہسٹری آف دی یورپین مورلس میں لکھا ہے کہ مسیحیوں کے زمانہ میں اسپین کے محکمۂ احتساب کے حکم سے اکیلے ٹورکیمیڈہ کی زیر صدارت دوہزار نفوس زندہ جلادیے گئے اور سترہ ہزار اشخاص جنھوں نے مختلف شدائد کے بعد اپنے عقائد سے توبہ کرلی ان کا ذکر نہیں، چارلس پنجم کے عہد میں شہداء کا شمار پچاس ہزار تک تھا۔ (اردو ترجمہ تاریخ اخلاق یورپ ص۳۹۰، ج۱)

ڈریپر اپنی کتاب معرکۂ مذہب وسائنس میں لکھتا ہے:

''نومبر ۱۴۷۸ء میں پاپا کا فرمان صادر ہوا کہ کفر وزندقہ کی سراغ برآری اور استیصال کی غرض سے انکوی زیشن کی مقدس عدالت قائم کی جائے، اس عدالت کے پہلے سال یعنی ۱۴۸۱ء کی کارروائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوہزار اشخاص اندلس میں زندہ جلادیے گئے، ان کے علاوہ کئی ہزار مردے قبروں سے نکال کر جلائے گئے، اور سترہ ہزار اشخاص کو جرمانہ یا حبس دوام کی سزا دی گئی، مظلوم یہودیوں میں سے جس سے بن پڑا جان سلامت لے کر بھاگ گیا، باقی تختۂ مشق وستم بنائے گئے، ٹارکوئی میڈا نے جواب کیشل اور لیان کا صدر محتسب مقرر ہوا، داد احتساب وحشیانہ خونخواری سے دی، گمنام شکایات کی بنا پر ملزم کو پکڑ بلایا جاتا تھا، اس کے مواجہ میں کوئی شہادت نہیں لی جاتی تھی، اسے گواہوں پر جرح کرنے کا کوئی موقع نہیں دیا جاتا تھا، اقبال جرم کے لیے ملزم کو شکنجہ میں دے دیا جاتا تھا اور شکنجہ کا جان فرسا عذاب زمین دوز تہ خانوں میں پہونچایا جاتا تھا، جہاں سے بے چارے ستم رسیدوں کی چیخ وپکار کوئی نہیں سن سکتا تھا، رحم کا منھ اس طرح چڑایا جاتا تھا کہ حکم دے دیا جاتا تھا کہ مجرم کو شکنجہ میں دوسری مرتبہ نہ کسا جائے، فیاضی کی نقل اس طرح اتاری جاتی کہ ملزم سے کہہ دیا جاتا تھا کہ آج تمہاری ہڈیوں کا چور اچھی طرح نہیں ہوا، اس لیے کل تک کے لیے شکنجہ کی سزا ملتوی کی جاتی ہے،

بدنصیب مجرموں کے تباہ شدہ خاندانوں کی مصیبت کا اندازہ کرتے ہوئے دماغ لرزتا ہے، لارنٹ نے جو انکویزیشن کا مورخ ہے، اندازہ لگایا ہے کہ ٹارکوئی میڈا اور اس کے شرکاء نے اٹھارہ سال کی مدت میں تین ہزار دو سو پچاس اشخاص کو زندہ جلایا، چھ ہزار آٹھ سو ساٹھ اشخاص کی مورتیں بنا کر جلائیں اور ستانوے ہزار تین سو اکیس اشخاص کو دوسرے طریقہ سے مختلف سزائیں دیں، اس مخبوط الحواس پادری نے انجیل کے عبرانی نسخے جہاں کہیں ملے ضائع کرادئے، سیلنیکا میں علوم مشرقیہ کی چھ ہزار کتابیں یہ کہہ کر آگ میں جھونک دی گئیں کہ ان میں یہودی مذہب کی تعلیم مندرج ہے، اس کے ساتھ جب ہم یہ سنتے ہیں کہ پاپا کی حکومت دولتمند یہودیوں سے روپے لے کر انھیں انکویزیشن کے احتساب سے مستثنیٰ کر دیتی تھی اور تذکرۃ الغفران کی فروخت سے بہت کچھ روپے پیدا کرتی تھی تو ہماری نفرت اور حقارت کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ (معرکۂ مذہب و سائنس از ڈاکٹر جان ولیم ڈریپر مترجمہ ظفرعلی خاں ص ۶-۲۰۵)

فرانس کے مسلمانوں پر عیسائیوں کے مظالم: اندلس کو فتح کرنے کے بعد مسلمان فرانس کی طرف بڑھے، اس وقت کے عیسائی حکمرانوں کا حال موسیو لیبان نے یہ لکھا ہے:

> ''فرانس ان بادشاہوں کی حکومت میں تھا جو سلاطین کاہل الوجود کے نام سے مشہور تھے، جاگیرداروں اور امرا کے مظالم سے ملک کی حالت ابتر ہو رہی تھی۔''

اسی زبوں حالی میں عرب فرانس پہونچے تو انھوں نے فرانس کے جنوبی شہروں پر آسانی سے قبضہ کرلیا اور تاریان، کارکاسان، نیم لبان، ماکان اور اوتون جیسے شہروں پر ان کا تسلط ہوگیا، وہ دریائے رون، ڈافینے اور برکان تک پہونچ گئے مگر یہاں حکومت قائم کرنے کے بجائے صرف فوجی تسلط پر قانع رہے، ۷۳۲ء میں عبدالرحمٰن اور چارلس مارٹل کی زبردست محاذ آرائی ہوئی مگر ٹور کے مقام پر عربوں کو شکست ہوئی اور اس طرح وہ جیتی ہوئی لڑائی

ہار گئے، اس کے بعد چارلس مارٹل کی طرف سے جو بربریت دکھائی گئی وہ انسانی تاریخ کا بہت بڑا المیہ ہے، جہاں جہاں عربوں نے ٹھکانے قائم کیے تھے یا ان کے شہر آباد ہو چکے تھے ان کو راکھ کا ڈھیر کر دیا، لوائر کے جنوبی علاقے برباد کر کے چٹیل میدان کر دئے گئے، بیزیر، اگڈ ہے اور دوسرے شہر عربوں کے تسلط میں تھے، ان کو بہت ہی خوبصورت بنا دیا تھا، یہ سب برباد کر دئے گئے، نائمس میں مسلمانوں کی بہت شان و شوکت دکھائی دیتی تھی لیکن اس میں آگ لگا دی گئی اور یہاں عرب جیسے جیسے کمزور ہوتے گئے عیسائیوں کی چیرہ دستی بڑھتی گئی جو شہر عربوں کے قبضہ میں رہ گئے تھے، ان کو پے پن نے ۷۵۲ء میں تباہ و برباد کر دیا، ان شہروں کو نذر آتش کر دیا، وہاں کی مسجدیں اور شفاخانے راکھ کے ڈھیر کر دئے گئے، عورتوں اور بچوں کو اس طرح تہ تیغ کیا گیا کہ پورے علاقہ میں صرف خوں ریزی اور بربادی دکھائی دیتی۔ (امیر علی ص ۱۶۳، ۵۳-۱۵۱)

فرانس میں مسلمانوں کی شکست پر بعض فرانسیسی خوش ہو کر یہ لکھتے ہیں کہ ٹور کی لڑائی نے دنیا کی قسمت کا فیصلہ کر دیا، اگر فرانسیسی شکست پاتے تو عالم مسلمانوں کے ہاتھ آجاتا اور یورپ اور تمام دنیا کی ترقی کا ستیاناس ہو جاتا کیونکہ وہ جذبہ جو انسان کی ترقی کا باعث ہوتا مسلمانوں کی فطرت ہی میں نہیں (تمدن عرب ص ۲۸۸) ایسے فرانسیسی مورخین اپنی حب الوطنی کے جذبہ میں اور سب کچھ لکھ جاتے تو کوئی بات نہ تھی مگر ان کا یہ لکھنا کہ مسلمانوں کی فطرت میں ترقی کا جذبہ نہیں اور پھر ان کا یہ بھی لکھنا کہ مسلمانوں کا خدا جو دنیا کو پیدا کرنے کے بعد اپنی شان اور اپنی وحدانیت کے بستر پر آرام کر رہا ہے، انسان کو ترقی پر آمادہ نہیں کرتا (ایضاً ص ۲۸۸) یہ کوئی مورخانہ تبصرہ نہیں بلکہ مذہبی ایذا رسانی ہے مگر ایسے مورخین کا جواب موسیو لیبان نے یہ لکھ کر دیا ہے کہ عرب یہاں پوری طرح سے متوطن ہو جاتے تو اس فرضی صورت میں شمال یورپ کی کیا حالت ہوتی وہ ہمیں اندلس کے دیکھنے سے معلوم ہو سکتا ہے، جب کہ اندلس نے عربوں کی حکومت میں ایسے زمانہ میں اعلیٰ درجہ کا تمدن حاصل کیا، جب یورپ شدید وحشیانہ حالت میں تھا تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس زمانہ کے تمدن کے لحاظ سے عیسائی اقوام یورپ کو اسلامی تسلط سے بہت کچھ فائدہ ہوتا اور نقصان نہ ہوتا، اسلام کی

رحمت ان اقوام مغربی کے اخلاق میں لینت پیدا کردیتی اور انھیں مذہبی خوں ریزیوں سے سینٹ برتھالیمو کے قتل عام اور عدالتوں کے مظالم سے جنھوں نے کئی صدیوں تک یورپ کے خون کے دریا بہائے اور جن سے مسلمان بالکل ناواقف تھے، بچالیتی۔ (تمدن عرب ص ۸۹-۲۸۸)

رومن امپائر اور عباسی خلفاء: عباسیوں کے دور میں بھی رومیوں سے برابر جنگ ہوتی رہی، خلیفہ مہدی کے زمانۂ حکومت (۷۷۵ء-۷۸۵ء) میں بازنطینیوں نے میخائیل کی نگرانی میں اسی ہزار فوج کے ساتھ اس کے علاقہ کو تاخت وتاراج کرنے کی کوشش کی اور مراصہ پر یورش کر کے اس کو راکھ کا ڈھیر کردیا اور وہاں کے لوگوں کو بے دردی سے تہِ تیغ کیا خلیفہ مہدی کی فوج حسن بن قحطبہ کی سرداری میں انتقام لینے کے لیے پہونچی تو رومیوں نے مراجعت کی، اسی کے بعد یزید بن اسید سلمی نے قالیقلا کے نواح میں رومیوں کے تین قلعے حاصل کرلیے، بازنطینی پھر حملہ آور ہوئے تو مہدی ان سے جنگ کرنے کے لیے خود روانہ ہوا، اس نے حلب کو اپنا فوجی صدر مقام بنایا اور اپنے لڑکے ہارون رشید کو تجربہ کار فوجی سرداروں کے ساتھ رومیوں سے برسرپیکار ہونے کے لیے بھیجا، انھوں نے سمالو کا قلعہ فتح کرنے کے علاوہ اور چھوٹے چھوٹے علاقے تسخیر کیے، مہدی کو کچھ اطمینان ہوا تو وہ بیت المقدس کی زیارت کے لیے چلا گیا اور ہارون رشید کو آرمینیا اور آذربائیجان کا حاکم اعلیٰ مقرر کیا، کچھ دنوں کے بعد رومی میخائیل کی نگرانی میں نوے ہزار فوج کے ساتھ مسلمانوں کے علاقہ پر پھر ٹوٹ پڑے، ہارون رشید ایک بڑی فوج لے کر ایشیائے کوچک میں داخل ہوا منقیطا رومی نے بڑھ کر اس کا مقابلہ کیا لیکن اس کو شکست فاش ہوئی، اس کے بعد ہارون رشید کی فوج قسطنطنیہ کی طرف بڑھی، رومی شہنشاہ لیو چہارم کی بیوہ آئرین اپنے لڑکے، کونسٹنٹائن ششم کی طرف سے حکومت کررہی تھی، اس نے دیکھا کہ مسلمانوں کی فوج باسفورس کے ساحل تک پہونچ گئی ہے، اس نے مقابلہ کیا تو اس کو بھی شکست ہوگی، اس لیے صلح کی خواستگار ہوئی، ہارون رشید نے رواداری سے کام لیا اور سالانہ خراج پر صلح کرلی، یہ واقعہ ۷۸۲ء کا ہے، یہ روادارانہ نرمی سیاسی حیثیت سے صحیح نہیں ہوئی، ہارون رشید کی فوجی قوت اس وقت بہت

زیادہ تھی، وہ آسانی سے قسطنطنیہ فتح کر سکتا تھا، جس کے بعد رومی حکمرانوں اور مسلمانوں سے وہ خوں ریز تصادم ختم ہو جاتا جو بعد میں برابر ہوتا رہا۔ (ابن اثیر ج ۶ ص ۲۰، تاریخ اسلام از شاہ معین الدین احمد ندوی ج ۳ ص ۲۷-۱۷، امیر علی ہسٹری آف سراسینز ص ۲۳۳)

ہارون رشید کے دور میں (۸۰۹ء-۷۸۶ء) رومی اپنی غیر رواداری میں اس سے پھر متصادم ہو گئے، ائرین کے زمانہ میں جو صلح ہوئی تھی اس کو نظرانداز کر کے وہ عباسیوں کے علاقوں پر حملہ آور ہوئے مگر ان کی فوج بری طرح پسپا ہوئی، رومیوں کے کئی شہروں پر ہارون رشید کی فوج کا قبضہ ہو گیا، جن میں سائپرس اور کریٹ بھی شامل تھے، وہ پھر صلح کے خواستگار ہوئے اور سالانہ خراج ادا کرنے کا وعدہ کیا، نرم دل ہارون رشید نے ان وعدوں پر یقین کیا، اس کو خیال ہوا کہ اب ان کی طرف سے بدعہدی نہیں ہو گی لیکن ظالم اور بدعہد ایرین نے اپنے کمسن بچے کولسٹنٹائن ششم کو اندھا کر کے خود آگسٹس کے نام پر تخت نشین ہو گئی، وہ خواجہ سراؤں کے سہارے پانچ برس تک حکومت کرتی رہی لیکن اس سے عاجز ہو کر یونانیوں نے اس کے خلاف بغاوت کی، وہ معزول کر کے جلاوطن کر دی گئی اور اس کی جگہ پر فی سی فورس تخت نشین ہوا، ایرین نے ہارون رشید سے جو صلح کی تھی اس کو نظرانداز کر کے ہارون رشید کو ایک مراسلہ بھیجا جس میں لکھا تھا "رومی شہنشاہ فی سی فورس کی طرف سے عربوں کے فرماں روا ہارون کو معلوم ہو کہ مجھ سے پہلے ملکہ نے تم کو ایک فرزین کا درجہ دیا اور وہ اس بساط میں پھنس گئی اور تمہارے پاس دولت کا ایک انبار بھیج دیا، یہ ایک عورت کی کمزوری اور حماقت کے سبب ہوا، اب جب تم یہ خط پڑھو تو جتنی دولت تم کو یہاں سے ملی ہے اس کو واپس کرو، ورنہ میرے اور تمہارے درمیان تلوار فیصلہ کرے گی۔" ہارون رشید کو یہ اہانت آمیز خط ملا تو اس کے غصہ کی کوئی انتہا نہ تھی، اس نے اسی خط کی پشت پر جواب لکھوایا: "امیر المومنین ہارون رشید کی طرف سے، رومیوں کے کتے فی سی فورس کو معلوم ہو کہ اس کا جواب تم پڑھنے کے بجائے کانوں سے سنو گے"، اور اسی روز وہ اپنی فوج لے کر روانہ ہو گیا اور بازنطینیوں کے ایک شہر ہرکیلیا میں دم لیا، دونوں میں جنگ ہوئی، فی سی فورس کو شکست ہوئی، جس نے توبہ کر کے صلح کی درخواست کی، خراج کی ایک بڑی رقم دینے کا وعدہ کیا، ہارون رشید نے پھر اپنی فراخدلی

اور فیاضی سے کام لیا، صلح کر کے رکہ واپس ہوگیا لیکن وہ اپنی قیام گاہ پر دم لینے بھی نہیں پایا تھا کہ نی سی فورس نے پھر بدعہدی کی، موسم خراب ہوا تو اس نے صلح کو نظرانداز کردیا، ہارون رشید کے علاقہ پر حملہ آور ہوگیا، نی سی فورس کی توقع کے خلاف ہارون رشید برف باری، بادو باراں کا خیال کیے بغیر بڑی سرعت اور عجلت کے ساتھ اس کے سر پر آدھمکا، لڑائی ہوئی تو نی سی فورس زخمی ہوا اور میدان جنگ میں اپنے بے شمار مقتول سپاہیوں کو چھوڑ کر ہارون رشید کے سایہ عاطفت میں پناہ لی اور ایک بار پھر صلح کا جویا ہوا، ہارون رشید نے پھر رواداری اور نرمی سے کام لیا لیکن عیار نی سی فورس نے ایک بار اور بدعہدی کی، لڑائی ہوئی تو پھر اس کو شکست ہوئی اور صلح کا طلبگار رہوا، ہارون رشید نے اس پر بھروسہ کر کے ایک بار پھر نرمی برتی لیکن جب وہ رے میں ایک بغاوت کو فرو کرنے میں مصروف تھا تو نی سی فورس نے ایک بار اور سر اٹھایا، اس مرتبہ رشید کے لڑکے قاسم نے اس کی سرکوبی کی اور ایک بار پھر نی سی فورس کو معاف کردیا گیا۔

ہارون رشید جب ماوراء النہر کی بغاوت کو فرو کرنے میں مصروف تھا تو نی سی فورس دغابازی سے باز نہیں آیا اور عباسیوں کی سرحد کو پامال کر کے بڑی غارت گری اور خوں ریزی کی، اس دغابازی پر عربوں میں جہاد کا جذبہ پیدا ہوگیا، ہارون رشید کو بھی بڑا اشتعال پیدا ہوگیا، اس کے اردگرد ایک لاکھ پینتیس ہزار مجاہد جمع ہوگئے، بڑے تجربہ کار فوجی امرا ساتھ تھے، جن میں یزید ابن مخلد اور شرحبیل بن معن بن زید زیادہ نمایاں تھے، لشکریوں نے بڑے کارنامے انجام دیئے، وہ جس علاقہ سے گذرتے لوگ ان کا خیر مقدم کرتے، شہر کے دروازے کھولتے رہے، اس طرح پورے ایشیائے کوچک کو رومیوں سے خالی کرالیا گیا، وہ بحر اسود تک پہونچ گئے، نی سی فورس نے پھر فوج بھیجی مگر وہ بہت جلد پسپا ہوگئی، ہرکیلیا ہارون رشید کے تسلط میں آ گیا تو یونانی پھر معافی کے خواہاں ہوئے، ہارون رشید کی فراخ دلی اور نرمی پھر ابھری اور ان کو معاف کر کے ان کو امان دے دیا، مسلمان مورخین لکھتے ہیں کہ ہارون رشید کی یہ رواداری اس کی بے جا فیاضی اور دلداری کا نتیجہ تھی، اگر اس وقت عربوں کا قبضہ قسطنطنیہ پر ہوگیا ہوتا تو دنیا کے تمدن اور امن وامان کا نقشہ اس وقت تک کچھ اور ہوجاتا، یونانیوں سے

پھر فراخ دلانہ صلح کر لی گئی، فی سی فورس نے خراج ادا کرنے کا وعدہ کر لیا لیکن ۸۰۸ء میں اس نے پھر دغا دی اور مسلمانوں کے تاخت و تاراج کے لیے آگے بڑھا، اس وقت ہارون رشید خراسان کی ایک فوجی مہم میں تھا ایک بار پھر مذہبی جوش و خروش ابھرا، ہارون رشید کو خیال ہوا کہ نرمی اور رواداری اب کام نہ دے سکے گی، فی سی فورس کو عبرت ناک سزا دینے کے لیے تیار ہوا، رکہ کو اپنے بیٹے قاسم کے سپرد کیا، دوسرے لڑکے امین کو بھی وہاں چھوڑا اور اپنے ایک اور لڑکے کے ساتھ یونانیوں کی طرف بڑھا لیکن طوس کے قریب صانع آباد پہونچا تو بیمار پڑا اور اللہ کو پیارا ہوا۔ (ابن اثیر ج ۶ ص ۶۱-۶۰، تاریخ اسلام ج ۳ از شاہ معین الدین احمد ندوی ص ۱۰۵-۱۰۴، امیر علی ہسٹری آف سرا سینز ص ۲۴۶-۵۱)

شارلیمین اور ہارون رشید: ہارون رشید کا معاصر شارلیمین تھا جو فرانس کا بڑا مشہور فرماں روا (۸۱۴ء-۷۴۲ء) گذرا ہے، وہ چارلس اعظم کے نام سے مشہور تھا اس نے بڑی قوت حاصل کر لی تھی، اس کی فتوحات کی بڑی دھوم ہے، اس نے سیکسن ایواری، لمبارڈ، وسطی یورپ کے جرمن قبیلوں اور شمالی اٹلی کو اپنے زیر نگیں کر کے ایک بڑی سلطنت بنالی تھی، اپنی فوجی مہم میں بڑے مظالم کرتا رہا، سیکسن کے خلاف ۷۷۲ء سے ۸۰۴ء تک لڑتا رہا، اس لشکر کشی میں اس نے ایک روز ساڑھے چار ہزار سیکسن کو تہ تیغ کیا، شمالی سیکسنی اور نارول کو تباہ و برباد کرنے میں وہاں کی عورتوں اور بچوں کو گھسیٹ کر ان کے گھروں سے نکلوا دیا اور جلا وطن کیا، اس کی تفصیل کمبرج مڈیول ہسٹری جلد دوم میں پڑھی جا سکتی ہے، اس نے بوریا میں ۷۹۱ء میں فوج کشی کی تو اس کے سپاہیوں نے وہاں بڑے بڑے مظالم کیے، وہ بڑا عیاش بھی تھا، اس کے محل میں نو بیویاں تھیں، ان میں ایک فیس ٹراڈا بڑی ہی سفاک تھی، اس کی سفاکی سے عاجز آ کر شارلی نین کے خلاف بغاوت ہوئی، جس میں اس کا ناجائز لڑکا پی پن بھی شریک تھا، بغاوت فرو کی گئی تو پی پن قید میں ڈال دیا گیا جہاں وہ اپنی موت تک بند رہا۔

اپنی سلطنت کے حدود بڑھانے کی ہوس میں اس کی نظر اندلس کے عرب حکمراں پر بھی پڑی، وہاں کے شاہی خاندان میں کچھ اختلاف ہوا تو اس نے ۷۷۸ء میں اندلس پر بھی فوج کشی کر دی لیکن اندلس کے عربوں نے اس سے ٹکر لے کر اس کو واپس ہونے پر مجبور کیا

واپسی میں اس کی پوری فوج تباہ ہوگئی۔

ہارون رشید نے اس کی تمام کمزوریوں کے باوجود اپنی رواداری میں اس سے اچھے تعلقات رکھے اور اس کے پاس تحائف بھیجتا رہا، ان میں ایک گھڑی بھی تھی جس میں چھوٹے چھوٹے بارہ دروازے تھے، ہر گھنٹہ کے گذرنے پر گھنٹوں کی تعداد کے مطابق یہ دروازے کھلتے تھے اور اسی تعداد کے مطابق تانبے کی گولیاں ایک آہنی توے پر گر کر آواز دیتی تھیں، یہ دروازے برابر کھلے رہتے تھے یہاں تک کہ جب دورہ پورا ہو جاتا تھا تو بارہ سوار دروازوں سے نکل کر گھڑی کی بالائی سطح پر چکر لگاتے تھے، ہارون رشید نے شارلیمین کو جو تحفے بھیجے تھے وہ فرانس کے معبد پانیتون میں شاید اب تک موجود ہیں لیکن گھڑی کا پتہ نہیں۔ (مقالات شبلی ج ۶ ص ۳۸-۲۳۷)

ہارون رشید کی رواداری: ہارون رشید نے اپنی رواداری میں ۸۰۱ء میں یروشلم کے عیسائیوں کو شارلی مین کی نگرانی اور اقتدار میں دے دیا تھا، اس کے باوجود اندلس کے عربوں کی حکومت اس کی نظروں میں کھٹکتی رہی، اس کے خلاف اس کی فوجی مہم جاری رہی لیکن وہاں کی طاقت ور حکومت سے بازی نہ لے جا سکا ۸۱۰ء میں الحکم سے صلح کر کے خاموش ہو گیا۔ (انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا گیارہواں اڈیشن عنوان شارلی مین ہسٹری آف سرا سینز امیر علی ص ۲۷۸، مقالات شبلی ج ۶ ص ۳۸-۲۳۷)

ہارون رشید اپنے پیچھے رواداری، فراخ دلی، نیک نامی، سیرت کی بلندی اور کردار کی پاکیزگی کا ایک ایسا نمونہ چھوڑ گیا ہے جس کا مقابلہ اور موازنہ دنیا کے بہتر سے بہتر فرماں رواؤں سے کیا جا سکتا ہے، قاضی امام ابو یوسفؒ نے اس کے لیے ایک کتاب لکھی جو کتاب الخراج کے نام سے مشہور ہوئی، اس میں انھوں نے حکمرانی کے رموز بتائے جہاں اور باتیں لکھی ہیں وہاں ہارون رشید کے لیے یہ نصیحتیں بھی تھیں۔

امیر المومنین کو اللہ تعالیٰ نے بہت بڑی ذمہ داری سپرد کی ہے، اس کا ثواب بھی بہت بڑا ہے اور عذاب بھی، اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس امت کا ذمہ دار بنایا ہے تو اس کے ذریعہ آپ کو آزمائش میں مبتلا کیا ہے، اگر تقوی نہیں تو اس کے بغیر کسی چیز کی بنیاد مستحکم نہیں

ہو سکتی، تقوی احتیاط سے حاصل ہوتا ہے، جو شخص خدا کے لیے تقوی اختیار کرتا ہے خدا اس کو بچاتا ہے، بادشاہوں کو اللہ کے سامنے اسی طرح جوابدہ ہونا پڑتا ہے جس طرح چرواہا اپنے مالک کے سامنے ہوتا ہے، آپ حق وانصاف قائم کریں اگرچہ تھوڑی دیر ہی سہی، قیامت کے دن اللہ تعالی کے نزدیک سب سے خوش قسمت وہ راعی ہوگا جس کے ذریعہ اس کی رعایا کو خوش بختی حاصل ہو، کج روی اختیار کرنے سے رعایا بھی سیدھی راہ سے ہٹ جاتی ہے، اللہ کا خوف ہمیشہ نگاہ میں رہے جس کے بعد ملامت کرنے والوں کا خوف نہیں رہتا ہے، خراج کے عمال کو مقرر کرتے وقت یہ خیال رکھا جائے کہ وہ صالح، پاک دامن اور معتبر ہوں، وہ ظالم نہ ہوں، خراج ادا کرنے والوں کی تحقیر نہ کریں، نافرمانوں کے ساتھ سختی ضرور کریں مگر ذمیوں کے ساتھ عدل، مظلوموں کے ساتھ انصاف، ظالموں پر درشتی اور عام لوگوں سے درگذر کا طریقہ اختیار کریں، اگر کسی عامل یا والی کے متعلق ظلم، رعایا کے مال میں خیانت، حرام خوری یا بدکرداری ثابت ہو جائے تو اس کو عہدہ پر برقرار رکھنا، اس سے مدد لینا، رعایا کے معاملہ میں اس کو مختار بنانا اور حکومت کے معاملات میں شریک کرنا حرام ہے، اس کو ایسی عبرت ناک سزا دینا چاہیے جس سے دوسروں کو سبق ہو اور کوئی آیندہ ایسے کاموں کی جرأت نہ کرے، سرکاری خبر رساں اور پرچہ نگار بھی ثقہ اور عادل ہوں تاکہ وہ حکام کی کوئی خبر نہ چھپانے پائیں اور نہ اس میں اپنی طرف سے کوئی اضافہ کریں۔ (کتاب الخراج میں یہ علاحدہ علاحدہ لکھے ہوئے ہیں جن کو تاریخ اسلام ج ۳ ص ۱۲۱-۱۲۹ شایع کردہ دار المصنفین میں اور زیادہ تفصیل سے جمع کر دیا گیا ہے۔)

ہارون رشید نے کتاب الخراج ہی کے تمام وصایا کو اپنی حکمرانی کا رہنما اصول بنایا اور یہی صحیح اسلامی تعلیمات تھیں جن پر عمل کر کے اس نے اپنے دور حکومت کو زریں اور اپنے کردار کو بہترین بنا دیا تھا، اس کا اعتراف یورپی مورخین بھی کرتے ہیں۔

ہارون رشید (۸۰۹ء-۷۸۶ء) کے بارہ میں ایک انگریز مورخ رقم طراز ہے کہ اس کے نام کے ساتھ عادل لکھا جاتا، وہ بہادر، فیاض اور فراخ دل تھا وہ مطلق العنان ضرور تھا مگر اس نے اپنی مطلق العنانی کو غلط مصرف میں لانے کی لالچ کبھی نہیں کی، اس نے جو کچھ کیا

اس کی رعایا کبھی اس سے آزردہ نہیں ہوئی، اس کی حکومت کا واحد مقصد یہ رہا کہ اس کی رعایا خوش رہے، وہ نیکیوں اور خوبیوں کو پسند کرتا اور جب کبھی اس کو بھلائی کرنے کا موقع آیا تو اس نے کبھی اس کو ضایع ہونے نہیں دیا۔ (ہسٹورین ہسٹری آف دی ورلڈ ج ۸ ص ۲۱۰)

مامون الرشید کی رواداری: عباسیوں میں مامون الرشید اپنی گوناگوں صفات کے لیے نمایاں رہا، اس کی سیرت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ مجھ کو عفو میں جو مزہ آتا ہے، اگر لوگ جان جائیں تو جرم اور نافرمانی کو میرے پاس تحفہ لے کر آئیں (المامون ص ۱۵۳) اس کے زمانہ میں بھی یونانی عباسیوں کے قلمرو پر یورش کرتے رہے، ان کے شہنشاہ تھیوفی نس نے عباسیوں کی سرحد میں داخل ہو کر بے دردی سے مسلمانوں کا قتل عام کیا، مامون اس کا انتقام لینے کے لیے روانہ ہوا، اس کی فوج تھوفی نس کی سرحد میں پہونچی تو شہنشاہ نے اس کو لکھ بھیجا کہ یہاں تک اس کے آنے میں جو کچھ اخراجات ہوئے ہیں وہ ادا کر دے گا، جس قدر مسلمان ہمارے ملک میں قید ہیں ان کو ہم کسی عوض کے بغیر رہا کر دیں گے اور عباسیوں کے جو شہر رومی فوج سے برباد ہوئے ہیں ان کو وہ مرمت کرا دے گا ان تینوں شرطوں میں سے وہ جس کو پسند کریں اس کے لیے بھی قابل قبول ہوگا جس کے بعد خلیفہ اپنے دارالخلافہ کو واپس ہو جائیں۔

یہ پیام مامون کے پاس پہونچا تو اس نے پہلے تو دو رکعت نماز پڑھی، گویا اس بات کا شکر ادا کیا کہ وہ رومی شہنشاہ دبنے کے لیے تیار ہے پھر اس نے سوچا کہ یہ شرطیں فتح کے مقابلہ میں کم نہیں ہیں، رومی شہنشاہ کو یہ کہلا بھیجا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرح تم سے کہتا ہوں کہ تم اپنا تحفہ اپنے پاس رکھو، یہ بھی قبول نہیں کہ جو مسلمان تمہارے یہاں قید ہیں وہ رہا کر دئے جائیں کیونکہ اگر وہ دین کے لیے لڑنے گئے تھے تو قید ان کے لیے مایہ فخر ہے اور اگر ان کا مقصد دنیا حاصل کرنا تھا تو و. قید ہی کے مستحق ہیں، تیسری شرط بھی منظور نہیں کی کہ قید ہوتے وقت جس مسلمان عورت نے ہائے محمد کہہ کر پکارا ہوگا، اس کی اس دردناک آواز کو روم کے بڑے سے بڑے قلعے کے عوض میں بھی نہیں فروخت کر سکتا۔ (مروج الذہب مسعودی بحوالہ المامون از مولانا شبلی نعمانی ص ۱۱۹-۱۱۸)

اس موقع پر مامون نے رومیوں کے قرہ، ماجدہ، اشناس اور سناد کے رومی قلعوں کو فتح کیا، اس کے بعد وہ دمشق واپس آ گیا لیکن کچھ دنوں کے بعد اس کو خبر ملی کہ رومیوں نے طرطوس اور عصیصہ پہونچ کر مسلمانوں کو بے رحمی سے قتل کرایا، مامون پھر ان سے محاذ آرائی کے لیے روانہ ہوا، اس کے سپہ سالاروں نے اس مہم میں رومیوں کے تقریباً تیس قلعے فتح کیے اور مامون کی فوج بڑھتی ہوئی شہنشاہ روم سے معرکہ آرا ہوئی، ایک سخت جنگ کے بعد وہ پسپا ہوا، صلح کی درخواست کی لیکن کچھ دنوں کے بعد یہ رومی پھر برسر پیکار ہوئے تو مامون نے فوج کشی کر کے قلعۂ لولو پر قبضہ کرلیا پھر حفظ ما تقدم کی خاطر حدود روم کے قریب طوانہ میں ایک شہر بسایا جس سے تین فرسنگ کے فاصلہ پر شہر پناہ تیار کی گئی اس میں چار صدر دروازے بنائے گئے اور ہر دروازہ پر ایک مستحکم قلعہ تعمیر کیا گیا۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے ابن کثیر ج۶ ص ۱۱۱، المامون از مولانا شبلی نعمانی ص ۱۲۱-۱۱۹، تاریخ اسلام حصہ سوم از شاہ معین الدین احمد ندوی ص ۱۱۶، امیر علی ص ۲۷۳-۲۷۲)

معتصم باللہ کی رواداری: مامون کے جانشین معتصم باللہ (۸۴۱ء-۸۳۱ء) کو بھی یونانیوں سے سخت جنگ کرنی پڑی، وہ معتصم کے علاقہ زبطرہ پر پونے دو لاکھ لشکری سے حملہ آور ہوا، بہت سے شہر جلا کر خاک کر دئے، عورتوں اور بچوں کو زبردستی پکڑ کر اپنی غلامی میں لے لیا، معتصم کی جائے پیدائش زبطرہ تھی، اس کو راکھ کا ڈھیر کر دیا، وہاں کے لوگوں کی آنکھوں میں آتشیں سلاخیں بھونک کر اندھا کر دیا، اوروں کا مثلہ کر دیا، معتصم باللہ اس کا انتقام لینے کے لیے روانہ ہوا یہاں پر یہ واقعہ لکھنے کے قابل ہے کہ اس مہم پر کوچ کرنے سے پہلے معتصم ایک مسافر کی ضرورت کے قدر سامان لے کر دربار عام میں آیا اور بغداد کے قاضی عبدالرحمٰن بن اسحٰق شعبہ ابن سہل اور ان کے ساتھ تین سو اٹھائیس دوسرے حکام دولت کو بلا کر ان کے روبرو وصیت کی کہ میری جاگیر کا ایک ثلث میری اولاد کو اور ایک ثلث میرے موالی کو دیا جائے گا اور تیسرا ثلث خدا کی راہ میں صرف کیا جائے، وہ اپنی لشکرکشی میں تھیوفی لس کی جائے پیدائش تک پہونچ گیا اور جس طرح اس کی جائے پیدائش کو راکھ کا ڈھیر بنا دیا گیا تھا اسی طرح اس نے بھی اس جگہ کو برباد کر دیا، معتصم اس لشکرکشی میں یونانیوں پر آخری ضرب کاری لگا کر ہمیشہ

کے لیے معاملہ ختم کر دینا چاہتا تھا، رومیوں سے اس کے فوجی سرداروں کی کئی لڑائیاں ہوئیں، آخر میں تھیونینس پسپا ہوا تو اس نے جھلا کر اپنی پسماندہ فوجوں کا سر قلم کرا دیا، ان کو کوڑوں سے پٹوایا، اس کے بعد پھر رومیوں نے معتصم کی فوج سے عموریہ میں سخت مقابلہ کیا لیکن ان کو پھر شکست ہوئی اور جب معتصم کی فوج اس میں داخل ہورہی تھی تو لوٹ مار شروع کر دی مگر معتصم نے اس کو سختی سے روک دیا، عموریہ کی فتح کے بعد وہ قسطنطنیہ پر حملہ کرنا چاہتا تھا تاکہ رومیوں کی وجہ سے عباسیوں کا دردسر ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے مگر وہ ایسا نہ کر سکا۔ (تفصیل کے لیے دیکھو ابن اثیر ج ٦ ص ١٦٦-١٦٢، تاریخ اسلام از جناب شاہ معین الدین احمد ندوی حصہ سوم ص ٢٠٤-١٩٩) اس کی سلطنت کے اندر عربوں اور ترکوں کی آویزش کی وجہ سے اس کو مراجعت کرنی پڑی (ابن اثیر ج ٦ ص ٦٦، تاریخ اسلام حصہ سوم از جناب شاہ معین الدین احمد ندوی ص ٢٠٤-٢٠٢، امیر علی ص ٢٨٤-٢٨٥)

آئندہ یہ رومی عباسیوں کے بجائے سلجوقیوں سے برسرِ پیکار رہے، عباسیوں اور رومیوں کی محاذ آرائی پر تبصرہ کرتے ہوئے موسیو لیبان نے لکھا ہے کہ خلفائے بغداد کی فوجی قوت ان کی شان و شوکت کے مطابق تھی، اس کی عظمت بیرونی ممالک میں اس درجہ کی تھی کہ قسطنطنیہ کے شہنشاہ یونان و روم کے جانشین تھے مگر خلیفہ کو خراج دینے پر مجبور تھے انھوں نے اس خراج سے بچنے کے لیے بہت کچھ کوشش کیں مگر کامیاب نہیں ہوئے۔ (تمدنِ عرب سید علی بلگرامی ص ١٧٢)

صقلیہ میں عیسائیوں کے مظالم: ایشیائے کوچک میں رومی مسلمانوں سے برابر شکست کھاتے رہے تو انھوں نے اپنے حملوں کا رخ سسلی کی طرف پھیر دیا، واثق باللہ بن معتصم کے زمانہ میں رومیوں سے سسلی میں لڑائیاں ہوتی رہیں مگر وہ پسپا ہوتے رہے، متوکل علی اللہ کے زمانہ میں رومیوں نے سسلی میں تقریباً نو حملے کیے، جن میں قتل اور غارتگری کی کوئی حد نہ تھی مگر وہاں کے امیر عباس بن فضل نے ان کو برابر شکست دی، رومیوں سے بری اور بحری لڑائیاں ہوتی رہیں اور جب وہ آخری بار کامیاب ہوکر قرتنہ کی طرف بڑھ رہا تھا تو اس کے لیے پیامِ اجل آگیا، اسی علاقہ میں دفن کر دیا گیا، رومیوں نے اپنی شکست کا بدلہ اس طرح لیا کہ

انھوں نے قبر کھود کر اس کی لاش بے رحمی سے جلا ڈالی (ابن اثیر ج۷ ص۲۱-۲۰، تاریخ اسلام مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی حصہ سوم ص۲۳۵) ایک موقع ایسا بھی آیا کہ کرکرہ کے عیسائیوں نے اپنے بشپ کو اس سے عاجز آ کر متوکل کے موالی کے حوالہ کر دیا، شہنشاہ روم نے اس کے بدلہ میں ایک مسلمان رہا کر کے بطریق کو چھڑایا، اس کے بعد فضل بن قاران نے ایک بحری جنگ کر کے انطاکیہ پر قبضہ کر لیا، منتصر باللہ کے زمانہ میں رومیوں سے سسلی میں جنگ ہوئی لیکن وہ مغلوب کیے گئے۔

اور جب عباسیوں کی سلطنت کمزور ہوتی گئی تو سسلی پر عیسائیوں کا تسلط ہو گیا اور جس بے رحمی سے وہاں کے مسلمانوں کو جلاوطن کیا یا راکھ کا ڈھیر بنا دیا گیا اس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔

غیر قوموں کے ساتھ عباسیوں کی عام رواداری: میدان جنگ سے ہٹ کر قلمرو حکومت کے اندر دوسری قوموں کے ساتھ عباسیوں کی جو عام رواداری رہی ذرا اس کی بھی تھوڑی سی جھلکیاں ناظرین دیکھ لیں۔

مولانا شبلی لکھتے ہیں:

> ''مامون کے عہد میں دوسری قوموں کو جو حقوق حاصل تھے، مہذب سے مہذب گورنمنٹ میں بھی اس سے زیادہ نہیں ہو سکتے، یہود، مجوس، عیسائی، لا مذہب اس کی وسیع حکومت میں نہایت آزادی سے بسر کرتے تھے، خاص دارالخلافہ بغداد میں بہت سے گرجے نئے تعمیر ہوئے جن میں رات دن ناقوس کی صدائیں گونجتی رہتی تھیں، دربار میں ہر مذہب وقت کے علما و فضلا حاضر رہتے تھے اور مامون ان کے ساتھ نہایت عزت و توقیر سے پیش آتا تھا، جبرئیل بن بختیشوع ایک عیسائی تھا وہ اس کی اس قدر توقیر کرتا تھا کہ عام حکم دے دیا تھا کہ جو شخص کسی ملکی عہدہ پر مقرر کیا جائے، جبرئیل کی خدمت میں حاضر ہو، خراسان میں جو کالج بنوایا تھا اس کا پرنسپل یعنی مہتمم اعظم ایک عیسائی کو مقرر کیا جس کا نام یسوع تھا۔'' (المامون ص۱۵۸)

مولانا شبلیؒ نے اس سلسلہ میں ایک عجیب وغریب واقعہ لکھا ہے، مامون کے ایک عزیز کا دوست عبدالمسیح بن اسحٰق کندی تھا، مامون نے اس کو نہایت نرم لفظوں میں ایک دوستانہ خط لکھ کر اس کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی، عبدالمسیح نے اس کا جو جواب دیا وہ نہایت اشتعال انگیز تھا، اس کو عیسائیوں نے بعد میں ایک رسالہ کی صورت میں شائع کر دیا جو مولانا شبلی کی نظر سے گذرا، اس کو پڑھ کر وہ لکھتے ہیں کہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت جو الفاظ لکھے تھے ان کو پڑھ کر دل کانپ اٹھا مگر مامون کے سامنے یہ خط پیش ہوا تو اس نے پڑھ کر اس پر یہ لکھ دیا کہ جو مذہب دنیا کے کام کا ہے وہ زرتشت کا مذہب ہے، جو محض آخرت کے لیے مفید ہے وہ عیسائی مذہب ہے لیکن دین ودنیا دونوں کے لیے جو مذہب موزوں ہے وہ اسلام ہے۔ (المامون ص ۱۵۹-۱۵۸)

بعد کے عباسی خلفاء میں خلیفہ المعتصم باللہ (۲۱۸ھ-۲۲۷ھ مطابق ۸۳۳ء-۸۴۱ء) ایک عیسائی حکیم سلمویہ کی بیماری میں خود عیادت کو جاتا تھا اور جب اس نے انتقال کیا تو ایک دن کھانا نہیں کھایا اور حکم دیا کہ اس کا جنازہ دارالخلافہ میں لا کر رکھا جائے اور اس کے عزیز بخور وشمع کے ساتھ عیسائیوں کے طریقہ کے موافق اس پر نماز پڑھیں۔ (المامون ص ۱۶۲)

معتضد باللہ (۲۷۹ھ-۲۸۹ھ مطابق ۸۹۲ء-۹۰۴ء) کے دربار میں جہاں تمام وزراء اور امراء دست بستہ کھڑے رہتے تھے وہاں وزیر اعظم اور ثابت بن قرہ کو جو ایک صابی المذہب عالم تھا، بیٹھنے کی اجازت تھی، ایک دن معتضد اور ثابت بن قرہ ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ٹہل رہے تھے کہ دفعۃً معتضد نے ہاتھ کھینچ لیا ثابت ڈر گیا، معتضد نے کہا: ڈرو نہیں، میرا ہاتھ اوپر تھا میں نے گستاخی پسند نہ کی، اہل علم کا ہاتھ اوپر چاہیے۔ (المامون ص ۱۶۲)

طائع باللہ (۳۶۳ھ-۳۸۱ھ مطابق ۹۷۴ء-۹۹۱ء) کے دور میں عضد الدولہ دیلمی خلافت بغداد کی قسمت کا مالک بن گیا تھا اس کا وزیر اعظم نصر بن ہارون ایک عیسائی تھا، اسی نے عضد الدولہ کی خاص اجازت سے تمام ممالک اسلامی میں گرجے تعمیر کرائے۔ (المامون ص ۱۶۰)

اسی سلسلہ میں مولانا شبلی لکھتے ہیں علامہ شریف الرضی مسلمانوں کے ایک بڑے

فرقہ کے پیشوا تھے، ابواسحٰق صابی کی وفات پر بڑا دردانگیز مرثیہ لکھا اور جب اس کے مزار کی طرف سے گذرتے تو اس کی تعظیم کے لیے سواری سے اتر پڑتے تھے اور پیادہ آگے بڑھتے۔ (المامون ص ۱۶۲)

مقتفی لامراللہ کی رواداری: یہ ۵۳۰ھ سے ۵۵۵ھ یعنی ۱۱۳۵ء سے ۱۱۶۰ء تک عباسی خاندان کا فرماں روا رہا، اس نے عباسیوں کی زوال پذیر حکومت کو ازسرنو ترتیب دیا اور خلافت کا وقار اور اثر پیدا کرنے میں کامیاب رہا، اس کے زمانہ میں نسطوری عیسائیوں کے چیئر پارک عبدشیوسوم نے عیسائیوں کی طرف سے ایک درخواست دی، اس پر ایک فرمان جاری کیا گیا جو اس زمانہ کے فن محاضرہ کی ایک کتاب تذکرہ مرتبہ ابن خلدون میں درج ہے، اس کی عبارت بہت ہی پر تکلف ہے، آدھے فرمان میں حمد و نعت ہے پھر امیر المومنین کی حکومت کی برکت اور عدل پروری کا ذکر ہے، اس کے بعد یہ کہا گیا ہے کہ

> ''چونکہ خدا نے امیر المومنین کو اپنے بندوں کے معاملات کا منتظم بنایا ہے اور اپنی زمین اور اپنے بلاد کا بار اس پر ڈالا ہے، اس لیے وہ اپنی رعایا پر نہایت باخبر آنکھوں سے حکومت کرتا ہے اور ان کی فلاح کی نہایت خبر گیری کے ساتھ حفاظت کرتا اور ان کی بہبود کے لیے اس توجہ سے کام کرتا ہے کہ وہ ان کے تمام اندیشوں کو مٹا دیتا ہے اور ان کی رسیوں کو جوڑ دیتا ہے اور ان کی چراگاہوں کو گھاس سے بھر دیتا ہے اور ان کی تمام دلی خواہشوں کو پورا کر دیتا ہے، اس کی توجہ مسلمانوں ہی پر نہیں ہے بلکہ وہ تمام لوگ جن کے ساتھ امیر المومنین کا معاہدہ ہے خواہ وہ دور ہوں یا نزدیک اور رعایا کے مختلف طبقوں میں سے جو اہل کتاب اس عہد کا محافظت کی شرائط میں داخل ہیں جس کی شریعت نے ذمیوں کے متعلق ذمہ داری لی ہے اس کا (خلیفہ کا) ظل عاطفت ان سب تک پہونچتا ہے، چنانچہ ان کی آنکھیں ان کے کان اس کے گواہ ہیں۔''

اس کے بعد فرمان میں یہ ہے:

''تجھ کو اس تحریر کے ذریعہ سے تمام نسطوری عیسائیوں کا ''جاتلیق'' مقرر کیا جاتا ہے جو دارالاسلام (بغداد) اور دیگر بلاد اسلام میں آباد ہیں، تجھ کو ان کا سردار بھی بنایا جاتا ہے اور نیز یونانی، یعقوبی اور ملکیہ فرقوں کا بھی، خواہ ان کی نمایندگی کی گئی ہو یا نہ کی گئی ہو اور جو ان نسطوریوں کے ساتھ کسی دوسرے ملک میں مخالفت رکھتے ہیں، تیرے تمام اہل مذہب میں صرف تجھ کو گرجاؤں اور مذہبی جلسہ گاہوں میں کیتھولیک کے نشانات پہننے کا اختیار ہے، کسی ارچ، بشپ یا ڈیکن کو ان کے پہننے کا یا ان میں شرکت کرنے کا استحقاق نہ ہوگا کیونکہ یہ اس بات کی نشانیاں ہیں کہ وہ اس عالی منصب اور عزت کے ماتحت ہیں جو تجھے بخشی گئیں، اگر ان عہدیداروں میں کوئی تیرے ساتھ مخاصمت یا اختلاف کرے گا یا تیرے احکام سے بغاوت کرے گا اور تیرے فیصلوں کو نہ مانے گا اس پر مقدمہ چلا کر سزا دی جائے گی، تاآنکہ وہ باز آجائے اور اس کی ضدمٹ جائے تاکہ دوسروں کو ایسا کرنے کی جرأت نہ ہو، تمہارے قوانین کے احکام کلیۃً محفوظ ہیں، امیر المؤمنین اپنے پیشرو ائمہ سے مستند طریق عمل کے اتباع میں جو انھوں نے تیرے پیشرو جاتلیقوں کے ساتھ برتتے تھے، قانونی حقوق تیرے پیرووں کو عطا کیا ہے کہ تیری جان، تیرے مال اور تیری قوم کی حفاظت کی جائے گی، تمہاری بہبود کی ترقی میں کوشش کی جائے گی، تمہارے طریق دفن وکفن کا احترام کیا جائے گا، تمہارے گرجاؤں اور خانقاہوں کی حفاظت کی جائے گی، اس معاہدہ کی شرائط کی تعبیر میں ہم اس طریق عمل کے پابند ہیں جو اپنے اصول کے سخت پابند (ارتھوڈکس) خلفا کا تھا، جس کی اتباع ہمارے ائمہ اسلاف رضی اللہ عنہم کرتے رہے، یہ کہ ہم تم سے راضی رہیں گے، بشرطیکہ جزیہ ادا کرتے رہو جو تمہارے عاقل بالغ اور ذی مقدور مردوں سے لیا جائے گا، نابالغ مرد اور عورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں، یہ ٹیکس شرع کے رحیمانہ اصول کے

تحت پابندی کے ساتھ سال میں ایک مرتبہ وصول کیا جائے گا، امیر المومنین
نے اپنی مہربانی سے عیسائیوں کے مختلف فرقوں کی نزاعات میں حکم بننا منظور
کرلیا ہے تاکہ زبردست سے زبردست کا انصاف حاصل کیا جائے اور
گمراہوں کو راہ پر لایا جائے اور ان کی مذہبی ضروریات کے لحاظ سے ان کی
خبر گیری کی جائے اور وہ اپنے مذہب پر صاف اور سیدھی راہ سے عمل کرسکیں
ان انعامات کا جو تجھ کو عطا کیے گئے ہیں مستحق ہیں جو تیری روح کی خواہشوں
کو پورا کرتے ہیں، امیر المومنین کے لیے شکر گذاری، احسان مندی اور
دنیاداری کے ثبوت میں دعا اور طلب رحمت کیا کرو۔''

اس فرمان میں نسطوری عیسائیوں کو جو رعایتیں دی گئیں، وہ وہی ہیں جن کی تعلیم اسلام نے دی ہے اور جس پر خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین عمل پیرا رہے جیسا کہ گذشتہ اوراق میں ذکر آچکا ہے مگر ہمارے عیسائی مورخین اور مصنفین اپنے تعصب کی وجہ سے ان کا صحیح مطالعہ نہیں کرتے، اس لیے اپنی عدم واقفیت کی وجہ سے زہریلی تحریریں لکھ جاتے ہیں مگر اس تحریر کو ۱۹۲۵ء میں انگریزوں نے اخباروں میں بہت مشتہر کیا، اس کی اشاعت کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے علاقوں میں جو عیسائی رہ گئے ہیں ان کو اسی قسم کی رعایتیں دی جائیں اور پھر یہ بھی دکھانا مقصود تھا کہ عرب جو رعایتیں دیتے رہے وہ ترک اپنی دولت عثمانیہ میں نہیں دیتے، اس سے عربوں اور ترکوں میں اختلاف پیدا کرنا بھی تھا، حالانکہ ترکوں نے جس فراخدلی سے اپنی عیسائی رعایا کو رعایتیں دیں اس کا ذکر پہلے آچکا ہے مگر اس تحریر کو اچھالنے میں ڈاکٹر منگانا بہت پیش پیش رہے، وہ انگلستان کے ایک کتب خانہ کے قلمی نسخوں کے نائب ناظر تھے مگر اسلام کے سخت ناقد اور معاند تھے، اپنے عناد کو اس طرح بھی ظاہر کیا کہ انھوں نے اپنے کتب خانہ سے قرآن مجید کا ایک نیا نسخہ نکالا اور یہ مشتہر کرنے کی کوشش کی کہ اس میں دس پانچ جگہیں ایسی ہیں جو مسلمانوں کے مروجہ قرآن مجید سے مختلف ہیں، اس پر ہنگامہ ہوا تو پتہ چلا کہ کسی عیسائی نے یہ تحریف کرکے فتنہ برپا کرنا چاہا، یہ ہنگامہ کسی طرح فرو ہوا تو انھوں نے پھر ۱۹۲۵ء میں سریانی خط میں لکھا ہوا قرآن مجید کا

ایک نسخہ نکال کر اس میں اختلافات دکھائے مگر اس کے متعلق بھی یہی پتہ چلا کہ یہ کسی عیسائی کا لکھا ہوا ہے، بہر حال ان ہی ڈاکٹر منگانا نے مذکورہ بالا فرمان پر اپنے ان خیالات کا اظہار کیا:

''یہ ضرورت ہمیشہ محسوس کی جاتی ہے کہ ایک مستند بیان اس کے متعلق پیش کیا جائے کہ جس زمانہ میں اسلام کے ہاتھ میں لاکھوں عیسائیوں کی موت وحیات کا فیصلہ تھا اسلام اور عیسائیت کے درمیان سرکاری روابط کس قسم کے تھے، انفرادی حیثیت سے ممکن ہے کہ عیسائیوں کو مسلمانوں کے ہاتھ سے ایذائیں پہونچی ہوں، ایسی مثالیں تاریخ میں بھی کہیں کہیں ملیں گی کہ کسی صوبہ کے گورنر یا قاضی کے مذہبی جنون میں یا کسی نیم دیوانہ شیخ اور ملا نے اپنے کسی مجنونانہ تخیل کی بنا پر عیسائیوں پر ظلم کیے ہیں، خلفا میں سے بھی ایک دو نے مثلاً متوکل نے ضرور عیسائیوں کے خلاف بعض تکلیف دہ احکام نافذ کیے تھے لیکن ان واقعات کو اگر چہ ان کی تعداد کسی قدر زیادہ ہو اصول مذہب اور قانون کے خلاف سمجھنا چاہیے اور وہ لوگ جن کی وجہ سے یہ واقعات سرزد ہوئے ہیں اسی طرح قانون کی خلاف ورزی کے مجرم تھے، جس طرح ہر مجرم ہوتا ہے، اسلام کا اس بارے میں جو عمل رہا ہے وہ اس چارٹر (سند فرمان) میں صاف الفاظ میں درج ہے جو شک وشبہ کے بغیر اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ باوجودیکہ اسلام کا نظام سلطنت بعض تمدنی امور میں مکمل رہا لیکن اس کا دامن ناروا داری سے پاک تھا، یہ فرمان ایک عباسی خلیفہ کے ایوان حکومت سے جاری ہوا لیکن کیا کوئی انگریز بادشاہ، ڈنمارک کی ملکہ یا فرانس کا صدر اس بیسویں صدی میں اس سے زیادہ روادارانہ فرمان اپنی بے شمار مسلمان رعایا کے حق میں لکھ سکتا ہے، جس طرح انجیل انکویزیشن کے مظالم کی محرک نہیں کہی جاسکتی اسی طرح قرآن کی طرف وہ مظالم منسوب نہیں کیے جاسکتے جو اوائل میں عیسائیوں کے ساتھ بعض اوقات برتے گئے یا قتل عام کے وہ واقعات جو ماضی قریب کی تاریخ میں ہوئے ہیں، سیاسیات،

جاہ پسندی کے ولولے، شخصی اقتدار پسندی اور اقتصادی مصالح مذہب سے
بالکل مختلف چیزیں ہیں۔‘‘

اوپر کی تحریریں استاذی المحترم حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کے اس مضمون سے ماخوذ ہیں جو انھوں نے دسمبر ۱۹۲۵ء کے معارف میں مسلمانوں کی بے تعصبی کی ایک اور دستاویز ڈاکٹر منگانا کی کوشش کے عنوان سے لکھا تھا۔ ڈاکٹر منگانا نے مذکورہ بالا فرمان پر جو تبصرہ کیا ہے اس میں ان کی کوئی ضرور رہی ہوگی، حضرت سید صاحبؒ نے اس پر یہ مصرع لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کیا۔

عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد

پھر ڈاکٹر منگانا کی آخری سطروں کے متعلق یہ تحریر کیا کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی آخری سطروں میں جو کچھ فرمایا ہے، اس کے بدلہ میں یہ لکھتے تو اچھا تھا کہ جن صدیوں میں عیسائی مسلمان ملکوں میں اس امن و آسایش سے رہتے تھے ان صدیوں میں مسلمان عیسائی ملکوں میں کس طرح رہتے تھے، کیا ان کے لیے ممکن تھا کہ وہ یورپ کے کسی ملک میں اس عہد میں گذر سکیں۔

عباسیوں کی علمی رواداری: عباسیوں کا دور علمی رواداری کے لحاظ سے بہت نمایاں ہے اس کی ابتدا ابوجعفر منصور ہی کے زمانہ (۷۵۴ء-۷۷۵ء) سے ہوگئی تھی، جو عقل و دانش، سیاست و تدبر، جرأت و دلیری اور سطوت و جبروت کا پیکر سمجھا جاتا تھا، وہ بڑی بڑی پیچیدہ گتھیوں کو ناخن تدبیر سے سلجھا لیتا تھا، وہ حکومت کے باغیوں کے مقابلہ میں سخت بلکہ ظالم تھا لیکن امن پسندوں اور عام رعایا کے لیے عادل تھا، اس کا قول تھا کہ خلیفہ کو صرف تقوی درست رکھ سکتا ہے، سلطان کو اطاعت اور رعایا کو عدل، جو سزا دینے پر قدرت رکھتا ہے اس کو عفو و درگذر زیادہ مناسب ہے اور وہ بڑا کم عقل ہے جو اپنے زیردستوں پر ظلم کرتا ہے، اس نے اپنے بیٹے مہدی کو یہ وصیتیں لکھ کر دی تھیں کہ حرام اور خوں ریزی سے ہمیشہ بچنا کہ یہ خدا کے نزدیک بڑا گناہ ہے، حلال کو اپنے اوپر لازم کر لینا، اس میں آخرت میں بھی ثواب ہے اور دنیا میں بھی بھلائی ہے، اعتدال سے آگے نہ بڑھنا کہ اس میں ہلاکت ہے، اللہ کا غضب

سب سے زیادہ بادشاہت کے لیے خطرہ ہے، اس نے ایسے شخص کے لیے جو زمین میں فساد پھیلائے دوگنے عذاب اور عقاب کا حکم دیا ہے، اس لیے رخنہ ڈالنے والوں کو سزا دینا، اس سے بھاگنے والوں کی بیخ کنی کرنا اور اس سے نکلنے والوں کو عذاب دے کر قتل کرنا لیکن اللہ نے قرآن میں جو حکم دیا ہے اس سے تجاوز نہ کرنا، عدل کے ساتھ حکومت کرنا، اپنی حد سے نہ بڑھنا۔ (ابن کثیر ج ا ص ۱۲۶، طبری ج ۱۰ ص ۴۴۷، تاریخ اسلام حصہ سوم از شاہ معین الدین احمد ندوی ص ۶۰-۵۵)

اس نے اسلامی علوم وفنون کے فروغ میں جہاں ہر قسم کی کوشش کی، وہاں دوسری قوموں اور زبانوں کے علوم سے بھی دلچسپی لی، اس نے قیصر روم سے یونانی کتابوں کی فرمائش کی، جس نے اس کے پاس اقلیدس اور طبیعیات کی کتابیں بھیجیں، ان کے ترجمے عربی میں کرائے، اس کے زمانہ میں طب اور فلسفہ کی نادر کتابیں جمع کی گئیں اور ان کے ترجمے عربی میں ہوئے، عبداللہ بن المقفع مجوسی تھا جب اس نے اسلام قبول کیا تو منصور نے اس کو اپنے دربار کا میر منشی مقرر کیا، وہ مختلف زبانوں کا ماہر تھا، اسی نے کلیلہ ودمنہ کا ترجمہ عربی میں کیا اس نے یونانی زبان کی کتابوں میں قاطیغوریاس، یاریناس، انالوطیقا کے ترجمے عربی میں کیے، مصری زبان کی کتاب ایساغوجی کا ترجمہ بھی اسی نے کیا، فارسی زبان کی کتابوں میں فدائی نامہ، آئین نامہ، یزدک نامہ اور نوشیروان نامہ کے عربی ترجمے اسی کے کیے ہوئے ہیں، پارسیوں کی علم الاخلاق کی دو مشہور کتابوں الادب الکبیر اور الادب الصغیر کے عربی ترجمے اسی نے کیے، منصور کے دربار کا بہت بڑا صاحب اثر امیر ابخت تھا جو آتش پرست تھا، منصور کے ہاتھ پر اسلام لایا تو دربار کے اکابر دولت میں شمار کیا جانے لگا، اس کا خاندان ایک مدت تک علم وفضل کا سرپرست رہا، ان کی بدولت فارسی زبان کے بہت سے ذخیرے عربی میں منتقل ہوئے۔

جارج بن جبرئیل عجمی عیسائی تھا لیکن منصور کے زمانہ کا بہت بڑا مترجم تھا وہ طبیب بھی تھا، منصور نے اس کو اپنے علاج کے لیے طلب کیا، اس کی دوا سے اس کو شفا ہوئی تو وہ افسر الاطباء مقرر کیا گیا، اس کا تمام خاندان دربار سے منسلک ہو گیا، جارج جب مرض الموت

میں مبتلا ہوا تو وطن واپس جانا چاہا، منصور نے اس کو سفرخرچ پچاس ہزار روپئے عنایت کیے، جارج کی کوشش سے طب کا بڑا ذخیرہ عربی زبان میں منتقل ہوا، اس نے ایک عمدہ کتاب تجربیات پر سریانی زبان میں لکھی، جس کا عربی ترجمہ حنین بن اسحاق نے کیا، منصور کے دربار میں طب کی کتابوں کا مشہور مترجم ایک عیسائی بطریق نامی تھا، اس نے منصور کے حکم سے یونان کی بہت سی کتابوں کا ترجمہ کیا، بقراط اور جالینوس کی تصنیفات کے جو ترجمے اس نے کیے بہت دنوں تک متداول رہے، منصور قیصر روم کو خط لکھ کر فلسفہ کی کتابیں منگواتا، اس کی علمی سرپرستی کی شہرت ایسی پھیلی کہ ہر قوم وملت کے لوگ اس کے دربار میں آنے لگے، ہندوستان کا ایک بہت بڑا ریاضی داں اس کے دربار میں پہونچا تو اس نے علم ہیئت میں سنسکرت کی مشہور کتاب سدھانتا پیش کی، اس کے حکم سے محمد بن ابراہیم فزاری نے اس کا ترجمہ عربی میں کیا، اس کے عہد میں فرقہ مانویہ اور فرقہ دیسان مرقون کی کتابیں بہت پھیل گئیں تو لوگوں میں ایسی مذہبی آزادی پیدا ہوگئی کہ وہ الحاد کی طرف مائل ہونے لگے اور مانی کے مذہب کی تائید میں کتابیں لکھنے لگے، منصور نے اس آزادی پر کوئی پابندی عائد نہیں کی، لیکن علماء نے ملحدوں کے رد میں کتابیں لکھنی شروع کیں جس سے علم کلام کی بنیاد پڑی۔

ہارون رشید نے تو ایک باضابطہ ادارہ بیت الحکمت کے نام سے قائم کیا، جس میں ہر مذہب کے ماہرین ترجمہ کے لیے مامور کیے گئے، ان میں فضل بن نوبخت مجوسی تھا، وہ فارسی کتابوں کے ترجمے عربی میں کیا کرتا تھا، ہارون رشید نے جب انگوریہ اور اعموریہ وغیرہ کو فتح کیا تو وہاں اس کو بے شمار یونانی زبان کی کتابیں ملیں، اس نے اس زمانہ کے مشہور مترجم یوحنا بن ماسویہ کو ان کے عربی ترجمہ کے لیے مقرر کیا، ہارون رشید ایک ہندوستانی طبیب منگلا کے علاج سے اچھا ہوا تو اس نے اس کو برامکہ کے اسپتال کا مہتمم مقرر کیا، اس سے سنسکرت کی بہت سی کتابیں عربی میں ترجمہ کرائیں، اس سے ویدک کی معلومات عربی زبان میں منتقل ہوئیں۔

برامکہ کا عروج ہارون رشید کے دور حکومت میں زیادہ سے زیادہ ہوا، یہ پہلے بودھ مذہب کے پیرو تھے، ان کا نسلی تعلق ہندوستان سے تھا وہ مسلمان ہوئے تو رفتہ رفتہ عباسیوں کے دور میں اعلیٰ سے اعلیٰ مدارج کو طے کرتے ہوئے وزارت کے منصب تک پہونچ گئے اور

ایسا زمانہ بھی آیا کہ وہی کل دنیائے اسلام پر حکومت کرتے دکھائی دیے، ان کی سرپرستی میں طب، نجوم، ہیئت، ادب اور اخلاق کی بہت سی سنسکرت کتابوں کا عربی میں ترجمہ ہوا۔

اس زمانہ میں علم ہیئت سنسکرت کی کتاب آریہ بھٹ کا ترجمہ عربی میں ہوا۔ (تفصیل کے لیے دیکھو مضمون تراجم از مولانا شبلی نعمانی مقالات جلد ششم)

مامون رشید نے ان سرگرمیوں کو اور بھی بڑھایا، مولانا شبلیؒ نے اپنی کتاب المامون میں کشف الظنون کے حوالہ سے یہ واقعہ لکھا ہے کہ ایک روز مامون نے خواب میں ایک محترم شخص کو تخت پر بیٹھا دیکھا، اس کے پاس جا کر اس نے پوچھا کہ آپ کا اسم مبارک؟ تو اس نے جواب دیا: ''ارسطو!'' مامون پر خوشی کی ایک کیفیت طاری ہوگئی، پھر پوچھا کہ حضرت! دنیا میں کیا چیز اچھی ہے؟ جواب ملا کہ جس کو عقل اچھا کہے، مامون نے پھر درخواست کی کہ کوئی نصیحت ارشاد ہو، جواب ملا کہ توحید اور صحبت نیک ہاتھ سے جانے نہ دینا (المامون ص ۱۶۵) اسی وقت سے اس نے یونانی فلسفیوں کی کتابیں جمع کرنی شروع کیں، قیصر روم سے برسرپیکار ہونے کے باوجود اس کو خط لکھا کہ ارسطو کی جس قدر تصانیف مل سکیں اس کے پاس بھیجی جائیں مگر روم میں فلسفہ اس وقت تک مفقود ہو چکا تھا، بڑی تلاش کے بعد قیصر روم کو ایک راہب ملا جس نے پتہ دیا کہ یونان میں ایک مکان ہے جو قسطنطین کے زمانہ سے مقفل ہے، اس نے فلسفہ کی تمام کتابیں ہر جگہ سے جمع کر کے اس مکان میں بند کرا دی تھیں کہ اگر فلسفہ و حکمت کو آزادی ملی تو دین عیسوی کو سخت صدمے اٹھانے پڑیں گے، اس وقت سے جو بادشاہ ہوتا ہے وہ اس پر ایک قفل کا اور اضافہ کرتا ہے، قیصر روم نے راہب کی مدد سے یہ خزانہ کھولا تو بہت کتابیں محفوظ ملیں، قیصر کو خیال ہوا کہ مسلمانوں کو یہ کتابیں دینے میں ایسی فیاضی ممنوع تو نہیں، راہب اور ارکان دولت نے متفقہ طور پر عرض کیا کہ مضایقہ نہیں، فلسفہ اگر مسلمانوں میں پھیلا تو ان کے مذہبی جوش کو ٹھنڈا کر دے گا یہ بھی روایت ہے کہ اس موقع پر یہ بھی کہا گیا ہے کہ مسلمانوں کو یہ کتابیں دینے میں ثواب ملے گا کیونکہ یہ چیزیں جس مذہب میں داخل ہوئیں اس کی بنیادیں ہلا دیں، چنانچہ اس مقفل مکان کی ساری کتابیں مامون کے پاس بھجوا دی گئیں، مامون نے ارسطو کی تصانیف کے ترجمے کے لیے یعقوب بن اسحاق کندی

کو مامور کیا، جو مختلف زبانوں کے جاننے اور تحقیقات علمی میں بے نظیر مانا جاتا تھا، مامون نے خود بھی حجاج بن البطریق سلما کو جو بیت الحکمت کا مہتمم تھا روم بھیجا کہ اپنی پسند سے کتابیں انتخاب کر کے لائے، آرمینیہ، مصر، شام، سائیریس اور دوسرے مقامات میں بھی قاصد بھیجے اور اس کے لیے لاکھوں روپے صرف کیے، اسی زمانہ میں قسطا بن لوقا ایک عیسائی فلاسفر اپنے شوق سے روم گیا اور بہت سی کتابیں حاصل کیں، مامون نے اس کو بھی اپنی بیت الحکمت سے منسلک کرلیا اور کتابوں کے ترجمے کرائے، سہل بن ہارون ایک فارسی النسل حکیم تھا، اس نے مجوسیوں کی بعض کتابوں کے ترجمے کیے، مامون کے ندیم خاص محمود احمد و حسن نے روم کے اطراف میں بہت سے ایلچی بھیجے اور فنون حکمت کی ہزاروں کتابیں منگوائیں اور دور دراز ملکوں سے مترجموں کو بلا کر ان کے ترجمے کرائے، جبرئیل بن بختیشوع مامون کے دربار کا طبیب تھا، اس سے بھی ترجمے کرائے گئے، اس عہد میں یونانی، فارسی، کالدی، قبطی اور شامی زبانوں سے کتابیں ترجمے کرائی گئیں، مامون کے دربار میں فلسفہ و نجوم کے ماہروں اور کتب حکمت کے مترجموں کا جو گروہ تھا ان میں دوسرے مذاہب کے جو فضلا تھے ان کے نام یہ ہیں: حنین بن اسحاق، میسوع، قسطا بن لوقا، یوحنا ماسویہ، ابن البطریق، یعقوب کندی، ماشاء اللہ یہودی، دوبان ہندو وغیرہ (تفصیل کے لیے دیکھو المامون مصنفہ علامہ شبلی نعمانی ص ۱۶۷، ۱۶۴، ص ۲۴۰)

عباسیوں کی اس رواداری کی بازگشت آج بھی سنائی دیتی ہے، ان کی علمی اور قلمی فتوحات کا اعتراف یورپ کی موجودہ متمدن دنیا کو بھی ہے، موسیو لیبان رقم طراز ہے کہ عربوں میں علم حاصل کرنے کی خواہش اس درجہ تھی کہ خلفائے بغداد ہر ایک تدبیر سے دنیا کے مشہور علما اور اہل کمال کو اپنے دارالسلطنت میں جمع کرتے تھے، ایک خلیفہ نے تو شہنشاہ مشرق سے محض اس غرض سے اعلان جنگ بھی کیا کہ وہ ایک مشہور مہندس کو بغداد میں درس دینے کے لیے مجبور ہو جائے، علما، فضلا اور اہل کمال ہر قوم اور ہر مذہب کے یونانی، ایرانی، قبطی، کالدی اس شہر میں آکر جمع ہو گئے اور اسے انھوں نے تمام دنیا کے علوم کا مرکز بنا دیا تھا، ابوالفرج لکھتا ہے کہ ہارون رشید کے بیٹے مامون کا قول یہ تھا کہ علماء اللہ تعالیٰ کے ان خاص

بندوں میں ہیں جنھیں اس نے انسان کے فہم وادراک کو کامل بنانے کے لیے انتخاب کیا ہے، یہ لوگ دنیا کی مشعلیں اور رہبرانِ نوع انسانی ہیں، اگر یہ نہ ہوں تو دنیا پھر اپنی وحشی حالت پر آجائے جب کہ خلفائے بغداد کے دربار میں اس قسم کے باکمال اشخاص موجود تھے تو پھر وہ کیوں نہ اپنے دارالخلافت کو تمام عالم میں اول سمجھتے۔ (تمدن عرب ص ۱۷۱)

واثق باللہ (۲۲۷ھ) نے تو ہر فرقہ اور ہر مذہب کو آزادی سے اظہار خیال کرنے کی اجازت دے دی تھی، تمام مشہور مترجم اور فلسفی اس کے دربار میں موجود رہتے، ان سے فلسفیانہ بحثیں کرتا تھا، جس کو حنین نے ایک کتاب الموسوم بہ المسائل الطبیعیہ میں قلم بند بھی کردیا ہے، ہارون رشید کے زمانہ میں یوحنا بن ماسویہ خزانۃ الحکمت کا افسر تھا، واثق باللہ نے اس کو اپنا ندیم خاص بنالیا اور اس کو مالا مال کردیا، ایک موقع پر تین لاکھ درہم عطا کیے، واثق کے بعد متوکل باللہ خلیفہ ہوا تو اس نے حنین بن اسحاق کو ترجمہ کے محکمہ کا افسر مقرر کیا اور بہت سے زبان داں مترجم اس کی ماتحتی میں دے، ان میں اصطفن بن بسیل اور موسیٰ بن خالد بھی تھے، متوکل نے حنین کے لیے خاص شاہی ایوانات میں سے تین بڑے بڑے محل عطا کیے اور ان کو ہر قسم کے اسباب وسامان سے سجادیا اور کتب خانہ بھی وہیں منتقل کردیا۔

معتضد باللہ (۲۷۹ھ-۲۸۶ھ) کو ہندوستان کے علم حساب اور اصطرلاب سے بڑی دلچسپی ہوئی تو اس نے اس کے ماہرین کو مزید تحقیقات کے لیے ہندوستان بھیجا۔

ہندوستان میں طب، بیطاری، سانپوں کے علم، زہروں کے علم، موسیقی، سیاست، جنگ، کیمیا، حدود منطق، معانی وبیان، منتر، کرتب اور جادو، افسانے اور کہانیوں پر سنسکرت کی جو کتابیں تھیں وہ وقتاً فوقتاً عربی میں منتقل ہوتی رہیں، ان کی تفصیلات مولانا شبلیؒ کے مضمون ''تراجم'' (مقالات شبلی ج ۶) اور مولانا سید سلیمان ندویؒ کی کتاب ''عرب وہند کے تعلقات'' کے باب علمی تعلقات میں ملیں گی، ہم نے اوپر اجمالی طور پر کچھ باتیں مسلمانوں کی علمی رواداری ظاہر کرنے کے لیے قلم بند کردی ہیں۔

آل سلجوق اور عیسائی: بنوعباس کی حکومت جیسے جیسے کمزور ہوتی گئی تو مختلف علاقوں میں علاقائی سلطنتیں قائم ہوتی گئیں، ان ہی میں آل سلجوق کی بھی حکومت تھی، ان کا خاندان

گیارہویں صدی سے تیرہویں صدی تک ایشیاے وسطی اور اس کے ملحق علاقوں پر حکومت کرتا رہا، ان میں طغرل بیگ نے ۱۰۶۳ء، الپ ارسلان نے ۱۰۷۲ء، ملک شاہ نے ۱۰۹۲ء، محمود اور برکیارزن نے ۱۱۰۴ء، ملک شاہ ثانی اور محمد نے ۱۱۱۷ء اور سنجر نے ۱۱۵۷ء تک حکومت کی، ان تمام علاقوں کے مسلم فرماں رواؤں نے جو کسی زمانہ میں خلفائے بغداد کے زیر نگیں تھے، طغرل کی اطاعت قبول کر لی تھی، اس کا نام بغداد میں بھی جمعہ کے خطبہ میں پڑھا جاتا تھا اور وہ ملک الشرق والغرب کہلانے لگا تھا، الپ ارسلان کے ماتحت سلجوقیوں کی فتوحات کی حد دریائے جیحون تک جاپہونچی تھی، آرمینیوں اور بازنطینیوں کی شکست کے بعد تو قریب قریب سارا ایشیائے کوچک سلجوقیوں کے زیر نگیں ہوگیا تھا، یہ اقتدار عیسائیوں کو کیسے پسند آسکتا تھا، رومن امپائر جو اس زمانہ میں یونانی امپائر کہلانے لگا تھا برابر سلجوقیوں پر ضرب کاری لگانے کی فکر میں رہا، چنانچہ اس کے شہنشاہ رومانوس دیوجانس (۱۰۷۲ء- ۱۰۶۷ء) اور الپ ارسلان سے ایک زبردست جنگ ہوئی، رومانوس میدان جنگ میں پکڑا گیا اور جب وہ الپ ارسلان کے سامنے پیش کیا گیا تو اس کی مرقع آرائی ایک انگریز مورخ نے جس طرح کی ہے اس سے دونوں کی رواداری اور غیر رواداری کا اندازہ ہوگا۔

الپ ارسلان کی رواداری: صبح کو شاہی قیدی الپ ارسلان کے سامنے لایا گیا، الپ ارسلان کو ابھی تک شبہ تھا کہ شہنشاہ کی یہ بدقسمتی ہوسکتی ہے لیکن جب اس کو اپنے قاصدوں کے ذریعہ سے یہ یقین ہوا کہ یہ شہنشاہ ہے اور پھر اس کے کچھ ہمراہی اشکبار آنکھوں سے اپنے مغموم فرماں روا کے قدموں کو چوم رہے تھے تو سلطان اس کی طرف مائل ہوا، کونس ٹنٹائن کا جانشین معمولی طور سے ترکوں کے ایوان میں لے جایا گیا، اس کو حکم ملا کہ ایشیا کے مالک کے سامنے زمیں بوس ہو، اس نے بادلِ ناخواستہ اس کی تعمیل کی، الپ ارسلان اپنے تخت پر سے اٹھا اور اس نے رومی شہنشاہ کی گردن پر اپنا پاؤں رکھا، پاؤں رکھنے کی روایت تو مشکوک ہے لیکن اگر اس نے ایسا کیا تو اس کے یہاں کی یہی قومی رسم تھی، اس کے بعد وہ جس طرح پیش آیا اس کی تعریف اس کے متعصب دشمنوں نے بھی کی ہے اور یہ آج کل کی متمدن دنیا کے لیے درس ہوسکتا ہے، اس نے شاہی قیدی کو زمین پر سے اٹھایا اور

بہت ہی نرمی سے اس سے تین بار ہاتھ ملایا پھر اس کو یقین دلایا کہ اس کی زندگی اور اس کا رتبہ پہلے کی طرح برقرار رہے گا کیونکہ وہ خود ایک فرماں روا ہے اور اس نے اپنے برابر کے لوگوں کا احترام کرنا سیکھا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ زمانہ میں کیا کیا انقلابات ہوتے رہتے ہیں، ایوان سے رومانوس بغل کے ایک خیمہ میں لے جایا گیا، جہاں سلطان کے عہدیدار اس کی شان اور رتبہ کے مطابق پیش آتے رہے، وہ سلطان کے پاس روزانہ دو مرتبہ لایا جاتا، سلطان اس کو اپنے ساتھ پورے اعزاز سے بٹھاتا، آٹھ دنوں تک دونوں میں آزادانہ اور بے تکلفانہ انداز میں گفتگو ہوتی رہی، فاتح کی کسی بات یا اس کی کسی نگاہ سے بھی مفتوح کی کوئی بے قدری ہوتی نظر نہیں آئی، البتہ سلطان نے اس کی نالائق رعایا کی ضرور پر زور مذمت کی، جس نے اپنے بہادر فرماں روا سے خطرے کے وقت ساتھ چھوڑ دیا اور پھر اس نے اپنے شاہی قیدی کی توجہ ان غلطیوں کی طرف بھی دلائی جو لڑائی لڑنے میں کی گئی تھیں، جب صلح کی گفتگو شروع ہوئی تو الپ ارسلان نے اپنے مفتوح قیدی سے پوچھا کہ اس کو کس قسم کے سلوک کی توقع ہے، شہنشاہ نے بڑے اطمینان لیکن بے توجہی کے ساتھ جواب دیا جس سے اس کی آزاد طبیعت کا اظہار ہوتا ہے، اس نے کہا: اگر آپ ظالم ہیں تو میری جان لے لیں گے اور اگر آپ اپنے غرور کے تابع ہیں تو مجھ کو اپنے رتھ کے پہیوں میں باندھ کر گھسٹوا لیں گے اور اگر آپ کے مفاد کا خیال ہوگا تو مجھ سے فدیہ لیں گے اور مجھ کو اپنے ملک میں واپس کر دیں گے، اس کے جواب میں سلطان نے کہا کہ اگر آپ فاتح ہوتے تو میرے ساتھ کیا کرتے، یونانی شہنشاہ کو اپنی دانشمندی اور شکر گذاری کے جذبے کی بنا پر اپنے اندرونی جذبات کو دبائے رکھنا چاہیے لیکن اس نے غضبناک لہجہ میں جواب دیا کہ اگر مجھ کو فتح ہوتی تو میں آپ کو کوڑے سے پٹواتا، ترک فاتح کو اس جواب پر ہنسی آگئی، اس نے کہا کہ عیسائی مذہب کی تو یہ تعلیم ہے کہ دشمنوں سے محبت کرو، ان سے جو صدمہ پہونچے تو اس کو معاف کر دو لیکن اسی کے ساتھ اس نے یہ بھی کہا کہ اس کے ساتھ وہ ایسا سلوک نہیں کرے گا جو قابل مذمت ہو، بہت غور و فکر کے بعد الپ ارسلان نے یہ فیصلہ کیا کہ شہنشاہ کو آزادی ان شرائط پر دی جائے کہ وہ ایک ملین فدیہ کے علاوہ تین لاکھ ساٹھ ہزار سالانہ خراج ادا کرتا رہے، دونوں

شاہی خاندانوں میں شادی بیاہ کے ذریعہ سے رشتے قائم ہوں اور جو مسلمان یونانیوں کی قید میں ہیں وہ رہا کردیے جائیں، رومانوس نے ٹھنڈی سانس لے کر اس صلح کو منظور کرلیا، جس کو اس نے اپنی سلطنت کی شان وشوکت کے خلاف تصور کیا، اس کے بعد سلطان کی طرف سے اس کو ایک خلعت فاخرہ عطا کیا گیا، اس کے امرا اور معززین اس کو واپس کردیے گئے، سلطان نے بہت ہی اخلاق سے اس سے معانقہ کیا، بیش قیمت تحفے دیے اور فوجی اعزاز کے ساتھ رخصت کیا، وہ جب اپنی سلطنت کے حدود میں پہونچا تو اس کو اطلاع ملی کہ اس کے محل اور صوبوں میں اس کی اطاعت نہیں کی جائے گی، اس لیے کہ اب وہ ایک قیدی ہے، اس کے لیے بڑی آزردگی سے دولاکھ اشرفیاں جمع کی گئیں جن کو اس مفتوح فرماں روا نے سلطان کے پاس بھیج کر اپنا فدیہ ادا کیا، اس کے یہ معنی تھے کہ اس نے اپنی ذلت اور بزدلی کا اعتراف کرلیا۔ (ہسٹورین ہسٹری آف دی ورلڈ جلد دہم ص ۵۶-۲۵۵)

واضح رہے کہ یہ تفصیل کسی مسلمان مورخ کے حوالہ سے نہیں لکھی جارہی ہے جس سے شبہ ہو کہ مبالغہ اور جانبداری سے قلم بند کی گئی ہے بلکہ ایک عیسائی مورخ ہی کی تحریر ہے، انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے مضمون نگار سی. ایل. ہوارٹ نے بھی اعتراف کیا ہے کہ سلجوقی فرماں روا اپنی عیسائی رعایا کے ساتھ اچھا سلوک کرتے تھے جس سے ان کی نیک نامی رہی۔ (اردو دائرۂ معارف اسلامیہ ج ۵ ص ۱۴۱)

اسی خاندان کے فرماں روا ملک شاہ کے وزیر نظام الملک نے اس کے لیے جو سیاست نامہ لکھی تھی، اس میں عاملوں، مقطعوں، قاضیوں، خطیبوں، رئیسوں، امیروں، حکومت کے مشیروں، فوجی سرداروں، لشکریوں، غلاموں، فریادرسوں اور مظلوموں سے جس نرمی، رواداری اور فراخ دلی کی تعلیم دی گئی ہے، وہی دراصل اسلامی تعلیمات کی صحیح اور سچی روح ہے۔

صلیبی جنگ: جب سے اسلام کی برکت اور رحمت دنیا میں شروع ہوئی تو عیسائی اور خصوصاً ان کے مبلغین اسلام کی تمام خوبیوں سے منکر ہوکر اس کی مخالفت میں ہر قسم کی علمی، فکری، نفسیاتی اور ذہنی مہم جاری کی، پہلے تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک پر

طرح طرح کے حملے کیے، دمشق کے جان (۷۴۰ء-۷۰۰ء) نے آپؐ کے خلاف نفرت پھیلانے کی جعلی کوشش کی، اسلام کو ایک الہامی مذہب قرار دینے کے بجائے اس کو ایک فاسد دین قرار دیا اور یہ الزام لگایا کہ آپؐ نے ایک پادری کی معیت میں بائبل کو مسخ کرکے ایک ایسا مذہب ایجاد کیا جس میں اپنے آپ کو پوجا کرانے کی تعلیم دی، اس نے آپؐ پر جنسی اتہامات بھی رکھے پھر ایک جعلی رسالہ کی اشاعت کی گئی جو ایک نامعلوم شخص عبدالمسیح بن الکندی کی طرف منسوب ہے، اس کے ذریعہ سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ خود ایک مسلمان نے اس مذہب کو خرافات کا مجموعہ بتایا ہے، اس کے ترجمے مختلف زبانوں میں کیے گئے اور اسی کو ماخذ بنا کر اسلام کے خلاف زہرافشانی جاری رکھی گئی پھر نویں صدی کے آغاز میں تھیوسوفین نے ایک تاریخ کرانیکل کے نام سے لکھی، اس میں یہ ثابت کیا گیا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تعلیم یافتہ تھے، انھوں نے یہودیوں اور عیسائیوں کی الہامی کتابوں کا گہرا مطالعہ کیا اور ان ہی کتابوں کے سہارے اسلام کو ایجاد کیا، پھر نویں صدی میں شاہ یسیل کی فرمایش پر ایک بازنطینی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ایک کتاب "Refutater Muhammad" لکھی جس میں اس نے آپؐ کی نبوت سے انکار کرتے ہوئے آپؐ کے لیے نہایت ہی ناروا الفاظ استعمال کیے اور کلام مجید کو خرافاتی داستانوں کا مجموعہ قرار دیا پھر جب مسلمانوں کی حکومت اندلس میں قائم تھی تو قرطبہ کے پوپ سینٹ بولوجی نے ایک کتاب لکھی، وہ اس ملک کے علما وفضلا کا پروردہ تھا، اس نے بھی اسلام اور اس کے رسول کے خلاف شدید نفرت کا اظہار کیا، اسی طرح ایک دوسرے اندلسی مصنف پروڈو یاسکل نے اسی قسم کی ایک کتاب لکھی جس میں اسپین میں مسلمانوں کی حکومت کو عذاب الٰہی قرار دیا، ونسنٹ ڈی بیوس (المتوفی ۱۲۶۴ء) نے ان تمام داستانوں کو اپنی ایک کتاب میں جمع کر دیا، جس کے ذریعہ سے یہ آگ بڑھکائی گئی کہ اسلام ایک وحشیانہ مذہب ہے، آنحضرتؐ نے تلوار کے زور سے طاقت حاصل کی اور وحی کے نام پر دھوکہ دے کر اس کو برقرار رکھا۔ (مزید تفصیلات کے لیے دیکھئے اسلام اور مستشرقین کے عنوان سے وہ مضامین جو دارالمصنفین کے رسالہ معارف میں مارچ ۱۹۸۲ء سے ۱۹۸۵ء تک برابر چھپتے رہے)

عیسائی مبلغین اور مصنفین کی ان ہرزہ سرائیوں اور مخالفانہ کارروائیوں کے باوجود اسلام ابر رحمت بن کر دنیا کے مختلف گوشوں میں پھیلتا چلا گیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مسلمانوں کا جو امپائر بنا، وہ بنو امیہ کے عہد میں اتنا بڑھا کہ بقول ایڈورڈ گبن اس کے حدود سلطنت میں دوسو دن تک برابر چلنا پڑتا، شام، عراق، ماوراء النہر، ایران اور ہندوستان کے علاوہ ان کی حکومتیں مصر اور افریقہ کے بعض حصوں میں قائم ہوگئیں، پھر وہ اسپین اور فرانس تک پہونچ گئے، سسلی میں ان کی حکومت قائم ہوگئی، اسپین تو ان کے زیر نگیں ہوکر یورپ کا سرتاج بن گیا، بنوامیہ کے بعد عباسیوں کی حکومت قائم ہوئی تو ان کے عروج کے زمانہ میں ان کے تہذیب وتمدن سے دنیا کی آنکھیں چکاچوند ہوگئی تھیں، رومی شہنشاہ ان سے برابر ٹکر لیتے رہے لیکن پسپا ہوکر خراج دینے پر مجبور ہوئے۔

عیسائیوں کو مسلمانوں کا یہ عروج کب گوارا ہوسکتا تھا، ان کی بیخ کنی کی فکر میں برابر لگے رہے، پہلی دفعہ ان کو کامیابی اس وقت ہوئی جب ۱۰۷۱ء میں سسلی سے مسلمانوں کو دربدر کیا، عباسیوں کی حکومت زوال پذیر ہوئی تو سلجوقی ابھرے اور جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے کہ الپ ارسلان نے رومن شہنشاہ کو اپنے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کیا، مشرقی یورپ میں سلجوقیوں نے ایشیائے کوچک اور یونانی علاقہ میں اپنی حکومت قائم کرلی تو یورپ والوں کو یہ کب پسند آسکتا تھا، تاریخ یورپ کے مصنف اے. جی. گرانٹ نے صاف طور پر لکھ دیا کہ یورپ کو مغربی اور مشرقی محاذوں پر مسلمانوں کا خطرہ بڑھ گیا تھا، سخت ضرورت تھی کہ ان کو پیچھے ہٹادیا جائے۔ (تاریخ یورپ، اردو ترجمہ ص ۵۳-۲۵۲)

اس کے علاوہ اطالوی کلیسا کا اقتدار گیارہویں صدی میں کم ہوتا جارہا تھا، پوپ اربن دوم کا اختلاف نہ صرف یونان کے امپائر بلکہ اس زمانہ کے انگلستان، جرمنی اور فرانس کے حکمرانوں سے بہت بڑھ گیا تھا، اس نے اپنے کھوئے ہوئے اثرات کو بحال کرنے کے لیے صلیبی جنگ کے نام پر ایک مذہبی جنون پیدا کردیا، کلیسا کو مسلمانوں سے فطری دشمنی ہے اس لیے ان کے خلاف ہر طرح کی نفرت پھیلائی، اس کو ہوا ایک پادری پیٹر نے دی جس کے نام کا جز ہرمٹ ہوگیا تھا، مسلمانوں پر یہ الزام رکھا گیا کہ وہ بیت المقدس میں مسیحی زائرین

کے ساتھ براسلوک کرتے ہیں اس وقت بیت المقدس سلجوقی حکومت کے زیرنگیں تھا، پوپ اربن دوم نے فرانس میں ایک کانفرنس منعقد کر کے یہ اعلان کیا کہ جو شخص اس وقت صلیب نہ اٹھائے گا وہ میرا پیرو نہیں، اس کے بعد ایک مجنونانہ جوش پیدا ہو گیا، پوپ کی مرضی کے حکم کو خدا کی مرضی سمجھی گئی ہر طرف کے عیسائی سرخ کپڑے کی صلیبیں اپنے سینوں میں لگا کر ایک مقدس جہاد کے لیے تیار ہو گئے مگر مشہور مورخ ایڈورڈ گبن نے لکھا ہے کہ سپاہیوں نے صلیب کا ضرور سہارا لیا لیکن ان میں زیادہ تر ایسے تھے جو اس جنگ کے ذریعہ سے اپنی خواہشوں کی جنت آباد کرنے کے خواہاں تھے، ان کا خیال تھا کہ مسلمان امرا کی دولت حاصل کر کے وہ بہت متمول ہو جائیں گے، ان کو اچھی سے اچھی شراب اور حسین سے حسین عورتیں ملیں گی، اس جنگ میں شریک ہونے والوں میں وہ لوگ بھی تھے جو جاگیرداری اور کلیسائی نظام سے آزردہ تھے، وہ کسان بھی تھے جو اپنے زمینی آقاؤں کے مظالم سے نجات چاہتے تھے اور اپنی پسند کا ایک علاقہ چاہتے تھے، وہ راہب بھی تھے جو کلیسا کے جبر سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے اور وہ مقروض لوگ بھی تھے جو اپنے قرض خواہوں سے نجات چاہتے تھے، وہ مجرم بھی تھے جو اپنے جرائم کی سزا سے چھٹکارا چاہتے تھے (ہسٹری آف ڈکلائن اینڈ فال آف رومن امپائر ج ۶ ص ۱۲-۴۱۱) ایچ. جی. ویلس کے بیان کے مطابق اس میں لاطینی گرجا کا تو مقصد یہ تھا کہ وہ بازنطینی گرجا کو اپنے زیرنگیں کرلے، اس کے علاوہ اٹلی کے کچھ لٹیرے ایسے بھی تھے جو اپنی لوٹ کے لیے کچھ اور متمول علاقے چاہتے تھے پھر وینس اور جنیوا وغیرہ کے تاجر اپنے لیے تجارت چاہتے تھے، اس لیے یہ سب کے سب مشرق کی طرف اسی طرح چل کھڑے ہوئے جس طرح سونے کی کان کی دریافت پر ہر طرف کے لوگ ٹوٹے پڑتے ہیں۔ (دی آوٹ لائن ہسٹری ص ۶۴۱-۶۴۰)

فلپ کے ہٹی نے بھی لکھا ہے کہ صلیبی جنگ میں جن لوگوں نے حصہ لیا ان سب میں خالص مذہبی جذبات نہ تھے، ان کے کچھ سردار اپنے لیے علاقے چاہتے تھے، پلسیا، وینس اور جنیوا کے تاجروں کو اپنی تجارت سے دلچسپی تھی، رومان پسند، مضطرب اور مہم جو لوگوں کو مجتمع ہونے کا موقع مل گیا، مجرموں نے سوچا کہ اس کے ذریعہ سے ان کی بخشائیش

ہو جائے گی، فرانس، لورین، اٹلی اور سسلی کے عوام اپنے اقتصادی اور معاشی حالات سے بددل تھے، صلیب کو اٹھانے میں ان کو راحت محسوس ہوئی، ان میں قربانی اور ایثار کا جذبہ نہ تھا۔ (ہسٹری آف عربس ص ۶۳۶)

عیسائیوں نے مسلمانوں کے خلاف ۱۰۹۶ء سے پانچ سو برس تک آٹھ صلیبی لڑائیاں لڑیں، ان کی تفصیلات راقم نے اپنے ایک مضمون صلیبی جنگ میں لکھی ہے، جو رسالہ معارف مئی، جون ۱۹۸۰ء میں چھپا ہے، یہاں ہم ان لڑائیوں کی تفصیل تو قلم بند کرنا پسند نہیں کریں گے لیکن ان میں عیسائیوں نے جو سفاکی دکھائی اور مسلمانوں کی طرف سے جو رواداری کا مظاہرہ ہوا اس کا ذکر کرنا ضروری ہے۔

عیسائی اس مقدس جہاد میں ایشیا پر ٹوٹ پڑے، بہانہ یہ تھا کہ بیت المقدس کو مسلمانوں کے ظلم و ستم سے آزاد کرانا ہے، اس کا پہلا جتھا ایک راہب والٹر مفلس کی رہنمائی میں بڑھا، یہ جس علاقہ سے گذرا مفت رسد حاصل کرنے کی خاطر لوٹ مار کرتا چلا، یہ بلغاریہ پہونچا تو اس کے عیسائیوں نے ان کی لوٹ مار سے عاجز ہو کر ان کا قتل عام کیا، اس کے بعد پیٹر دی ہرمٹ اپنی نگرانی میں چالیس ہزار کا جتھا لے کر روانہ ہوا، راستہ میں اس نے بلغاریہ والوں سے پورا بدلہ لیا، اس طرح کہ بلغاریہ کے ساتھ ہنگری کے علاقے بھی ان کے تاخت و تاراج سے ویران ہو گئے، وہ اسی طرح غارت گری کرتے ہوئے ایشیائے کوچک پہونچے تو وہاں کے دودھ پیتے بچوں کو قتل کر کے ان کی لاشوں کو ہوا میں بکھیر دیا، تیسرا جتھا ایک رومن راہب لے کر چلا بقول ایڈورڈ گبن یہ وحشی شراب پیتے، زنا کرتے اور لوٹتے مارتے جب ہنگری اور بلغراد پہونچے تو وہاں کے باشندے ان سے نبرد آزما ہو گئے اور ان کو مار مار کر ان کی ہڈیوں کا ڈھیر لگا دیا، چوتھا جتھا انگلستان، فرانس اور لورین سے روانہ ہوا، ان کو راستے میں کوئی مسلمان نہیں ملا تو یہودیوں کا قتل عام کرتے ہوئے آگے بڑھے، گو ہنگری میں ان کی مزاحمت پورے طور پر ہوئی، اس کے دوسرے سال یورپ کے جاگیرداروں کا جتھا گوڈفری کی نگرانی میں روانہ ہوا، جب اس کا تسلط انطاکیہ پر ہوا تو یہاں مسلمانوں کا قتل عام شروع کیا گیا، دو ہزار ترکوں کے سر کاٹ کر فوجی کیمپ کے گرد نمائش کے لیے لٹکا یے گئے، وہاں کی

قبریں کھود کر لاشوں کو باہر نکالا گیا اور ان کے اعزہ کو دکھا کر ان کو رونے پر مجبور کیا گیا، عورتوں کی عصمت ریزی کی گئی، مسجدیں بے رحمانہ طریقہ سے مسمار کی گئیں، ہر گھر مذبح خانہ بنا دیا گیا، گلی کوچہ میں خون کی ندیاں بہتی نظر آئیں (تفصیل کے لیے ایڈورڈ گبن کی ہسٹری آف دی ڈکلائن اینڈ فال آف دی رومن امپائر ج ۶ ص ۴۲۱-۴۱۶ اور موسیو لیبان کی تمدن عرب کے اردو ترجمہ ص ۲۹۶-۲۹۵ دیکھئے) اور جب صلیبیوں نے ۱۰۹۹ء میں بیت المقدس پر قبضہ کیا تو ایڈورڈ گبن کا بیان ہے کہ صلیب کے علم برداروں نے تین دن تک اتنا قتل عام کیا کہ ستر ہزار لاشوں کی وجہ سے وبا پھیل گئی، جب اس سے ان کی تشفی نہیں ہوئی تو یہودیوں کو ان کی عبادت گاہوں میں جلایا گیا (ڈکلائن اینڈ فال آف دی رومن امپائر ج ۶ ص ۴۵۹) تاریخ یورپ کے مصنف اے. جی. گرانٹ نے بیت المقدس پر صلیبیوں کی فتح پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ صلیبیوں کے نزدیک دشمن کو قتل کرنا خدا کی عبادت کے مساوی تھا، اس کے پوپ کو یہ تحریر لکھی گئی کہ خدا ہمارے عجز وانکسار سے رام ہو گیا اور ہمارے عجز والحاح کے آٹھویں روز اس نے شہر کو دشمنوں سمیت ہمارے حوالہ کر دیا اور اگر آپ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ جو دشمن وہاں موجود تھے ان کے ساتھ ہم نے کیا سلوک کیا تو اس قدر لکھ دینا کافی ہے کہ جب ہمارے سپاہی حضرت سلیمان علیہ السلام کے معبد میں داخل ہوئے تو ان کے گھوڑوں کے گھٹنوں تک مسلمانوں کا خون تھا (تاریخ یورپ اردو ترجمہ ص ۲۵۷) موسیو لیبان کا بیان ہے کہ یہ فوج بچوں، جوانوں اور بوڑھوں سب کو قتل کرتی رہی، چاروں طرف لاشیں دکھائی دیتیں، اس قدر خون بہا کہ لاشیں تیرتی پھرتی تھیں، بیت المقدس کے مسلمانوں کے علاوہ یہودی اور غیر مقلد عیسائیوں کا بھی قتل عام آٹھ روز تک ہوتا رہا، تقریباً ساٹھ ہزار آدمی مارے گئے، لیبان یہ بھی لکھتا ہے کہ ان صلیبیوں کا برتاؤ اس مقدس شہر کے باشندوں کے ساتھ اس سے مختلف رہا، جو حضرت عمرؓ نے کئی صدی پیشتر عیسائیوں کے ساتھ کیا تھا (تمدن عرب اردو ترجمہ ص ۲۹۹-۲۹۸) بیت المقدس پر تصرف حاصل کرنے کے بعد چند سال کے اندر صلیبیوں نے فلسطین کے بڑے حصے پر اپنا قبضہ جما لیا اور وہاں کے مسلمانوں پر جو مظالم کیے ان کی تفصیل علاحدہ ہے، ان صلیبیوں سے برابر چھوٹی بڑی لڑائیاں عمادالدین زنگی اور

رکن الدین زنگی کے زمانہ میں ہوتی رہیں، پھر نوے سال کے بعد ۱۱۸۷ء میں صلاح الدین ایوبی نے بیت المقدس کو عیسائیوں سے واپس لیا۔

صلاح الدین ایوبی کی رواداری: صلاح الدین ایوبی جب فاتح ہوکر بیت المقدس میں داخل ہوا تو اس نے اپنی رواداری، فراخ دلی اور انسانی محبت کا جو ثبوت دیا اس کی تعریف یوروپین مورخوں نے بھی کی ہے، ایڈورڈ گبن لکھتا ہے کہ انصاف کا تقاضا ہے کہ اس ترک فاتح کی رحم دلی کی تعریف کی جائے، اس نے مفتوحوں کو کسی مصیبت اور پریشانی میں مبتلا ہونے نہیں دیا، وہ ان سے بھاری رقمیں وصول کرسکتا تھا لیکن تیس ہزار کی رقم لے کر ستر ہزار قیدیوں کو آزاد کیا، دو تین ہزار کو تو اس نے رحم کھا کر یوں ہی چھوڑ دیا، اس طرح قیدیوں کی تعداد گھٹ کر گیارہ۔ سے چودہ ہزار تک رہ گئی، جب یروشلم کی ملکہ اس کے سامنے آئی تو اس نے نہ صرف انتہائی مہربانی سے باتیں کیں بلکہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، اس نے جنگ کے یتیموں اور بیواؤں میں خیرات تقسیم کی، جنگ کے زخمیوں کے علاج اور دیکھ بھال کے لیے ہر طرح کی سہولتیں فراہم کیں، وہ قرآن کے دشمنوں کے ساتھ ہر طرح کی سختی سے پیش آنے میں حق بجانب تھا مگر اس نے جس فیاضانہ رحمدلی کا ثبوت دیا اس سے وہ نہ صرف تعریف و تحسین بلکہ محبت کیے جانے کا مستحق ہے۔ (ج ٦ ص ۵۰۰-۴۹۹)

اسٹینلی لین پول نے اپنی کتاب صلاح الدین میں لکھا ہے کہ جب یروشلم مسلمانوں کے حوالہ کیا جار ہا تھا تو سلطان کی سپاہ اور معزز ذمہ دار افسروں نے گلی کوچوں میں انتظام قائم رکھا تھا، یہ سپاہی اور افسر ہر قسم کی زیادتی کو روکتے تھے، اسی کا نتیجہ تھا کہ کسی عیسائی کو کوئی گزند نہیں پہونچا، شہر سے باہر جانے کے کل راستوں پر سلطان کا پہرہ تھا اور ایک نہایت معتبر امیر باب داؤد پر متعین تھا کہ زرفدیہ دینے والے شہر کے باہر بغیر کسی روک ٹوک کے چلے جائیں۔
(صلاح الدین از اسٹینلی لین پول اردو ترجمہ از عنایت اللہ دہلوی ص ۲۰۲)

اور جب بیت المقدس پر مسلمانوں کا قبضہ ہونے کو تھا تو بطریق، بریکلولس کی طرف اس کا سفیر بلیان سلطان صلاح الدین سے صلح کی گفتگو کرنے گیا اس نے جو گفتگو کی اس سے عیسائیوں کی سفاکی اور بے رحمی کا بھی اندازہ ہوگا، وہ سلطان کے پاس پہونچا تو اس

نے اس کو مخاطب ہو کر کہا:

"سلطان! آپ اس بات کو جان لیں کہ ہم خدا کے سپاہی ہیں اور خدا ہی کو معلوم ہے کہ وہ آدمی کتنے ہیں جو محض آپ کے رحم و کرم کے بھروسہ پر لڑائی میں تساہل کر رہے ہیں، ہمیں یقین ہے کہ آپ اس شہر پر بھی ایسا ہی لطف و کرم کریں گے جیسا کہ آپ نے اور شہروں پر کیا ہے، یہ لوگ مرنا نہیں چاہتے، زندہ رہنا چاہتے ہیں لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہمارا مرنا ضروری ہے، بس ہم خدا کی قسم ہی کھا کر کہتے ہیں کہ ہم پہلے اپنے بیٹوں، بیٹیوں اور اپنی عورتوں کو قتل کریں گے، اپنی دولت، اپنا مال و متاع جو کچھ ہم رکھتے ہیں اسے پھونک دیں گے اور تمہارے لوٹنے کے لیے ایک حبہ بھی نہیں چھوڑیں گے اور نہ کوئی اور چیز، نہ کوئی مرد نہ عورت زندہ آپ غلام بنا سکیں گے اور جب ہم سب کچھ کر لیں گے تو پھر الصخرہ کے گنبد اور مسجد اقصیٰ کو آگ لگا دیں گے اور دوسرے مقامات مقدسہ کا بھی یہی حال کریں گے، جتنے مسلمان غلام اس وقت ہمارے پاس ہیں اور ان کی تعداد پانچ ہزار ہے، ان سب کو قتل کر دیں گے، ہر مویشی اور سواری کے جانوروں کو ذبح کر ڈالیں گے پھر ہم سب مل کر تم پر حملہ کریں گے اور تم سے اپنی جانوں کے لیے لڑیں گے اور ہم میں سے کوئی ایسا نہ ہوگا جو تم میں سے دس پانچ کو اپنے مرنے سے پہلے نہ مار ڈالے، اس طرح ہم یا تو پوری شان سے مریں گے یا فتح ہماری ہوگی۔" (ایضاً ص ۲۰۰)

ان دھمکیوں کا شریفانہ جواب صلاح الدین کی طرف سے یہ تھا:

"اگر یروشلم خوشی سے لڑے بغیر میرے حوالہ کر دیا گیا تو اہل یروشلم پر رحم کر کے ان سب کو اسیرانِ جنگ تصور کر کے ان سے زر فدیہ لے کر انھیں رہا کر دیا جائے گا، ہر مرد کو دس اشرفیاں دے کر رہائی حاصل کرنی ہوگی، زر فدیہ کی اغراض کے لیے دو عورتیں یا دس بچے ایک مرد کے برابر

سمجھے جائیں گے، رہے محتاج اور مساکین جن کے پاس زرفدیہ کے لیے
ایک اشرفی بھی نہ ہوگی تو ایسے دس ہزار آدمیوں کو بیس ہزار اشرفیوں کے
عوض رہا کیا جائے گا، یہ رقم عیسائی بادشاہ ہنری کی رقم سے جواب تک شہسوار
البطار کے پاس محفوظ ہے ادا کی جائے، چالیس دن کے اندر زرفدیہ ادا
کرنے کی مہلت ہے، اس کے بعد جس قدر آدمی شہر میں رہ جائیں گے
وہ غلام بنائے جائیں گے۔'' (ایضاً ص ۲۰۱)

عیسائیوں نے اپنی دھمکیوں کے باوجود ان ہی شرائط پر صلح کر لی اور یروشلم کو مسلمانوں کے حوالہ کر دیا، اس کے بعد اسی عیسائی مورخ ہی کا بیان ہے:

''صلاح الدین نے کبھی پہلے اپنے کو ایسا عالی ظرف اور باہمت
نائٹ ثابت نہیں کیا تھا جتنا کہ اس موقع پر کیا جب کہ یروشلم مسلمانوں کے
حوالہ کیا جا رہا تھا، اس کی سپاہ اور معزز افسران نے جو اس کے ماتحت تھے
شہر کے گلی کوچوں میں انتظام قائم رکھا، یہ سپاہی اور افسر ہر قسم کی زیادتی کو
روکتے تھے، اس کا نتیجہ تھا کہ کسی عیسائی کو کوئی گزند نہ پہونچا، شہر سے
باہر جانے کے کل راستوں پر سلطان کا پہرا تھا اور ایک نہایت معتبر امیر
باب داؤد پر متعین تھا تاکہ جو شہر والے زرفدیہ ادا کر چکے ہیں وہ باہر چلے
جائیں۔ (ایضاً ص ۲۰۱)

اس موقع پر کلیسا کے مقدس بطریق نے جو نمونہ پیش کیا اس کا ذکر اسی عیسائی مورخ سے سنیے:

''تقدس مآب بطریق یروشلم نے جو اخلاق اور ایمان دونوں
سے عاری تھے گرجاؤں کی دولت سمیٹی، سونے کے پیالے اور آب مطہر
رکھنے کا سامان حتی کہ مہد مسیح پر جو طلائی ظروف رہتے تھے اپنے قبضے میں
کیے، اس کے ساتھ اپنا ذاتی اندوختہ جو بہت تھا محفوظ کر لیا، یہ جمع کی ہوئی
دولت اس کی اتنی تھی کہ اگر چاہتا تو بہت سے غریب عیسائیوں کا زرفدیہ

دے کران کو آزاد کرادیتا، جب مسلمان اسیروں نے سلطان سے کہا کہ اس
بے ایمان اور نالائق پادری کو لوٹ کا مال لے جانے سے روکا جائے تو
سلطان نے جواب دیا کہ جو قول اسے دے چکا ہوں اس سے پھر نہیں سکتا،
غرض اور لوگوں کی طرح یہ بڑا پیر پادری دس اشرفیاں دے کر آزاد ہو گیا،
اس عیسائی پادری کو ایک مسلمان بادشاہ نے اس کا سبق دیا کہ خیر و خیرات
کے اصلی معنی کیا ہیں، باب داؤد سے چالیس روز تک آزاد شدہ عیسائیوں
کے باہر نکلنے کا یہ سلسلہ جاری رہا، یہاں تک کہ رعایت کا زمانہ ختم ہوا، اس پر
بھی ہزار ہا غریب اور مفلس عیسائی جنھیں بخیل اور کنجوس تاجروں یا مالدار
عیسائی اداروں نے غلام بننے کے لیے چھوڑ دیا تھا، شہر میں رہ گئے۔''
(ایضاً ص ۲۰۳)

اس کے بعد صلاح الدین اور اس کے بھائی العادل نے ان غلاموں کے ساتھ
جو رواداری اور فیاضی دکھائی، وہ تاریخ کی اور بھی زریں مثال ہے، جس کو ہم اسی عیسائی
مورخ کی زبانی بیان کرتے ہیں:

''العادل اپنے بھائی صلاح الدین کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ
خدا کے فضل و کرم سے میں نے اس ملک اور شہر کے فتح کرنے میں آپ کی
مدد کی ہے، اس لیے درخواست ہے کہ مجھ کو ایک ہزار غلام ان غریب
آدمیوں میں سے دیں جو اس وقت یروشلم میں موجود ہیں، صلاح الدین
نے جب پوچھا کہ اتنے غلام لے کر کیا کرو گے تو العادل نے جواب دیا کہ
جو کچھ میرے جی میں آئے گا وہ کروں گا، اس پر سلطان نے العادل کو ایک
ہزار غلام دے دئے، العادل نے سب کو خدا کی راہ میں آزاد کیا، بطریق اور
بالیان سلطان کے پاس آئے اور یہی درخواست انھوں نے بھی کی، سلطان
نے ایک ہزار غلام ان کو بھی دئے اور وہ آزاد کیے گئے۔'' (ایضاً ص ۲۰۴)

یہ سب کچھ دیکھ کر صلاح الدین کا شریفانہ اور کریمانہ اخلاق اور بھی ابھر آیا، اس

نے خود کیا کیا وہ بھی اسی مورخ کی زبانی سننے کے لایق ہے:

''اب صلاح الدین نے اپنے امیروں سے کہا کہ میرے بھائی نے اپنی طرف سے اور بالیان اور بطریق نے خیرات کی، اب میں بھی اپنی طرف سے خیرات کرتا ہوں، یہ کہہ کر اس نے اپنی سپاہ کو حکم دیا کہ شہر کے تمام گلی کوچوں میں منادی کر دیں کہ تمام بوڑھے آدمی جن کے پاس زرفدیہ ادا کرنے کو نہیں ہے آزاد کیے جاتے ہیں کہ جہاں چاہیں وہ جائیں اور یہ سب باب الیعزر سے نکلنے شروع ہوئے اور سورج نکلنے سے سورج ڈوبنے تک ان کی صفیں شہر سے نکلتی رہیں، یہ خیر و خیرات تھی جو سلطان صلاح الدین نے بے شمار مفلسوں اور غریبوں کے ساتھ کی۔ (ایضاً ص ۲۳)

اس کے بعد ان نائٹوں کی بیوائیں اور بیٹیاں سلطان کے پاس روتی ہوئی آئیں کہ وہ زرفدیہ ادا کر کے کہاں جائیں کیونکہ ان کے شوہر یا تو قید خانہ میں ہیں یا مارے جا چکے ہیں ان کو روتے دیکھ کر خود سلطان کی آنکھوں میں آنسو آگئے ان کو تسلی دی، پھر ان کے شوہروں کو قید خانہ سے آزاد کیا اور جن کے شوہر مر چکے تھے انھیں خزانے سے اتنے روپے دلوائے کہ جہاں وہ گئیں سلطان کی فیاضی کا چرچا کیا۔'' (ایضاً ص ۲۰۴)

سلطان کے ان اوصاف پر تبصرہ کرتے ہوئے یہی عیسائی مورخ لکھتا ہے:

''سلطان کے ان احسانات پر غور کرتے ہیں تو وہ وحشیانہ حرکتیں یاد آتی ہیں جو شروع کے صلیبیوں نے ۱۰۹۹ء میں یروشلم کی فتح پر کی تھیں، جب گوڈفرے اور تنکرو یروشلم کے کوچہ اور بازار میں گذرے تھے تو وہاں مردے پڑے اور جاں بہ لب زخمی لوٹتے تھے، جب کہ بے گناہ اور لاچار مسلمانوں کو ان صلیبیوں نے سخت اذیتیں دے کر مارا تھا اور زندہ آدمیوں کو انھیں نے جلایا تھا جہاں قدس کی چھتوں اور برجوں پر جو مسلمان پناہ لینے چڑھے تھے وہیں ان صلیبیوں نے انھیں اپنے تیروں سے چھید کر گرا دیا تھا

اور جہاں ان کے اسی قتل عام نے مسیحی دنیا کی عزت کو بٹہ لگایا تھا جب اس مقدس شہر کو ظلم و بدنامی کے رنگ میں انھوں نے رنگ دیا تھا، جہاں رحم و محبت کا وعظ جناب مسیح نے سنایا تھا اور فرمایا تھا کہ خیر و برکت والے ہیں وہ لوگ جو رحم کرتے ہیں ان پر خدا کی برکتیں نازل ہوتی رہتی ہیں، جس وقت یہ عیسائی اس پاک اور مقدس شہر کو مسلمانوں کا خون کر کے اس کو مذبح بنا رہے تھے، جس وقت وہ اس کلام کو بھول گئے تھے اور یہ ان بے رحم عیسائیوں کی خوش قسمتی تھی کہ سلطان صلاح الدین کے ہاتھوں ان پر رحم و کرم ہو رہا تھا، صفات خداوندی میں سب سے بڑھ کر صفت رحم ہے، رحم عدل کا تاج اور اس کا جلال ہے، جہاں عدل اپنے اختیار اور استحقاق سے کسی کو جان سے مار سکتا ہے، رحم جان بچا سکتا ہے، اگر سلطان صلاح الدین کے کاموں میں صرف یہی کام دنیا کو معلوم ہوتا کہ اس نے کس طرح یروشلم کو بازیاب کیا تو صرف یہی کارنامہ اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کافی تھا کہ وہ نہ صرف اپنے زمانہ کا بلکہ تمام زمانوں کا سب سے بڑا عالی حوصلہ اور جلالت و شہامت میں یکتا اور بے مثل شخص تھا۔" (سلطان صلاح الدین از اسٹینلی لین پول اردو ترجمہ از مولوی محمد عنایت اللہ دہلوی ص ۲۰۵-۱۹۹)

اسٹینلی لین پول سلطان کی رواداری کے اوصاف بیان کرنے میں بالکل نہیں تھکتا، اپنی کتاب ختم کرنے سے پہلے سلطان کی وفات کے ذکر میں لکھتا ہے کہ لڑائی ختم ہوگئی اور سلطان یروشلم میں تھا تو سالزبری کا اسقف زائرین کے ساتھ وہاں کی مقدس جگہوں کی زیارت کے لیے پہونچا تو سلطان نے اسے کہلا بھیجا کہ اس کے قیام کے لیے مفت مکان موجود ہے، اسقف نے یہ کہہ کر انکار کیا کہ وہ اپنے ہمراہیوں کے ساتھ صرف زیارت کے لیے آیا ہے، چند روز کے بعد وہ سب واپس چلے جائیں گے، اس کے بعد سلطان نے اپنے خدام کو حکم دیا کہ وہ اسقف اور اس کے ہمراہیوں کی خدمت کرتے رہیں، پھر اس کو قیمتی تحائف بھیجے، اپنے یہاں مدعو بھی کیا اور اس کو صلیب مقدس کی زیارت بھی کی، جب یہ

ملاقات ختم ہوئی تو سلطان نے اس سے دریافت کیا کہ وہ کوئی چیز چاہتا ہے تو وہ بیان کرے، اسقف نے مہلت مانگی، دوسرے دن اس نے درخواست گذرانی کہ وہ رومن کیتھولک مذہب کے قسیسوں کو اجازت دے کہ وہ تربت مسیح پر شامی عیسائیوں کے ساتھ خدمات دینیہ ادا کرنے میں مدد کریں اور نذر و نیاز سے جو آمدنی ہو اس میں سے ان قسیسوں کو گذارا دیا جائے، اسقف نے اس کی بھی درخواست دی کہ بیت اللحم اور ناصرہ میں بھی یہی سہولتیں دی جائیں، سلطان نے دونوں باتیں منظور کرلیں، اسقف نے اپنی مرضی سے قسیس مقرر کیے اور اس طرح ان کی عبادت کا معقول انتظام ہوگیا۔ (ایضاً ص ۱۴-۳۱۳)

یہ واقعہ بھی ذکر کرنے کے لائق ہے کہ جب صلاح الدین کرک کے محاصرہ میں تھا تو یروشلم کے فرماں روا کی سوتیلی بہن ازابیلا کی شادی کی تقریب کا جشن وہاں منایا جارہا تھا صلاح الدین نے اپنے اس دشمن کے پاس شادی کا کھانا بھیجا اور فوج کو حکم دیا کہ جس برج میں دولہا و دلہن ہیں اس پر تیر نہ پھینکے جائیں۔ (ایضاً ص ۰۵-۲۰۴)

عیسائیوں کے انتقامی جذبات: سلطان کی اس رواداری کے باوجود عیسائی اپنی شکست کو کبھی نہ بھولے، اس کے بعد وہ پورے غیظ و غضب کے ساتھ چھ اور صلیبی لڑائیاں لڑے، جن میں جرمنی، انگلستان، فرانس، آسٹریا، برگنڈی کے فرماں روا، ان کے آہن پوش فوجی سردار، قسطنطنیہ کے شہنشاہ کا بھتیجا، پوپ انوسنٹ، کلیسا کے راہب وغیرہ باری باری ان لڑائیوں میں شریک ہوتے رہے مگر یروشلم پر ان کا قبضہ نہ ہوسکا اور بقول ارچر کنکسفورڈ صلیبی مسلمانوں کی یکجائی کو درہم برہم کرنے یروشلم گئے تھے مگر خود ہی انتشار میں مبتلا ہوگئے، ان میں انگریزوں اور فرانسیسیوں میں اتنا اختلاف پیدا ہوگیا کہ دونوں مل کر صلیبی لڑے مگر ایک دوسرے کی کامیابیوں کو برداشت نہیں کرسکتے تھے پھر ان کی کشمکش اتنی بڑھی کہ ایک صدی تک جاری رہی (کریسیڈ از آرچر اینڈ کنکسفورڈ ص ۴۲) ان لڑائیوں کی وجہ سے جرمنی کی سیاست بھی ایسی الجھی کہ اس کے سلجھنے میں بڑی دیر لگی، لیتھونیا کے نائٹوں کی شرکت کی وجہ سے پروشیا کی سیاست بھی ایسی بدلی کہ اس کے بعد جدید پروشیا کی بنیاد پڑی (ایضاً) ان لڑائیوں کا سب سے زیادہ اثر بازنطینی سلطنت پر پڑا، اس کی سرحد یورپ میں دریائے ڈینوب

اور ایشیا میں اناطوبیہ اور شام تک پھیلی ہوئی تھی، قسطنطنیہ نہ صرف اس سلطنت بلکہ یورپ کا حصن حصین تھا، اس کو مسلمان فتح نہ کر سکے تھے مگر جب چوتھی صلیبی جنگ کے سلسلہ میں صلیبیوں نے اس کو لوٹ کر برباد کر دیا اور وہاں فلانڈرس کا رئیس شہنشاہ بنا دیا گیا تو قدیم شہنشاہی کی طرح یہ طاقتور نہیں رہ سکی، یہ تباہ ہوگئی تو یونانی شہنشاہی قائم ہوئی مگر اس کو بھی پرانی قوت حاصل نہ ہوسکی اور کمزور ہوتی گئی۔ (تاریخ یورپ از اے. جے. گرانٹ ص۲۶۲)

مگر مسلمانوں کے خلاف یورپ کے پورے عیسائیوں کی معاندانہ سازش جاری رہی، وہ صلیبی جنگ کی شکست کو کبھی بھولے نہیں، ایوبی خاندان پر زوال آیا پھر مسلمانوں کی علاقائی حکومتیں جو جا بجا قائم تھیں وہ ختم ہوتی گئیں جن میں ان عیسائیوں کی ریشہ دوانیاں بھی شامل تھیں، عباسیوں اور فاطمیوں کی حکومتیں بھی ختم ہوئیں، سلجوقی، غزنوی اور خوارزم شاہی حکومتیں بھی جاتی رہیں مگر دولت عثمانیہ ابھری تو روز بروز طاقت ور بنتی گئی، اندلس کی حکومت بھی قائم تھی، ہندوستان میں سلاطین دہلی بھی با اثر قوت بن رہے تھے اور جب مغلیہ حکومت قائم ہوئی تو یہ دنیا کی طاقت ور ترین اور مہذب ترین حکومت بن گئی، عیسائی مسلمانوں کے اس عروج کو کب گوارا کر سکتے تھے، ان کے خلاف ان کے مخاصمانہ جذبات ابھرتے رہے، ذرا اب یہ دیکھنا ہے کہ دولت عثمانیہ کے خلاف ان کی کیا کیا سرگرمیاں رہیں۔

دولت عثمانیہ اور عیسائی: دولت عثمانیہ چھ سو برس سے زیادہ یورپ، ایشیا اور افریقہ پر اپنا پرچم لہراتی رہی، اس کا انتہائی عروج اس وقت ہوا جب اس میں جزائر سائپرس اور کریٹ کے علاوہ بحر کیسپین سے بحر روم پھر بودائے بصرہ، مصر و شام اور عدن کی پہاڑی سے عرب کے جنوبی ساحل تک کے علاقے اس کے زیر نگیں رہے، بحر ہند اور بحر احمر پر بھی اس کا قبضہ رہا تاریخ میں تین امپائر یاد کیے جاتے ہیں، رومن امپائر، ٹرکش امپائر اور برٹش امپائر، دولت عثمانیہ کا فرماں روا سلیمان اعظم فخر کرتا تھا کہ وہ بہت سی مملکتوں کا فرماں روا، تین براعظموں کا شہنشاہ اور دو بحروں کا مالک ہے، سلیم ثالث کی سلطنت میں یورپ، ایشیا اور افریقہ کی چھبیس ولایتیں شامل رہیں، فرانسیسی مورخ ولاثرون کینر کے بقول ترک تین چوتھائی دنیا کے مالک تھے اور سترہویں صدی عیسوی تک ترکی یورپ کی سب سے زبردست طاقت تھے۔

عثمان خان کی خوبیاں: مگر یہ حقیقت ہے کہ عیسائیوں نے ان ترکوں کو کبھی چین لینے نہیں دیا، ان کو دکھ تھا کہ یورپ میں مسلمانوں کی حکومت کیسے قائم ہوگئی، حالانکہ ان میں بہت سے فرماں روا ایسے تھے جن کی رواداری اور جہاں بانی پر دنیا فخر کرسکتی تھی، اس خاندان کا دوسرا فرماں روا عثمان خان اول تھا جو ارطغرل کا بیٹا تھا، اسٹینلی لین پول اس کے متعلق لکھتا ہے: ایک سلطان ہونے کے باوجود وہ اپنی سادگی میں خلفائے راشدین کی یاد تازہ کرتا تھا، وہ اپنے گوناگوں اوصاف کے لیے ایسا مشہور رہا کہ اس کی تلوار محفوظ رکھی گئی، جو اس حکومت کے ہر نئے حکمراں کی کمر میں یہ دعا مانگ کر باندھی جاتی کہ اللہ تعالیٰ اس میں عثمان ہی جیسی خوبیاں پیدا ہوں، وہ جب مرا تو اس کے مکان میں صرف ایک کفتان، ایک سوتی عمامہ، لکڑی کا ایک چمچہ، ایک نمک دان، چند گھوڑے، زراعت کے لیے چند جوڑی بیل، بھیڑوں کے کچھ گلے اور اسلحہ کے علاوہ اور کوئی قیمتی چیز نہ تھی۔ (ترکی از اسٹینلی لین پول ص ۲۴-۲۳، ۱۸۸۸ء ایڈیشن)

اس کی لڑائیاں بازنطینی حکومت سے ہوتی رہیں لیکن وہ شکست کھاتی رہی اور اس کے کئی قلعے اور مورچے اس کے زیرنگیں ہوتے گئے، بازنطینیوں نے دشمنی میں تاتاریوں کو عثمانی سلطنت پر حملہ کرنے کی دعوت دی، وہ حملہ آور ہوئے لیکن وہ بھی شکست کھا گئے، عثمان کے زمانہ میں بازنطینیوں نے ایشیائے کوچک کے بیشتر علاقے خالی کردیے، اسی طرح اس کی حکومت کے اندر بڑی تعداد میں یونانی اور سلانی باشندے رہنے لگے جو مسلمان ہوکر ترکوں میں گھل مل گئے، لارڈ ایورسلے نے لکھا ہے کہ یہ عیسائی کسی جبر کے بغیر مسلمان ہوئے کیونکہ اس زمانہ میں کوئی قتل عام نہیں ہوا اور نہ قیدیوں کو غلام بنا کر فروخت کیا گیا بلکہ ان کے اسلام لانے کی وجہ یہ ہوئی کہ قسطنطنیہ کے یونانیوں نے ان کو بالکل چھوڑ رکھا تھا وہ اسلام میں داخل ہوئے تو شادی بیاہ کے ذریعہ سے ایسے گھل مل گئے کہ وہ بھی عثمانی کہلانے لگے (دی ٹرکش امپائر از لارڈ ایورسلے ص ۱۷-۱۶، ۱۹۲۴ء ایڈیشن) لارڈ ایورسلے رقم طراز ہے کہ عثمان مذہب اور نسل کی تفریق نہیں کرتا اور اپنی پوری رعایا کے ساتھ انصاف کرتا، جنگ میں مال غنیمت کو اپنے سپاہیوں میں برابر تقسیم کردیتا، کچھ غرباء کے لیے بھی محفوظ رکھتا (ایضاً

ص ۱۷)اور جب وہ اپنے بستر مرگ پر تھا تو اپنے جانشین اور خان کو یہ نصیحت کی کہ وہ اپنی رعایا کی فلاح و بہبود کا پورا خیال رکھے، اس سے اس کو اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم حاصل ہوتا رہے گا۔ (ایضاً ص ۱۹)

ایڈورڈ کریسی نے لکھا ہے کہ اس میں دوسرے لوگوں کے پیار اور محبت حاصل کرنے اور ان کے لیے ان کا سرگرم بنانے کی بڑی صلاحیت اور قوت تھی اور یہی امپائر کے بانیوں کی خوبی ہوتی ہے۔ (دی اوٹومن ٹرکش ج ا ص ۱۸-۱۷، ۱۸۵۸ء ایڈیشن) اس کی حکومت ۱۲۸۵ء سے ۱۳۲۶ء تک رہی۔

اورخان کی رواداری: اورخان حکمراں (۱۳۸۰ء-۱۳۲۶ء) ہوا تو بازنطینی ایشیائے کوچک کے علاقے واپس لینے کے لیے عثمانی سلطنت پر حملہ آور ہو گئے، شہنشاہ اینڈرومیکس لڑائی میں زخمی ہو کر واپس ہو گیا اور اس کے کچھ علاقے اورخان کے زیر نگیں ہو گئے، اسی کے بعد جیبیا کا دارالسلطنت بھی عثمانیوں کے قبضہ میں آ گیا، اسٹینلی لین پول کی تاریخ میں ہے کہ ان فتوحات کے بعد مفتوحین کو اختیار دیا گیا کہ وہ اپنا قیمتی اور ضروری سامان لے کر جہاں چاہیں جا سکتے ہیں، اس طرح فاتحوں کی پوزیشن وہاں مضبوط ہو گئی (ترکی از اسٹینلی لین پول ص ۲۵) لارڈ ایورسلے کا بیان ہے کہ بعض مفتوحین نے خود سے اسلام قبول کر لیا اور یورپ جانا پسند نہیں کیا (دی ٹرکش امپائر ص ۲۲) بازنطینیوں نے اورخان سے صلح کر لی تو بیس برس تک عثمانیوں کو امن سے حکومت کرنے کا موقع ملا، اس اثنا میں اورخان نے ایک ہزار عیسائی لڑکوں کو منتخب کر کے انھیں فوجی تعلیم دینی شروع کی اور ان کے ذریعہ سے جو فوج تیار ہوئی وہ ینی چیری کہلانے لگی، یہ سلسلہ تین سو سال تک برابر جاری رہا، ان میں کچھ اپنی خوشی سے مسلمان ہو جاتے ینی چیری نے عثمانی سلطنت میں اہم کردار ادا کیا۔ (ترکی اسٹینلی لین پول ص ۲۸-۲۷)

اورخان کو بازنطینیوں سے اس وقت تصادم کرنے کا موقع ملا جب وہاں خانہ جنگی شروع ہو گئی، شہنشاہ اینڈرونیکس کا انتقال ۱۳۲۸ء میں ہوا تو اس کا گرینڈ چانسلر کنٹا کوزین اس کے نابالغ لڑکے ملپیلوگس کا ولی بن گیا اور ملکہ اینا کے ساتھ اس کا مدار المہام مقرر ہوا لیکن چار برس کے بعد کنٹا کوزین خود شہنشاہ بن بیٹھا جو ملکہ کو ناگوار گذرا اور خانہ جنگی شروع

ہوگئی، دونوں نے اورخان سے مدد مانگی، کنٹا کوزین نے اپنی لڑکی تھیوڈرا کو اورخان کی بیوی بنانے کے بدلہ میں چھ ہزار عثمانی سپاہی مانگے، اورخان نے یہ شرط منظور کرلی اور یہ شادی بہت دھوم دھام سے رچائی گئی، اورخان داماد بن کر اپنے خسر کے یہاں قسطنطنیہ بھی گیا۔ (کریسی ج ا ص ۲۹)

کنٹا کوزین نے اس فوج کی مدد سے قسطنطنیہ کا محاصرہ کرلیا، ایک سال کے بعد ملکہ سے اس بات پر صلح ہوئی کہ کنٹا کوزین اس کی بیوی، ملکہ اینا اور شہزادہ جان پلیلوگس چاروں تخت نشین کردیے جائیں، اس تاج پوشی کے بعد کنٹا کوزین نے اپنی ایک لڑکی کی شادی شہنشاہ جان سے کردی، شہزادی تھیوڈرا اورخان کی بیوی بنی رہی اور اس کو مسیحیت پر قائم رہنے کی اجازت دے دی گئی، ۱۳۴۵ء میں سرویا کے حکمراں اسٹیفن ڈوشن سالونیکا پر حملہ کرکے قسطنطنیہ پر یلغار کرنا چاہتا تھا کہ کنٹا کوزین اور جان پلیلوگس دونوں اورخان سے پھر مدد کے خواستگار ہوئے۔

اورخان نے اس مرتبہ بیس ہزار لشکری بھیجے اور اسٹیفن ڈوشن کو مراجعت کرنے پر مجبور کیا لیکن کچھ دنوں کے بعد کنٹا کوزین نے تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے تو ملکہ اور پلیلوگس میں خانہ جنگی شروع ہوگئی، کنٹا کوزین نے اورخان سے پھر مدد مانگی، اس کے بدلے یوروپین ساحل کا ایک قلعہ پیش کرنے کا وعدہ کیا، اورخان کی مدد سے وہ تخت و تاج کا مالک بن بیٹھا، اس کے بعد اورخان کے قبضہ میں گیلی پولی آگیا، جس کے بعد عثمانیوں کا قدم یورپ میں جمنے لگا، قسطنطنیہ میں کنٹا کوزین کے خلاف پھر بغاوت ہوئی، جس کے بعد وہ حکومت سے دست بردار ہوگیا اور جان پلیلوگس تخت پر بیٹھایا گیا، اس نے پچاس برس تک حکومت کی مگر یہ روز بروز اتنی کمزور ہوتی گئی کہ اس کے شہنشاہ نے دولت عثمانیہ کا ایک باج گذار بن کر رہنے پر اکتفا کرلیا۔ (دی ٹرکش امپائر از لارڈ ایور سلے ص ۲۹-۲۶، ۱۹۲۴ء ایڈیشن)

ان واقعات سے عثمانیوں کی رواداری کا اندازہ ہوگا، وہ بازنطینیوں کی مدد بھی کرتے رہے اور ان سے شادی بیاہ کا رشتہ بھی قائم کیا، وہ چاہتے تو قسطنطنیہ کو اپنے

زیرنگیں کرسکتے تھے مگر ایسا کرنا پسند نہیں کیا۔

مراد اول اور مسیحی حکومتیں: عثمانیوں کی بڑھتی ہوئی قوت کو یورپ کے عیسائی گوارا نہ کرسکے، روم کے کلیسا کو بھی تردد پیدا ہوا تو پوپ اربن پنجم نے ہنگری، سرویا، بوسینا اور ولاچیا کے فرماں رواؤں کو آمادہ کیا کہ وہ مل کر عثمانیوں کی حکومت پر ضرب کاری لگائیں ۱۳۶۲ء میں ان اتحادیوں نے مل کر اعلان کیا کہ وہ مسلمانوں کو یورپ سے نکال باہر کرکے دم لیں گے مگر اورخان کے جانشین مراد اول نے ان کو مارٹیزا کی جنگ میں شکست فاش دی، اس جنگ کے بعد بلقان کے جنوب کا سارا علاقہ سلطنت عثمانیہ کے زیرنگیں ہوگیا، مراد نے اب اپنا دارالسلطنت پہلے یورپ میں تھریس کے پاس ڈیموٹیکا میں بنایا پھر ادرنہ منتقل کردیا، جنگ مارٹیزا کے بعد قسطنطنیہ کے شہنشاہ اینڈ رونکس نے اپنی حفاظت کی خاطر سلطان مراد کا باج گذار ہونا منظور کرلیا اور لڑائی کے موقع پر عثمانیوں کو مدد کرنے کا بھی وعدہ کیا مگر وہ یورپ کی حکومتوں کو مراد کے خلاف ابھارنے کی کوشش میں بھی لگا رہا، اس نے اپنے عقائد کے خلاف کلیسائے رومہ کی برتری تسلیم کرلی لیکن وہ مراد کے خلاف کلیسا اور یورپ کی اور عیسائی حکومتوں کو نہ ابھار سکا وہ اتنا نادار ہوچکا تھا کہ وینس کے ساہوکاروں سے رقم لے کر اس نے رومہ کا سفر کیا تھا، جب وہ رومہ سے واپس ہورہا تھا تو وینس کے ساہوکاروں نے اس کو گرفتار کرلیا، اس کے بڑے لڑکے نے اس کو آزاد کرانا پسند نہیں کیا لیکن اس کے چھوٹے لڑکے بنویل نے قرض کسی طرح ادا کردیا جس کے بعد شہنشاہ نے قسطنطنیہ آکر اس کو تاج وتخت کا شریک بنالیا، اینڈ رونکس کے بڑے لڑکے نے مراد کے چھوٹے لڑکے شہزادہ صادوجی سے مل کر ایک سازش کی کہ اینڈ رونکس اور سلطان مراد دونوں کو تخت سے اتار کر اپنے اپنے علاقہ میں فرماں روا بن جائیں مگر یہ دونوں شہزادے ناکام رہے، شہنشاہ قسطنطنیہ نے ایک جدید معاہدہ کے بعد دولت عثمانیہ کی باج گذاری ازسرنو تسلیم کرلی، مراد کی قوت یورپ میں بڑھتی گئی، بلغاریہ، مقدونیہ اور سرویا بھی اس کے زیرنگیں ہوگئے اور یہ اس کے باج گزار رہے، بلغاریہ کے بادشاہ نے تو اپنی لڑکی بھی مراد کو پیش کی، مراد کی قوت بڑھتی گئی یہ مسیحی حکومتوں کو کب گوارا ہوسکتا تھا، اس لیے ایک بار پھر سرویا، بوسینا، بلغاریہ، البانیا، ولاچیا اور ہنگری نے ایک عظیم الشان اتحاد کرکے ترکوں

کے استیصال کا بیڑا اٹھایا، ۱۳۸۹ء میں کسووا کے مقام پر مراد سے ایک زبردست جنگ ہوئی، ایک سروی لشکری نے پرفریب طریقہ پر مراد کے پاس پہونچ کر اس پر خنجر سے وار کیا، جس سے اس کو کاری زخم لگا مگر اسی حالت میں وہ جنگ کی قیادت کرتا رہا، یہاں تک کہ اس کو فتح ہوئی جس کے بعد یہ حکومتیں دولت عثمانیہ کی باج گزار بنی رہیں، گو وہ کچھ نہ کچھ لڑائیاں لڑتے رہے۔ (مزید تفصیلات لارڈ ایڈورڈ کریسی کی کتاب دی اوٹومن ٹرکش باب سوم اور اسٹینلی لین پول ٹرکی کے باب سوم میں اور لارڈ ایور سلے کی ٹرکش امپائر باب سوم میں ملیں گے)

مراد کے بارہ میں یوروپی مورخ لکھتے ہیں کہ جہاں بانی میں اپنی سختی کے باوجود نرم دل تھا، اس سے لوگ محبت بھی کرتے اور ڈرتے بھی، بہت کم بولتا اور جو کچھ کہتا اس میں بڑی گہرائی ہوتی۔ (لارڈ ایور سلے: ص ۴۳، لین پول ص ۴۶)

اس نے مسیحی حکومتوں کو اپنے زیر نگیں ضرور کر لیا لیکن عیسائیوں کو پوری مذہبی آزادی دے رکھی تھی، اس کا ثبوت اس خط سے ملتا ہے جو ۱۳۸۵ء میں یونانی کلیسا کے بطریق اعظم نے پوپ اربن ششم کو لکھا تھا، بطریق مذکور نے اقرار کیا ہے کہ مراد نے کلیسا کو کامل آزادی دے رکھی تھی، اسی کا نتیجہ تھا کہ ۱۳۶۰ء سے ۱۳۸۹ء تک بطریق اعظم کے دفتر میں کوئی ایک شکایت بھی عثمانیوں کے ہاتھوں ارباب کلیسا کے ساتھ بدسلوکی کی درج نہیں ملتی۔ (ہربرٹ گبنس ص ۱۷۸، تاریخ دولت عثمانیہ ج ۱ ص ۵۳ شایع کردہ دارالمصنفین اعظم گڑھ)

بایزید اول یلدرم اور شہزادی ڈسپینا: مراد اول کے جانشین بایزید اول یلدرم (۱۴۱۲ء-۱۳۸۹ء) پر عیسائیوں سے نپٹنے میں سخت وقت گذرا، سرویا شروع میں اس کا سخت مخالف رہا لیکن آخر میں اس کو مصالحت کرنی پڑی، سرویا کے حکمراں نے اپنی بہن ڈسپینا کو بایزید کے نکاح میں دے دیا، جس کے بدلے میں اس نے سرویا کی خود مختاری قائم رکھی، اس نے قسطنطنیہ کے فرماں روا جان پلیلوگس سے ایک جدید صلح نامہ کیا، جس کی رو سے شہنشاہ اس کا باج گزار ہو گیا اور ایشیائے کوچک کا ایک قلعہ فلاڈلفیا بایزید کے حوالہ کرنے کا وعدہ کیا اور جب فلاڈلفیا کے یونانی افسروں نے اس کو خالی کرنے سے انکار کیا تو شہنشاہ کی یونانی فوج نے اس کو خالی کرا کے بایزید اول یلدرم کے حوالہ کیا، جب جان پلیلوگس نے قسطنطنیہ میں

تین گرجے مسمار کر کے ان کے سامان سے نئے قلعے تعمیر کرانے کی کوشش کی تو بایزید یلدرم نے اس کو ایسا کرنے سے روکا لیکن وہ چند دنوں کے بعد وفات پا گیا، اس کا لڑکا مینویل بایزید یلدرم کے یہاں نظر بند تھا وہ اس کے یہاں سے بھاگ گیا اور اس کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تو بایزید اپنی فوج لے کر وہاں پہونچا اور قسطنطنیہ کا محاصرہ کرلیا لیکن اس محاصرہ کا خاتمہ بازنطینی حکومت کے ایک بار پھر باج گذار بن جانے پر ہوا، ادھر ولاچیا اور بلغاریہ نے بایزید یلدرم کو چین لینے نہیں دیا اور وہ اس کے خلاف لڑائیاں لڑتے رہے، بایزید ان سب کو مغلوب کرتا رہا پھر ان عیسائیوں نے اپنا محاذ بدل دیا، بایزید یلدرم کے حرم میں شہزادی ڈسپینا آ گئی تھی اس نے اس کو شراب نوشی کی ترغیب دی اور اس کے بعد ہر قسم کی فاسقانہ زندگی کی طرف مائل کیا جس میں اس کے اسلاف کبھی مبتلا نہ ہوئے تھے، ان عیسائیوں کا وطیرہ یہ بھی رہا کہ جب وہ مسلمان حکمرانوں اور فاتحوں کو مغلوب نہیں کر سکتے تو وہ اپنی شہزادیوں اور عورتوں کو بھیج کر ان کو مغلوب کر لیتے۔

بایزید یلدرم کے زمانہ میں صلیبی جنگ: بایزید اپنے محل میں اپنی عیاشانہ زندگی میں مشغول تھا تو ہنگری کے بادشاہ سجمنڈ نے فرانس، جرمنی، لوریا اور آسٹریا وغیرہ سے مل کر ایک جرار لشکر اس خیال سے تیار کیا کہ بایزید کی قوت توڑنے کے بعد قسطنطنیہ کی طرف یلغار کی جائے پھر درۂ دانیال کو مجبور کر کے یروشلم کو مسلمانوں سے آزاد کرایا جائے، پوپ بونی فیس نہم نے بھی ان کی مدد میں صلیبی جنگ کا اعلان کر دیا (کریسی ج ا ص ۵۵) صلیبی جنگ کی فضا ایک بار پھر پیدا ہو گئی، ایک لاکھ مسیحی فوج ثواب، ناموری اور شہرت کے خیال سے ترکوں کی طرف بڑھی اور چھوٹی چھوٹی لڑائیاں لڑنے کے بعد نائکوپولس میں عیسائیوں سے ۱۳۹۶ء میں ایک زبردست معرکہ ہوا، جس میں یہ صلیبی بایزید یلدرم کی سپہ گری کی وجہ سے بری طرح شکست کھا گئے، ان کے ہزاروں سپاہی کام آئے اور دس ہزار گرفتار کر لیے گئے، سی جس منڈ جان بچا کر بھاگا مگر جن ترکوں نے مغلوب ہو کر جان بخشی کے وعدہ پر ہتھیار ڈال دئے تھے، انھیں عیسائیوں نے قتل کر ڈالا، بایزید یلدرم نے اس غصہ اور رنج میں عیسائی قیدیوں سے اسی طرح کا بدلہ لیا، ان اتحادیوں میں کونٹ ڈی نیورس اور اس کے چوبیس ساتھی ایک سال تک

زیر حراست رہے اور جب ان کا زرفدیہ فرانس سے آگیا تو بایزید یلدرم نے ان کو وطن جانے کی اجازت دے دی، رخصت ہوتے وقت جب ان لوگوں نے اس کی خدمت میں حاضر ہو کر اس کے لطف، عنایت اور حسن سلوک کا شکریہ ادا کیا تو بایزید نے ان کو مخاطب کر کے یہ تقریر کی:

''مجھے خوب معلوم ہے کہ تم اپنے ملک میں ایک بڑے سردار ایک طاقت ور رئیس کے لڑکے ہو، تم جوان ہو اور ابھی تمہارے لیے امید کے بہت سے سال باقی ہیں، ممکن ہے کہ میدان جنگ میں تمہاری اس پہلی کوشش کی ناکامی پر لوگ تمہیں قابل الزام ٹھہرائیں اور تم اس اتہام کو رفع کرنے اور اپنی شہرت اور نیک نامی کو دوبارہ حاصل کرنے کی غرض سے ایک طاقت ور فوج اکٹھا کر کے میرے مقابلہ میں جنگ کے لیے آؤ، اگر میں تم سے ڈرتا تو تم سے اور تمہارے ساتھیوں سے تمہارے ایمان اور عزت پر حلف لے لیتا کہ نہ تم اور نہ وہ کبھی میرے مقابلہ میں ہتھیار اٹھائیں گے، لیکن نہیں! میں ایسی حلف کا مطالبہ نہ کروں گا، برخلاف اس کے میں خوش ہوں گا تم اپنے ملک میں واپس پہونچ کر ایک فوج جمع کرو اور اس کو لے کر یہاں آؤ مجھے ہمیشہ میدان جنگ میں اپنے مقابلہ کے لیے تیار پاؤ گے، میں اس وقت جو بات کہہ رہا ہوں اس کو تم جس شخص سے بھی چاہو نقل کر دینا کہ میں ہمیشہ جنگی کارناموں پر اپنی فتوحات کی توسیع کے لیے تیار اور خواہش مند رہتا ہوں۔''

اس تقریر میں کیسی رواداری، فراخ دلی اور سیر چشمی ہے جو کسی فاتح میں کم پائی جاتی ہے۔

بایزید اول یلدرم نے ولاچیا، آسٹریا، ہنگری اور سرویا پر اپنا تسلط قائم کر کے یونان کو بھی زیر نگیں کر لیا مگر قسطنطنیہ کسی نہ کسی صورت سے اس کے لیے دردسر بنا رہا، اس لیے اس نے قسطنطنیہ پر اپنا تسلط قائم کر کے صدیوں کی آویزش کو ختم کر دینا چاہا لیکن عین اس وقت

جب وہ قسطنطنیہ پرحملہ کی تیاری کررہا تھاتو تیموراس کے سر پر بلائے ناگہانی کی طرح نمودار ہوا اوراس کی فوج نے انگورہ کی جنگ میں اس کو شکست فاش دے کر اس کو اپنا قیدی بنالیا اور یہ قیدی کون تھا جس نے سلطنت بازنطینی، سرویا، ولاچیا، بوسینا اور یونان کے بیشتر حصے کو اپنا باج گذار بنالیا تھا اور یورپ کی متحدہ قوت کو شکست دے کر صلیبی جنگ کی تحریک بالکل ملیامیٹ کردی تھی، تیمور کی یہ یلغار مسلمانوں کی تاریخ میں غداری ہی پر محمول کی جاسکتی ہے (اوپر کی ساری تفصیلات ایڈورڈ کریسی کی دی اوٹومن ٹرکش باب سوم، اسٹینلی لین پول کی ٹرکی کے باب سوم اور چہارم، لارڈ ایورسلے کی دی ٹرکش امپائر کے باب چہارم اور دارالمصنفین کی شائع کردہ تاریخ دولت عثمانیہ جلد اول کے باب بایزید اول یلدرم سے لی گئی ہیں، بایزید کی مذکورہ بالا تقریر اسٹینلی لین پول کی کتاب کے ص ۵۹-۵۸ پر ہے، اردو ترجمہ تاریخ دولت عثمانیہ جلد اول کے ص ۶۷-۶۶ پر ہے)

محمد اول کی قوت اور کشادہ دلی: تیمور کے حملہ کے بعد عیسائی خوش تھے کہ عثمانی سلطنت کا خاتمہ ہوگیا، بلغاریہ، بوسینا اور ولاچیا کی عیسائی رعایا بغاوت پر آمادہ ہوگئی، بازنطینی حکمراں نے پھر سے اپنے مقبوضات واپس لینے کی کوشش کی لیکن بایزید اول یلدرم کے جانشین محمد اول نے اپنی حکومت کی دھاک بٹھا کر دولت عثمانیہ کی عظمت پھر از سر نو قائم کردی، سلطنت کے تمام علاقے واپس لیے بلکہ اس کی حکمت عملی سے اس حکومت میں زیادہ طاقت پیدا ہوگئی، اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس میں بڑی کشادہ دلی اور منصف مزاجی تھی، لارڈ ایورسلے اس کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> ''اپنے امپائر کے حکمراں کی حیثیت سے اس میں بڑے عظیم اوصاف تھے، وہ ایسے لقب سے مشہور ہوا جس کا انگریزی میں گریٹ جنٹلمین (عظیم شریف آدمی) ترجمہ کیا جاسکتا ہے اور وہ اس لقب کا مستحق تھا، وہ بڑا کشادہ دل، عالی دماغ اور انصاف پسند تھا، وہ جانتا تھا کہ اس کا امپائر محض قوت کی وجہ سے برقرار نہیں رہ سکتا ہے، اس کو قائم رکھنے میں انصاف اور رحم دلی ضروری ہے، اس کی عیسائی رعایا کے ساتھ ہر جگہ مہربانی اور

رعایت کی جاتی، عیسائیوں کے ساتھ کوئی بھی زیادتی ہوتی تو اس کو وہ
برداشت نہیں کرتا تھا، وہ ایک جنرل کی اپنی طاقت سے زیادہ اپنی حکمرانی
کے اوصاف کی وجہ سے زیادہ مشہور ہوا، منگولوں کے حملہ کی وجہ سے یہ
حکومت غیر معمولی مشکلوں میں پڑ گئی تھی لیکن یہ پھر سے اس لیے ابھری کہ
عثمانیوں میں یونانی عیسائی فرقوں کے مقابلہ میں زیادہ اچھے اوصاف تھے
جن کی بدولت ان کی حکومت میں پائداری پیدا ہوتی رہی۔'' (دی ٹرکش
امپائر ص ۶۳-۶۲)

مراد ثانی کے خلاف مسیحی اتحاد: عثمانیوں کے سارے اوصاف عیسائیوں کے تعصب اور غیر رواداری کے سامنے ہیچ تھے، محمد اول کا جانشین مراد ثانی (۱۴۵۱ء-۱۴۲۱ء) ہوا تو وہ کمسن تھا، اس کی کم سنی سے فائدہ اٹھا کر شہنشاہ قسطنطنیہ نے اپنے قید خانے سے ایک آدمی کو رہا کر کے اس کو سلطان بایزید یلدرم کا لڑکا مصطفےٰ قرار دیا اور عثمانی سلطنت کا دعویدار بنا کر مراد ثانی کے مقابلہ میں کھڑا کر دیا اور اس سے وعدہ لیا کہ وہ کامیاب ہوا تو شہنشاہ کو ان علاقوں کو واپس کر دے گا جو عثمانیوں کے قبضہ میں آچکے تھے، جب اس کو لڑنے پر آمادہ کیا گیا تو اس کے ساتھ بازنطینی فوج بھی ہوگئی مگر یہ مصطفےٰ آخر میں گرفتار ہوا اور مراد نے اس کو سولی دے دی، مراد نے بازنطینی شہنشاہ کی غداری کے جواب میں اپنی فوج بھیج کر قسطنطنیہ کا محاصرہ کر لیا لیکن بازنطینی شہنشاہ نے عثمانی سلطنت کے ایک دوسرے دعویدار کو ایشیا یے کوچک میں کھڑا کر دیا، مراد قسطنطنیہ کا محاصرہ چھوڑ کر چلا گیا، سلطنت کے اس دعویدار کو گرفتار کر لیا گیا اس کو بھی سولی پر چڑھا دیا گیا۔

عیسائی نچنت نہیں بیٹھے، اس زمانے کے ایک مشہور جنرل ہوینا ڈے نے ترکوں کو ہر محاذ پر شکست دینے کا بیڑا اٹھایا، ترکوں کے مقابلے میں اس کو کئی لڑائیوں میں فتح حاصل ہوئی تو ترکوں کو یورپ سے نکال دینے کی ایک لہر دوڑ گئی اور ایک زبردست اتحاد قائم کیا گیا، جس میں ہنگری، پولینڈ، بوسنیا اور سرویا کی حکومتیں شامل ہوگئیں، فرانس اور جرمنی نے فوجیوں کی ایک کثیر تعداد بھیجی، یورپ کے ہر ملک سے لشکری خود آکر شریک ہوئے، جمہوریہ

وینس اور جمہوریہ جنیوا نے اپنے بحری بیڑے بھیجے، اس وقت کے پوپ نے اپنے نمائندہ کارڈنیل جولین سیزرانی کو ایک مسلح فوج کے ساتھ روانہ کیا، یورپ کے ہر حصہ سے ایک کثیر رقم فراہم کر کے لشکریوں کے لیے بھیجی گئی، ایک بار پھر صلیبی جنگ چھڑ گئی، ترکوں کو شکست ہوتی رہی، بالآخر ۱۴۴۴ء کو ایک صلح نامہ ہوا جس کی رو سے سرویا سلطنت عثمانیہ سے آزاد کر دیا گیا، ولاچیا ہنگری کو دے دیا گیا، مراد ثانی نے ساٹھ ہزار دوکاٹ دے کر عثمانی جنرل محمد چلپی کا زرفدیہ ادا کیا جو عیسائیوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا تھا، یہ صلح دس سال کے لیے کی گئی، اس پر پابند رہنے کے لیے لاڈی سلاس نے انجیل اور مراد ثانی نے قرآن کو ہاتھ میں لے کر قسم کھائی۔

لیکن کچھ دنوں کے اندر یہ صلح نامہ عیسائیوں کی طرف سے نظر انداز کر دیا گیا، کارڈنیل جولین نے اعلان کیا کہ غیر عیسائیوں کے ساتھ معاہدہ کی پابندی نہیں کرنی چاہیے اور اس پر زور دیا کہ خود پوپ کی تائید اس میں ہے اور اس نے ہنگریوں کی ایک مجلس میں یہ تقریر کی:

> ''تم اس موقع پر ان امیدوں کا خاتمہ کر دو گے جو لوگوں نے تمہارے ساتھ قائم کر رکھی ہیں اور اس خوش بختی سے فائدہ نہ اٹھاؤ گے جو تمہیں نصیب ہوئی ہے، تمہارا عہد و پیمان تمہارے خدا اور مسیحی بھائیوں کے ساتھ ہے اور وہ سابق معاہدہ اس ناعاقبت اندیشانہ اور مخالف مذہب عہد کو ساقط کر دیتا ہے جو مسیح کے دشمنوں کے ساتھ کیا گیا اور دنیا میں اس کا نائب پاپائے رومہ ہے جس کی اجازت کے بغیر تم نہ کوئی معاہدہ کر سکتے ہو اور نہ اسے پورا کر سکتے ہو، اس کی طرف سے میں تم کو دروغ حلفی سے بری کرتا ہوں اور تمہاری فوج کو برکت دیتا ہوں، شہرت اور نجات کی راہ پر میرے پیچھے پیچھے چلو اور اگر اب بھی تمہیں پس وپیش ہے تو میں اس گناہ کا وبال اپنے سر لیتا ہوں۔'' (گبن ج ۴ ص ۴۶۴، ایورسلے ص ۶۹، تاریخ دولت عثمانیہ ج ۱ ص ۹۲)

معاہدہ توڑ دیا گیا، گبن نے اس کو نہایت شرانگیز (Cauistry) کہا اور لین پول لکھتا ہے کہ یورپ کی سپہ گری اور کسی جنرل کی شہرت کے لیے اس سے زیادہ ذلت آمیز رویہ نہیں ہوسکتا ہے کہ یہ معاہدہ توڑ دیا گیا، وارنا میں عثمانیوں اور عیسائیوں میں ایک جنگ ہوئی، جس میں شاہ لاڈسلاس اور خود کارڈنیل جولین ہلاک ہوگئے، اس جنگ کے بعد سرویا اور بوسنیا پر عثمانیوں کا قبضہ پھر ہوگیا، یہ دونوں یونانی کلیسا سے وابستہ تھے ان کو بہ جبر لاطینی کلیسا میں داخل کرنے کی کوشش کی جارہی تھی اس لیے وہ خود عثمانیوں کے زیر تسلط آگئے، سرویا کا ایک مورخ رانکی لکھتا ہے کہ ایک بار جارج برینکوویچ نے ہونیاڈے سے دریافت کیا کہ اسے کامیابی ہوئی تو مذہب کے متعلق اس کا کیا رویہ ہوگا تو اس نے جواب دیا کہ میں سرویا کو رومن کیتھولک مذہب قبول کرنے پر مجبور کروں گا، یہی سوال برینکوویچ نے مراد ثانی سے کیا تو اس کا جواب تھا کہ میں ہر مسجد کے پاس ایک گرجا بنوادوں گا اور لوگوں کو پوری آزادی حاصل ہوگی کہ اپنے اپنے مذہب کے مطابق خواہ مسجد میں جاکر عبادت کریں خواہ گرجا میں۔
(ایڈورڈ کریسی ج اص ۱۱۴، تاریخ دولت عثمانیہ ج اص ۹۶)

کلیسائے روم کی تعدی کی وجہ سے بوسنیا بھی عثمانیوں کے زیر نگیں آگیا اور اس کے بہت سے ممتاز امرا خود اسلام کے حلقہ بگوش ہوگئے۔

قسطنطنیہ کے حکمراں ایک بار پھر مراد ثانی کے لیے دردسر ہوگئے، وہاں دو بھائی قسطنطین اور طامسن علاحدہ حصوں پر حکومت کرتے تھے، دونوں نے عثمانی سلطنت کے مقبوضات پر قابض ہونے کی کوشش کی مگر مراد ثانی نے دونوں کو شکست دی اور دونوں پھر اس کے باج گزار ہوگئے، اسی سلسلہ میں اس نے موریہ کو بھی فتح کرلیا۔

وارنا کی شکست کے بعد ہونیاڈے چین سے نہیں بیٹھا، اس نے چار سال کے اندر اسی ہزار فوج جمع کی، ہنگری، سرویا اور بوسنیا کو ورغلا کر مراد ثانی کے خلاف کردیا اور ان کی متحدہ فوجیں کسووا میں اس سے برسرپیکار ہوگئیں، کسووا کی یہ دوسری جنگ تھی، عیسائیوں کو پھر شکست فاش ہوئی سرویا پھر عثمانیوں کے قبضہ میں آیا، بوسنیا باج گزار بن گیا۔

البانیہ بھی مراد ثانی کے لیے دردسر رہا، اس کے حکمراں جان کستریو نے اپنے چار

لڑکوں کو سلطان کے پاس بھیج دیا تھا، تین تو وفات پا گئے، چوتھا مراد ثانی کی نگرانی میں پرورش پاتا رہا اور اس نے اسلام بھی قبول کرلیا اور اس کا نام سکندر بک رکھا گیا، مراد ثانی نے اسے سنجن کا حاکم بنادیا، اس کا باپ البانیہ میں وفات پا گیا تو البانیہ عثمانیوں کے زیر تسلط آ گیا، سکندر بک کو یہ بات پسند نہ آئی اور جب مراد ثانی ہونیاڈے سے لڑ رہا تھا تو اس نے علم بغاوت بلند کیا، وہ سلطان کے چیف سکریٹری کو قتل کر کے البانیہ آیا اور مرتد ہو کر اپنی آزادی کا اعلان کیا اور تقریباً پچیس سال تک ترکوں سے لڑتا رہا۔

اسٹینلی لین پول مراد ثانی کی سیرت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اس نے تیس سال تک حکومت کی لیکن اس نے کوئی کام ایسا نہیں کیا جو باعزت نہ ہو، اس کی سیرت شریفانہ رہی اور تحکمانہ بھی۔ (ترکی ص ۱۰۱)

لارڈ ایور سلے لکھتا ہے:

''اس کی حکومت پر نظر ڈالنے سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس نے توسیع سلطنت کے مقصد سے لڑائیاں لڑیں، تقریباً ہر جنگ کے لیے وہ مجبور کیا گیا، شہنشاہ قسطنطنیہ کا طرز عمل اس کے ساتھ کس قدر غدارانہ تھا، وہ اس کے مقبوضات کے دائرے کو تنگ کر دینے میں حق بہ جانب تھا، اس کے ساتھ سالونیکا پر بھی اس کا حملہ حق بہ جانب تھا، شہنشاہ قسطنطنیہ کو اس کو فروخت کر کے ایک غیر حکومت کو وہاں قدم جمانے کی جگہ دینے کا کوئی حق نہ تھا، شمالی سرحد پر بھی لڑائیاں ہوئیں، اس میں مراد ثانی کو اہل ہنگری اور ان کی حلیف مسیحی طاقتوں کے جارحانہ اقدام سے مجبور ہو کر میدان میں آنا پڑا، اتحادیوں نے تلوار سے فیصلہ چاہا جو ان کے خلاف رہا۔'' (ٹرکش امپائر از لارڈ ایور سلے ص ۷۱-۷۲، دولت عثمانیہ ج ۱ ص ۱۰۰-۱۰۱)

گبن لکھتا ہے:

''سلطان مراد ثانی نے پچاس سال عمر پائی اور تقریباً تیس سال چھ مہینے آٹھ روز حکومت کی، وہ ایک عادل اور شجاع فرماں روا تھا، نہایت

کشادہ دل، مستقل مزاج، رحم دل، پابند مذہب اور فیاض تھا، ایک نیک شہنشاہ اور ایک جلیل القدر سپہ سالار تھا، اس کے عدل، انصاف اور بردباری کی تصدیق اس کے طرز عمل نیز خود عیسائیوں کی شہادت سے ہوتی ہے، جن کا خیال ہے کہ اس کے عہد کی خوشحالی اور اس کی پرسکون موت اس کے غیر معمولی اوصاف کا صلہ تھی، اپنی عمر اور فوجی قوت کے دور شباب میں بھی اس نے شاذ ہی کسی میدان جنگ میں قدم رکھا لیکن جب تک پہلے دشمنوں کی طرف سے اس کو جنگ کے لیے کافی طور پر برانگیختہ نہ کیا گیا، دشمن کے مطیع ہو جانے کے بعد فاتح سلطان اپنے ہتھیار کو کھول کر رکھ دیتا تھا، صلح ناموں کی پابندی میں اس کا عہد ناقابل شکست اور مستحکم تھا......"

(گبن ج ۴ ص ۱۴۱-۱۴۲، لارڈ ایور سلے ص ۷۲، دولت عثمانیہ ص ۱۰۱-۱۰۲)

محمد دوم فاتح کی فاتحانہ رواداری: محمد دوم فاتح نے ۱۴۵۱ء سے ۱۴۸۱ء تک حکومت کی، اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے مئی ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ فتح کیا۔

وہ قسطنطنیہ کی فتح کے بعد یہاں داخل ہوا تو ایڈورڈ کریسی نے اس کی ان برائیوں کا ذکر کیا ہے جو اس سے فاتحانہ زور اور پندار میں اس سے سرزد ہوئیں لیکن یہی مصنف یہ بھی لکھتا ہے کہ جب اس کو خیال ہوا کہ اگر وہ قسطنطنیہ کو اپنے حوصلہ کے مطابق اپنے امپائر کا مرکز بنانا چاہتا ہے تو وہ یونانیوں کو جو شہر پر حملہ کے وقت موت اور قید سے بچنے کے لیے فرار ہو گئے ہیں، واپس آنے میں ہمت دلائے تاکہ وہ اپنے نئے آقا کی پرامن اور جفاکش رعایا ہو جائیں، اس کے لیے اس نے جو اقدام کیے اس سے اس کے دوررس تدبر کا اندازہ ہوتا ہے، کونسٹنٹائن سے اس کی رعایا اس لیے بدظن ہوگئی تھی کہ وہ لاطینی گرجا سے منسلک ہو گیا تھا، یونانی اپنی راسخ العقیدگی کو اپنی آزادی سے زیادہ پسند کرتے تھے، محمد نے یہ محسوس کرتے ہوئے ان کے لیے ایک نیا بطریق مقرر کر دیا جو یونانی گرجا کا پابند رہا لیکن محمد اس کا محافظ بن گیا، یہ بات پہلی جون یعنی قسطنطنیہ کی فتح کے دس دن کے بعد عمل میں آئی، پھر اس نے ایک عام اعلان کرایا کہ مفرورین اپنے گھروں کو واپس آجائیں اور اپنے پرانے

مشاغل میں لگ جائیں وہ ہر طرح محفوظ رہیں گے پھر ایک باضابطہ چارٹر کو منظوری دی کہ یونانی بطریق اور اس کے گرجے کے تمام مقتدر لوگ ہر قسم کے ٹیکس سے بری ہوں گے، اسی کی رو سے یہ بھی یقین دلایا گیا کہ یونانی اپنی مذہبی عبادت میں اپنے پرانے مراسم کے ساتھ آزاد ہوں گے، یونانی آزادی عرصہ سے زوال پذیر ہو رہی تھی، قسطنطنیہ کے حملہ سے پہلے شہر کی پھیلی ہوئی عمارتوں کی وجہ سے ان کے لیے جگہیں بہت کم رہ گئیں تھیں، محمد نے شہر کی آبادی از سر نو بسائی تو اس نے اپنی مملکت سے ہزاروں لوگوں کو یہاں منتقل کیا اور اپنی حکومت کے پورے زمانہ میں اس نے مختلف علاقوں میں اپنی رعایا کے لیے نئی آبادی بسائی اور اس کی حکومت کے اخیر زمانہ میں قسطنطنیہ زندگی اور چہل پہل سے معمور ہو گیا، البتہ شہر کا یونانی رنگ بدل گیا اور اس میں ترک، البانی، بلغاری، سروی اور دوسرے لوگ آ کر بس گئے جو سلطان کی دعوت پر وہاں آتے رہے۔ (اوٹومن ٹرکش از ایڈورڈ کریسی ج ا ص ۱۴۰-۱۴۱)

گبن کی تاریخ ڈکلائن اینڈ فال آف رومن امپائر میں ہے کہ محمد دوم فاتح جب قسطنطنیہ میں داخل ہوا تو لکس لوٹارس جو افواج قسطنطنیہ کا سپہ سالار اعظم تھا گرفتار کر کے اس کے سامنے لایا گیا، محمد نے نہ صرف اس کو معاف کر دیا بلکہ اپنی سرپرستی کا بھی یقین دلایا، اس کے ساتھ یہاں تک نوازش کی کہ اس کی بیوی کی عیادت کے لیے گیا جو علالت اور نئی مصیبت کے غم سے پریشان تھی، وہ اس سے نہایت نرمی اور احترام کے ساتھ ملا اور جس طرح کوئی لڑکا اپنی ماں کو سمجھائے اسی طرح تسلی و تشفی دی، ایسی ہی نرمی کا برتاؤ اس نے حکومت کے بڑے افسروں کے ساتھ کیا اور ان میں سے کئی ایک کا زر فدیہ خود ادا کیا اور چند ہی دنوں میں اس کے عفو و کرم کا دامن تمام باشندگان شہر تک دراز ہو گیا۔ (ڈکلائن اینڈ فال آف دی رومن امپائر ج ۴ ص ۵۰۱)

قسطنطنیہ کی فتح کے بعد سلطان محمد جس وقت یہاں داخل ہوا تو اس کا ذکر لارڈ ایور سلے نے اپنی کتاب ٹرکش امپائر میں اس طرح کیا ہے کہ اگرچہ سلطان اور اس کے سپاہیوں نے بہت سے مظالم کیے اور یونانیوں کی پوری جماعت پر نہایت سخت مصیبت ٹوٹ پڑی، تاہم یہ نہیں کہا جا سکتا کہ قسطنطنیہ کی فتح کے موقع پر ویسی نفرت انگیز بدمستیوں کا مظاہرہ ہوا

جیسی ۱۲۰۴ء میں دیکھی گئی تھی جب کہ صلیبی محاربین نے اس پر قبضہ کیا تھا، داخلہ کے ابتدائی چند گھنٹوں کے بعد اس موقع پر کوئی قتل عام نہیں ہوا، آتش زنی بھی زیادہ نہیں ہوئی، سلطان نے گرجاؤں اور دوسری عمارتوں کو محفوظ رکھنے میں پوری کوشش کی اور وہ اس میں کامیاب رہا (ایور سلے ص ۸۸، دولت عثمانیہ ج ا ص ۱۱۰) پروفیسر ٹی. ڈبلیو. آرنلڈ نے اپنی مشہور کتاب پریچنگ آف اسلام میں لکھا ہے کہ قسطنطنیہ کے عیسائیوں نے اطاعت قبول کر لی تو وہاں کے کلیسا کے بطریق کو یہ رعایتیں دی گئیں کہ وہ شہر میں جلوس کے ساتھ نکل سکتے ہیں اور اپنی عدالت میں اپنے مقدمے خود فیصلے کر سکتے ہیں، اپنے مجرموں کو موت کی سزا بھی دے سکتے ہیں اور اپنے عیسوی فقہ پر بھی عمل کر سکتے ہیں۔ (دعوت اسلام اردو ترجمہ ص ۱۶۴-۱۶۵ پہلا اڈیشن) لارڈ ایور سلے نے سلطان محمد فاتح کی اس رواداری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ محمد کی عظیم الشان رواداری یورپین حکومت کی سیاسی اخلاقیات سے بہت آگے تھی، اہل اسپین نے ان مسلمانوں کے ساتھ جنھوں نے اپنے گرفتار کرنے والوں یعنی عیسائیوں کا مذہب قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا، ان کو ملک سے نکالتے وقت یہ نمونہ پیش نہیں کیا، محمد نے یونانیوں اور قسطنطنیہ کے دوسرے باشندوں کو ترغیب یا جبر سے مسلمان ہونے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ (ٹرکش امپائر از لارڈ ایور سلے ص ۸۹)

بایزید ثانی: اس کی حکومت ۱۴۸۱ء سے ۱۵۱۲ء تک رہی، اس کے زمانہ میں عیسائیوں کی سازش سے اٹلی، علاقہ ٹورنٹو اس کی حکومت کے دائرہ سے باہر نکل گیا جس کے بعد اٹلی میں ترکوں کا اثر بالکل جاتا رہا لیکن ترکوں نے عیسائیوں کی سازش ہرزگووینا میں کامیاب نہیں ہونے دی، پہلے وہ عثمانی سلطنت کا باج گزار تھا، اب وہ اس کا مستقل علاقہ ہو گیا لیکن ہنگری میں عیسائیوں کی شورش برابر جاری رہی، برابر لڑائیاں ہوتی رہیں مگر ترک نرمی سے کام لے کر ان سے صلح کرتے رہے۔

سلطان بایزید کی بردباری اور روسی سفیر کی بدتمیزی: اسی زمانہ میں روس کی طرف سے جو ایک نازیبا حرکت ہوئی، وہ عدم رواداری کی ایک عجیب وغریب مثال ہے، ۱۴۹۵ء میں روس کی طرف سے ایک سفیر آیا جو روسی تاجروں کے لیے تجارتی مراعات کا خواستگار ہوا

مگر اس کو یہ ہدایت دی گئی تھی کہ وہ دولت عثمانیہ کے رسم ورواج کے مطابق سلطان کے سامنے دربار میں دوبار جھک کر تعظیم نہ کرے اور نہ سلطان کے علاوہ کسی وزیر سے سفارتی معاملات پر کوئی گفتگو کرے اور نہ یورپ اور ایشیا کے کسی سفیر کو اپنے آگے جگہ دے، وہ دربار میں آیا تو اسی پر عامل رہا پھر بھی سلطان بایزید ثانی نے اس کی پوری تواضع کی مگر جب وزیراعظم نے اس کو استقبالیہ دعوت دی تو اس نے اس میں شرکت کرنے سے انکار کیا اور اس کو سلطان کی طرف سے جو خلعت اور تحائف بھیجے گئے تھے ان کو اس نے واپس کر دیا، سلطان بایزید نے اپنے غیر معمولی تحمل اور بردباری سے سفیر کی گستاخی اور بدتمیزی کو برداشت کیا اور اس کو نرمی سے واپس کر دیا، البتہ اپنی خودداری میں کوئی سفیر روس کے دربار میں نہیں بھیجا۔ (ہسٹوریَن ہسٹری آف دی ورلڈ ج ۲۴ ص ۳۳۷)

سقوط قسطنطنیہ کا بدلہ اندلس میں: یورپ کے عیسائی قسطنطنیہ میں اپنی ہزیمت کو کبھی نہیں بھولے، دولت عثمانیہ سے وہ اپنا انتقام لینے میں ناکام رہے تو اندلس میں مسلمانوں کے خلاف شورش برپا کر کے ۱۴۹۳ء میں ان کو اندلس خالی کرنے پر مجبور کیا اور جس سفاکی، خوں ریزی، درندگی اور بے دردی سے اس کو خالی کرایا، اس کی تفصیل گذشتہ صفحات میں آ چکی ہے، قسطنطنیہ کے سقوط کے وقت یہ بہیمیت نہیں دیکھنے میں آئی مگر عیسائی عام طور سے خوش تھے کہ انھوں نے قسطنطنیہ کا بدلہ اندلس میں لے لیا، اس خوشی کے ساتھ وہ دولت عثمانیہ کے خلاف ان کی عیسائی رعایا کو طرح طرح سے برابر برانگیختہ کرتے رہے۔

سلیم اول کی مقبولیت: اس کی حکومت ۱۵۱۲ء سے شروع ہو کر ۱۵۲۰ء میں ختم ہوئی، وہ عام طور سے ظالم حکمراں سمجھا جاتا تھا لیکن اپنی رعایا میں بہت مقبول تھا اس لیے کہ اس کا جو طرز عمل افراد کے لیے ظلم کا حکم رکھتا تھا، وہی رعایا کے حق میں رحمت بن جاتا تھا۔ (تاریخ دولت عثمانیہ شائع کردہ دارالمصنفین ج ا ص ۱۵۸، ٹرکی از اسٹینلی لین پول ص ۱۶۴-۱۵۲)

سلیمان اعظم قانونی کی رواداری اور عدل پروری: اس نے ۱۹۲۰ء سے چھیالیس برس یعنی ۱۵۶۶ء تک حکومت کی، وہ دولت عثمانیہ کا سب سے بڑا اور شاندار تاجدار گذرا ہے اور اپنے وقت کا سب سے بڑا شہنشاہ بھی، وہ اپنے رحم وکرم کے لیے مشہور تھا، انصاف اس کا

خاص شیوہ تھا، وہ اپنی عدالت میں نسل ورنگ اور مذہب کی کوئی تفریق نہ کرتا، اس کا عام حکم تھا کہ رعایا کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی روا نہ رکھی جائے، امیر، غریب، مسلم اور غیر مسلم کے ساتھ یکساں طور سے انصاف کیا جائے، یورپ کے عیسائی قسطنطنیہ میں اپنی شکست پر سینہ کوبی میں مشغول تھے، مسلمانوں سے بدلہ لینے میں جوش سے لبریز تھے، دولت عثمانیہ کی بیخ کنی کے لیے ہر قسم کے باہمی اتحاد کے لیے کوشاں تھے مگر اس نے اپنی عالی دماغی، فوج کی کارکردگی اور بحری طاقت سے ان عیسائیوں کو ہر محاذ پر پسپا کیا اور بلغراد، وینس، روڈس، ہنگری، ویانا، اسٹائریا اور جزائر ایجین وغیرہ جیسے علاقے اس کے قلمرو میں شامل تھے، اس کی وسیع سلطنت میں بیس مختلف نسلوں کے لوگ آباد تھے، ان میں تیس لاکھ یونانی، بیس لاکھ آرمینی تھے، سلانی نسل کے پینسٹھ لاکھ باشندے تھے، بلغاریہ، سرویا، بوسنیا، مونٹی نگرو، ہرزیگووینا، مولڈیویا اور البانیہ میں چالیس لاکھ آباد تھے، رومی نسل کے لوگ ولاچیا اور مولڈیویا میں سکونت پذیر تھے، تاتاریوں کی تعداد پندرہ لاکھ تھی، البانیہ کے ارناؤط تقریباً پندرہ لاکھ تھے، ہنگری میں مگیار اور ٹرانسلوینا میں جرمن نسل کے لوگ تھے، ان سب کو سلیمان اعظم نے ہر طرح مطمئن رکھا، جس میں اس کی رواداری کو بڑا دخل رہا، اس کی ایک مثال یہ ہے کہ جب ۱۵۳۵ء میں شہنشاہ چارلس اور فرانس میں جنگ چھڑی تو فرانس سلیمان اعظم کی مدد کا خواستگار ہوا، دونوں میں جو معاہدہ ہوا اس کو رعایت سلطانی سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس معاہدہ کی رو سے فرانسیسیوں کو پانچ فیصدی محصول کے معاوضہ میں تمام ترکی بندرگاہوں میں تجارت کرنے کی اجازت دی گئی، فرانسیسی تاجروں کے مقدمات خود ان ہی کے سپرد کر دیئے گئے، سلطنت عثمانیہ کے فرانسیسی باشندوں کو انتقال جائداد سے متعلق وصیت کرنے کے لیے مخصوص حقوق دیئے گئے اور نہ صرف انھیں کامل مذہبی آزادی دی گئی بلکہ ان کے مقامات مقدسہ کی نگہبانی بھی ان ہی کو تفویض کر دی گئی، فرانس کے بادشاہ کو بلے کے بجائے پادشاہ کے لقب سے یاد کیا، اس طرح اس کو اپنے برابر سمجھا۔

اس نے اپنی غیر مسلم رعایا کے لیے لگان وغیرہ کے جو قوانین مرتب کیے تھے، اس بنا پر جاگیردار واجب ادائیگی سے زیادہ مستحق نہ تھے، اسی لیے ایڈورڈ کریسی نے لکھا ہے کہ

سلطان کے ایک معاصر مورخ کا بیان ہے کہ سرحدی عیسائی ممالک کے باشندے بھاگ بھاگ کر سلطنت عثمانیہ میں پناہ لیتے تھے اور اپنے ہم مذہب عیسائی آقاؤں کے جور و تعدی پر ترکوں کی نرم حکومت کو ترجیح دیتے تھے، یہاں آ کر خوش رہتے کہ عشر کے علاوہ ان پر اور کسی قسم کا محصول یا تکلیف دہ بار عائد نہیں کیا جاتا۔ (ج ا ص ۲۳۰)

لارڈ ایورسلے لکھتا ہے کہ

''وہ ترکی میں قانونی کی حیثیت سے جانا جاتا ہے، اس لیے کہ اس نے اپنے عہد میں بڑی قانونی اصلاحات کیں، جو سب کی سب انصاف پر مبنی تھیں، جاگیرداری کے قوانین بالکل بدل دیے گئے جاگیرداروں کی جاگیرداری کا نظام یورپ کے ملکوں کی طرح تھا لیکن اب اس کو سادہ کر دیا گیا جس سے رعایا کی حالت میں ترقی ہونے لگی، لگان کے مقرر کر دینے سے ان کی کافی حفاظت ہوگئی اور ان کی حالت ہنگری اور روس کے کسانوں سے بہتر ہوگئی، موریا کے یونانی وینس کی حکومت سے زیادہ ترکوں کی حکومت کو پسند کرنے لگے، ہنگری کے بہت سے کسانوں نے اپنے وطن کو چھوڑ دیا اور ویلنا آ کر آباد ہو گئے، جہاں ترکوں کی حکومت بہت مہربان اور انسان دوست تھی، سلیمان کی چھیالیس برس کی حکومت میں لوگوں کی قناعت پسندی اور اطمینان کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ اس زمانہ میں کوئی بغاوت نہیں ہوئی حالانکہ اس کے اندر بیس نسلوں کے لوگ آباد تھے اور وہاں فوجیں بھی متعین نہ تھیں کیوں کہ وہ ہنگری اور ایران کی مہموں میں بھیج دی گئی تھیں۔'' (ص ۱۴۱)

لارڈ ایورسلے نے سلیمان اعظم کی کمزوریوں کو بھی گنایا ہے لیکن آخر میں لکھا ہے کہ سلیمان کے کارناموں پر ایک غیر جانب دار مورخ کو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یورپ کے جو بہت نمایاں فرماں روا گذرے ہیں ان میں چارلس پنجم، فرانسس اول، لیو دہم، ہنری ہشتم، پولینڈ کے سگمند وغیرہ ہیں لیکن ان سب میں حکمراں کی حیثیت سے سلیمان کی عظمت اور شہرت کو فوقیت حاصل ہے، ترکی کا ایک مقولہ اس پر صادق آتا ہے کہ وہ آدمی خوش نصیب ہے

جس کی کمزوریاں گنی جا سکتی ہیں لیکن اس کی خوبیوں کا شمار کرنا ممکن نہیں۔ (ایورسلے ص ۱۱۵)

اسٹینلی لین پول نے سلیمان اعظم کی بعض کوتاہیوں اور غلطیوں کا ذکر کیا ہے لیکن یہ لکھ کر اس کی عظمت کا اعتراف کرتا ہے کہ وہ ترکی کی تاریخ کا عظیم ترین حکمراں تھا، اس کے ذاتی اوصاف بے مثال تھے، اس کی دانشمندی، عدل پروری، فیاضی، لطف، کرم اور اخلاق ضرب المثل بن گئے تھے، اس کی ذہنی صلاحیتیں اس کی اخلاقی خوبیوں سے کم نہ تھیں، اس کی حکومت عدل پر مبنی تھی، اس میں فیاضی اور اعلیٰ حوصلگی دکھائی دیتی، وہ ان تمام تعریف وتحسین کا مستحق ہے جو اس پر نچھاور کی جاتی ہیں، اس نے اپنی صدی میں آیندہ نسلوں کے لیے بہتر سے بہتر مثالیں تقلید کے لیے چھوڑ گیا، اس نے جو فوج چھوڑی اس کی عزت بحر و بر دونوں میں کی جاتی۔ (ترکی ص ۹۶-۱۹۵)

ایڈورڈ کریسی ان یوروپین مورخوں میں ہے جو ترک حکمرانوں کی کمزوریوں اور برائیوں کو نمایاں کرنے میں آگے آگے رہتا ہے مگر سلیمان اعظم کی خوبیوں پر پردہ نہ ڈال سکا اور اس کو یہ لکھنا پڑا کہ

> ''ایک جرمن مورخ نے تنبیہ کے ساتھ لکھا ہے کہ جس طرح آرین نے سکندر اعظم کا کیریکٹر پیش کیا ہے، اسی طرح جب ہم سلیمان اعظم کا جائزہ لیں تو ہماری توجہ اس کے ان پہلوؤں پر نہ ہو جو قابل الزام ہیں بلکہ اس کے ان روشن اور شریفانہ اوصاف کو بھی یاد کریں جن سے وہ آراستہ رہا، ایک انسان کی حیثیت سے اس کے دل میں گرمی اور اخلاص تھا اور وہ باعزت طریقہ سے اپنی سیرت میں پاک صاف تھا، اس میں وہ فاجرانہ رنگ نہ تھا جس میں اس کی قوم کے کچھ لوگ مبتلا تھے، اس کی شاہانہ شجاعت، اس کی غیر معمولی سپاہیانہ صلاحیت، اس کی اعلیٰ اور حیرت انگیز اسپرٹ، شریعت اور مذہب میں اس کی سختی سے پابندی، جس میں تعصب اور دل آزاری کا نام ونشان نہ رہا، اس کی امن پسندی اور کفایت شعاری کے ساتھ اس کی شان وشوکت، آرٹ اور لٹریچر کی فیاضانہ سرپرستی، تعلیم کی ترویج میں اس کی

سرگرمی، اپنے امپائر کی توسیع میں اس کی فتوحات پھر اس کی دانش مندانہ اور سیر حاصل قانون سازی جس سے اس کی تمام رعایا کو فلاح حاصل ہوئی، یہ ساری باتیں ایسی ہیں جو مجموعی حیثیت سے اس کو اس کا حقدار بناتی ہیں کہ وہ ایک عظیم حکمراں تسلیم کیا جائے، جس کی عظمت تین نسلوں تک برقرار رہی۔
(اوٹومن ٹرکش از ای ایس کریسی ج ا ص ۳۳۸، ۱۹۵۸ء اڈیشن)

سلیمان اعظم نے جس شان سے حکومت کی اور جس طرح اپنی سلطنت کو بام عروج تک پہونچا دیا اس کو سنبھالنے کے لیے اسی صلاحیت اور استعداد کا حکمراں برابر ہونا چاہیے تھا مگر یہ ممکن نہ ہو سکا، اس لیے یورپ کے عیسائیوں نے اس کے جانشینوں کی کمزوریوں سے برابر فائدہ اٹھایا اور اس سلطنت پر ضرب کاری لگانے کی فکر میں لگے رہے۔

سلیم ثانی کے خلاف عیسائیوں کی لڑائیاں: سلیم ثانی (۱۵۶۶ء-۱۵۷۴ء) نے اپنی فوج کو اپنے حلیف وینس کے مقبوضہ قبرص میں بھیجا تو وہاں سخت لڑائی ہوئی، پچاس ہزار ترک ہلاک ہوئے، عیسائی فوجی بھی مارے گئے، قبرص پر سلطنت عثمانیہ کا تسلط ہو گیا تو یہ یورپ کی مسیحی حکومتوں کو ناگوار گذرا، بحر روم کی عیسائی حکومتوں کا ایک اتحاد قائم ہوا اور انھوں نے اپنے زبردست بحری بیڑے لے کر ترکوں سے لیپانٹوں میں ایک ایسی بحری جنگ کی جس میں تیس ہزار ترک کام آئے اور ان کے بیڑے کے بہت سے جہاز عیسائیوں کے قبضہ میں آ گئے مگر اس شکست کے باوجود ترکوں کو زیادہ نقصان نہیں پہونچا، اسی زمانہ میں وہ وینس سے خراج وصول کرنے اور تونس پر اپنی فتح کا پرچم لہرانے میں کامیاب رہے۔ (دی اوٹومن ٹرکش از ایڈورڈ کریسی ج ا ص ۳۳۹-۳۵۷، ٹرکی از اسٹینلی لین پول ص ۲۰۹، ایورسلے ص ۱۴۲)

مراد ثالث کے خلاف ہنگری اور آسٹریا کی جنگ: مراد ثالث (۱۵۹۵ء-۱۵۷۴ء) یورپ کی مسیحی حکومتوں سے مل کر رہنا چاہتا تھا، اس لیے اس نے مغربی یورپ کی بیشتر حکومتوں سے تجارتی اور سیاسی تعلقات قائم کیے اور جب انگلستان نے اس کے ایک تجارتی وفد بھیج کر تجارتی مراعات چاہیں تو اس نے اس کو وہی رعایتیں دیں جو اور یوروپی قوموں کو تھیں، ملکہ ایلزبتھ تو اس کی طرف اتنی مائل ہوئی کہ وہ اسپین کے فرماں روا فلپ ثانی پر حملہ کرنے کے

لیے اس سے مدد کی خواستگار ہوئی مگر یورپ کی مشرقی حکومتیں اس کی حکومت میں انتشار پھیلانے سے باز نہ آئیں، ہنگری اور آسٹریا نے اس کے خلاف جنگ چھیڑ دی، جس میں ترکوں کو شکست ہوئی، ان کے کچھ قلعوں پر ان کے دشمنوں کا قبضہ ہو گیا پھر ۱۵۹۳ء میں مولڈیویا، ولاچیا اور ٹرنسلوینیا آسٹریا سے مل گئے اور اپنی مملکتوں میں تمام مسلمانوں کو قتل کر دیا مراد ثالث ان پر قابو پانے سے پہلے ہی وفات پا گیا۔ (دی اوٹومن ٹرکش از ایڈورڈ کریسی ج اص ۳۶۸-۳۵۸، دولت عثمانیہ ج اص ۲۴۵)

محمد ثالث کے خلاف عیسائی حکومتوں کی محاذ آرائی: محمد ثالث (۱۶۰۳ء-۱۵۹۵ء) کو عیسائیوں سے لڑنے میں بڑی پامردی کا ثبوت دینا پڑا، مراد ثالث کے زمانہ کی لڑائیاں جاری تھیں، ولاچیا، ٹرانسلوینیا کو آسٹریا اور ہنگری کی حمایت حاصل تھی، ان کی فوجیں آگے بڑھتی آ رہی تھیں، دریائے ڈینوب تک پہونچنے سے پہلے انھوں نے ترکوں کے گران، پست اور نجارست کے قلعوں پر قبضہ کر لیا تھا، سلطان محمد ثالث ان سے مقابلہ کے لیے خود بہت تزک واحتشام سے روانہ ہوا، اکتوبر ۱۵۹۶ء میں سیرسٹبر کے مقام پر ایک گھمسان کی لڑائی لڑ کر فتحیاب ہوا اور جس کو اس نے فتح مبین سے تعبیر کیا۔ (کریسی ج اص ۳۷۷، ایور سلے ص ۱۵۷-۱۵۶)

احمد اول سے عیسائیوں کی چھیڑ چھاڑ: احمد اول (۱۷-۱۶۰۳ء) کے زمانہ میں بھی آسٹریا اور ٹرانسلوینیا نے اس سے چھیڑ چھاڑ رکھی، جس کے نتیجہ میں سینواتوروک کا صلح نامہ ہوا جس کی رو سے کچھ قلعے آسٹریا کو دے دئے گئے اور آسٹریا عثمانی حکومت کا باج گذار نہیں رہا لیکن سلطان نے فرانس اور انگلستان سے دوستانہ تعلقات رکھے مگر اسپین اور روس اس کے دشمن بنے رہے۔ (کریسی ج اص ۸۸-۳۸۳، ایور سلے ص ۱۵۸)

مصطفیٰ اول اور عثمان ثانی کے زمانہ میں انتشار پھیلانے کی کوشش: ان دونوں حکمرانوں کے دور میں بڑا انتشار رہا لیکن اسی زمانہ میں برطانیہ کی طرف سے سرطامس رو سفیر بن کر آیا اور پانچ سال مقیم رہا اور بحری قزاقوں کے خلاف مل کر کارروائی کی۔ (کریسی ج اص ۳۹۳-۳۸۹، ایور سلے ص ۱۶۰-۱۵۹)

مرادرابع کی تعمیری کوشش: مراد بارہ سال کی عمر میں تخت پر بیٹھا اور اٹھائیس سال کی عمر میں وفات پا گیا، اس کی حکومت ۱۶۲۳ء سے ۱۶۴۰ء تک رہی، اس نے مسیحیوں کو خواہ مخواہ خلفشار پیدا کرنے کا موقع نہیں دیا بلکہ اس کی سلطنت میں جو اختلال پیدا ہونے کی وجہ سے خرابیاں پیدا ہوگئی تھیں ان کو دور کرنے میں لگا رہا۔ (کریسی ج اص ۴۱۳-۳۹۴، ایور سلے ص ۱۶۱)

ابراہیم کے زمانہ میں عیسائیوں کی انتقامی کارروائیاں: ابراہیم (۱۶۴۸ء- ۱۶۴۰ء) کوئی طاقتور حکمراں نہ تھا پھر بھی مسیحی حکومتیں اس کی حکومت کو اپنی سازشوں سے کمزور نہ بنا سکیں بلکہ وہ یورپی طاقتوں سے مقابلہ کرنے میں کامیاب رہا، بحرازوف پر شہرازوف تجارتی اور حربی حیثیت سے بڑا اہم تھا، روسی قزاقوں نے شاید روسیوں کے اشارہ پر اپنے قبضہ میں کرلیا تھا، ابراہیم کے زمانہ میں ان قزاقوں سے اس کو خالی کرایا گیا، دولت عثمانیہ کو روس سے شکایت تھی کہ وہ قزاقوں کی مدد کرتا ہے، گو روس اس کے لیے معذرت پیش کرتا، تاتاریوں کی مڈبھیڑ قزاقوں سے ہوتی رہتی تو وہ روس کے علاقہ تک ان کا پیچھا کرتا، روس نے اس کی شکایت حکومت عثمانیہ سے کی تو پھر دونوں میں یہ معاہدہ ہوا کہ وہ ایک دوسرے کے احترام میں قزاقوں اور تاتاریوں کی مدد نہ کریں۔

اسی زمانہ میں ترکی تجارتی جہازوں کا ایک بیڑا قسطنطنیہ سے مصر جارہا تھا تو عیسائی حکومتوں کی سازش سے بحری قزاق ان کو گھیر کر کریٹ کے شمالی ساحل پر لے گئے، دولت عثمانیہ نے کریٹ کے خلاف فوج کشی کی تو وینس کی طرف کریٹ کی مدافعت کے لیے فوجی کمک آگئی مگر ترکوں نے وہاں کے دو مقامات کانیا اور ری ٹی نو پر قبضہ کرلیا اور کریٹ کے پایہ تخت کینڈیا کا محاصرہ کیا تو وینس کی حمایت سے یہ شہر اکیس سال تک اس محاصرہ کی حالت میں رہا، عیسائیوں نے انتقاماً عثمانی مقبوضات میں لیمناس اور ٹینڈوس کے جزیروں پر قبضہ کرلیا۔ (کریسی ج ۲ ص ۲۰-۱، ایور سلے ص ۱۶۳، دولت عثمانیہ ج اص ۲۷۶-۲۷۹)

محمد رابع کے خلاف عیسائیوں کی سازشیں: محمد رابع (۱۶۸۷ء- ۱۶۴۸ء) جب تخت نشین ہوا تو اس کی عمر سات سال کی تھی مگر اس نے انتالیس سال تک حکومت کی، عیسائی

حکومتوں نے اس کی کمسنی سے پورا فائدہ اٹھانا چاہا، وینس نے ایک جنگی بیڑا درۂ دانیال کے قریب بھیج کر ایک عثمانی بیڑے کو شکست دی اور لیمناس اور ٹینڈاس پر قبضہ کرلیا اور قسطنطنیہ کے سامان رسد کا راستہ بند کردیا جس سے پوری سلطنت میں گرانی پھیل گئی مگر اس زمانہ کے لائق اور کارگذار وزیر محمد کوپر بلی نے عثمانی بیڑے کو از سرنو تعمیر کیا، جس کی وجہ سے بحرا یجین میں دولت عثمانیہ کی سطوت پھر قائم ہوگئی اور وینس کے جہازوں کو شکست دے کر جزائر لیمناس اور ٹینڈاس واپس لیا، اس کی وفات کے بعد اس کا لڑکا احمد کوپر بلی وزیراعظم بنا تو اس نے باپ کی شاندار روایت کو قائم رکھا، ۱۶۶۲ء میں آسٹریا نے دولت عثمانیہ کے خلاف جنگ چھیڑ دی تو احمد کوپر بلی کی کارگذاری کی وجہ سے آسٹریا کے سنگین ترین قلعوں پر قبضہ کرلیا، اس فتح کو دیکھ کر مسیحی طاقتیں آسٹریا کی مدد کے لیے پھر متحد ہوگئیں، فرانس کے ایک جنرل کی سرکردگی میں سینٹ گاتھرڈ کے میدان میں ایک زبردست جنگ لڑی گئی جس میں ترکوں کو شکست ہوئی مگر اس کے بعد جو صلح نامہ ہوا اس سے عثمانی سلطنت کے وقار کو زیادہ صدمہ نہ پہونچا، یہ طے پایا کہ آسٹریا اور ترک دونوں ٹرانسلوینیا کو خالی کردیں مگر اس پر سلطان کی سیادت قائم رہے اور وہ خراج ادا کرتا رہے، توہزل اور دوسرے قلعے ترکوں کے قبضہ میں رہیں، ہنگری کی سات ولایتوں میں سے تین آسٹریا کو دے دی جائیں اور چار سلطنت عثمانیہ میں شامل کرلی جائیں، آسٹریا نے دولاکھ فلورن سلطان کو تاوان جنگ بھی ادا کرنا منظور کرلیا۔

مگر ۱۶۶۹ء میں کریٹ کے دارالسلطنت کنیڈیا کے محاصرہ کے سلسلہ میں عیسائی طاقتیں پھر متحد ہوگئیں، فرانس کا جنگی بیڑا پھر اس کی حمایت میں پہونچ گیا، پوپ اور مالٹا کے فوجی بھی وہاں آگئے مگر وہ ترکوں کو شکست نہ دے سکے، آخر میں ان اتحادیوں نے کنیڈیا پر عثمانیوں کا تسلط تسلیم کرلیا، البتہ وہاں کے چھوٹے چھوٹے بندرگاہوں پر وینس کا قبضہ باقی رکھا گیا مگر ترکوں کو چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا، ان کو پولینڈ سے بھی جنگ کرنی پڑی، اوکرین کے خلاف پولینڈ نے فوج کشی کی تو اوکرین عثمانی سلطنت کی مدد کا خواستگار ہوا، جب عثمانیوں نے ان کو امداد کا وعدہ کیا تو پولینڈ نے عثمانیوں کے خلاف جنگ چھیڑ دی مگر ترکوں نے ان کو شکست دے کر ان کے دو قلعے کیپک اور نوروز پر قبضہ کرلیا، جس کے بعد پولینڈ نے

صلح کر کے اوکرین کو عثمانیوں کے حوالہ کر دیا اور دو لاکھ بیس ہزار دوکاٹ سالانہ خراج بھی دینا منظور کیا مگر تھوڑے ہی دنوں میں پولینڈ نے روس کی مدد سے پھر جنگ چھیڑ دی اور ترکوں کو شکست دی اور انھوں نے پوڈولیا کے پورے صوبہ پر قبضہ کرلیا مگر ترکوں کا رعب اب بھی باقی رہا، جو صلح نامہ ہوا تو پوڈولیا پھر ترکوں کے حوالہ کر دیا گیا اور اوکرین پر عثمانیوں کی سیادت تسلیم کرلی گئی۔

کچھ دنوں کے بعد اوکرین میں عثمانیوں کے خلاف بغاوت کرادی گئی تو روس نے اس کی مدد کی، پولینڈ بھی اس کی مدد کرنے لگا، عثمانیوں کو ان سے لڑنے میں تین سال لگ گئے بالآخر ۱۶۸۱ء میں سلطنت عثمانی اور روس کے درمیان صلح ہوئی تو عثمانی یوکرین پر اپنے تسلط سے دست بردار ہو گئے مگر عثمانیوں کو اس کے بعد ویانا کی جنگ میں الجھنا پڑا، ہنگری کا جو حصہ آسٹریا کے زیر حکومت تھا، اس نے شہنشاہ لیوپولڈ کی مذہبی تعدیوں سے عاجز ہوکر بغاوت کردی، باغیوں کے سردار نے آسٹریا سے آزادی کا اعلان کر کے اپنے کو ہنگری کا فرماں روا قرار دیا اور عثمانی سلطنت کی سیادت قبول کرلی، جب عثمانی اس کی مدد کو پہونچے تو عیسائیوں کو یہ ناگوار گذرا، پولینڈ نے آسٹریا کی مدد کا اعلان کر دیا حالانکہ اس سے پہلے عثمانیوں سے اس کی صلح ہوگئی تھی، لورین کا شہزادہ چارلس بھی آسٹریا کی مدد کو پہونچ گیا اور ان مسیحی حلیفوں میں یہ جذبہ پیدا کیا گیا کہ ویانا تمام مسیحی یورپ کا قلب ہے اس کی مدافعت ایک مقدس فرض ہے، ویانا کو ترکوں سے چھڑا لینا حقیقۃً سارے یورپ کو محفوظ کر لینا ہے، اسی دینی جوش کو برانگیختہ کر کے ترکوں کے خلاف لڑائی لڑی گئی تو ترکوں کو شکست ہوئی، تمام یورپ میں بڑی خوشیاں منائی گئیں، ان عیسائی حکومتوں نے جو سلطنت عثمانیہ کی مغربی سرحدوں پر تھیں اس پر مذہبی تعصب میں حملہ آور ہونے لگیں اور ترکوں کے خلاف ایک مذہبی جنگ کا اعلان کر دیا گیا، اس کے لیے عیسائی حکومتوں کا ایک مقدس اتحاد ۱۶۸۴ء میں ہوا جس میں پولینڈ، وینس اور مالٹا شریک ہوئے بعد میں روس بھی شامل ہوگیا۔

پھر آسٹریا اور پولینڈ کی فوجیں شہزادہ چارلس کی سرکردگی میں گران، نوہزن، اوفن وغیرہ جیسے اہم مقامات اور ہنگری کے تمام قلعوں پر قابض ہوگئیں، وینس نے بوسنیا اور البانیہ

پر حملہ کر دیا۔ کون، لوار ینو، کورنتھ، ایتھنز اور دوسرے اہم شہروں پر سے بھی عثمانیوں کا تسلط جاتا رہا، پورا یونان وینس کے قبضہ میں آ گیا، وہاں کے لوگوں نے اس کی مدافعت میں ترکوں کی کوئی مدد نہیں کی، حالانکہ لارڈ ایورسلے نے اعتراف کیا ہے کہ یونانیوں کو بہت جلد معلوم ہو گیا کہ ان کے نئے آقا کس قدر ظالم اور لٹیرے ثابت ہوئے پھر ۱۶۸۶ء میں آسٹریا کی فوجوں نے بودا پر بھی قبضہ کر لیا اور ۱۶۸۷ء میں سلادونیا اور کروشیا کے علاقے بھی عثمانیوں کے تسلط سے نکل گئے حالانکہ یہ سارے علاقے سوڈیڑھ سو برس عثمانیوں کے زیر نگیں رہے، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ ان کی روادارانہ حکمرانی سے مطمئن تھے۔

مسیحیوں کی نظر الجزائر اور ٹیونس کی مسلمان آبادیوں پر بھی تھی، پہلے یہ عثمانی سلطنت ہی کے ماتحت تھے مگر مسیحیوں کی چالبازیوں سے یہ دونوں عثمانی حکومت سے ۱۶۵۰ء میں آزاد ہوئے، الجزائر تقریباً دو سو برس آزاد رہا لیکن ۱۸۳۰ء میں فرانس اس پر قابض ہو گیا، اسی طرح ۱۸۸۱ء میں تونس کو بھی فرانس نے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ (کریسی ج ۲ ص ۷۰-۲۳، ایورسلے ص ۱۸۳-۱۶۸، ٹرکی از اسٹینلی لین پول ص ۲۴۲-۲۱۴، تاریخ دولت عثمانیہ ج ا ص ۳۰۴-۲۸۲)

احمد کوپریلی کی رواداری: اس عہد کے عثمانی وزیر اعظم کے متعلق لارڈ ایورسلے لکھتا ہے:

> ''احمد اپنے مذہبی عقائد کا بہت پابند تھا لیکن اس کے باوجود وہ دوسرے مذاہب والوں کے لیے بڑا روشن خیال اور روادار رہا، اس نے یہ قانون اٹھا دیا کہ عیسائی نئے گرجا نہیں بنا سکتے ہیں، اس نے اپنی رعایا کو خوشحال بنانے کی پوری کوشش کی اور ان کے ہر قسم کے بار کو ہلکا کیا، اس کا نظم و نسق برائیوں سے پاک تھا، وہ کسی ملازمت کے تقرر کے وقت کوئی رقم قبول نہ کرتا اور نہ کسی اور کو قبول کرنے دیتا، اس نے خزانے کو پر رکھا، گرچہ وہ بہت سی لڑائیاں بھی لڑتا رہا ہے، میدان جنگ سے زیادہ ملکی نظم و نسق میں اس کی خوبیاں زیادہ نمایاں رہیں۔'' (ص ۱۲۱)

سلیمان ثانی کی رواداری: سلیمان ثانی (۹۱-۱۶۸۷ء) کے زمانہ میں بھی عیسائیوں

کے سیاسی اور مذہبی تعصب کا ہجوم رہا، آسٹریا کی تین فوجیں لورین کے شہزادہ چارلس، بیڈین کے شہزادہ لوئی اور سوائے کے شہزادہ یوجین کی سربراہی میں عثمانیہ سلطنت کے مختلف حصوں میں بڑھ رہی تھیں، انھوں نے ہنگری کا قلعہ ایولا پھر بلغراد، بوسنیا، نیش، وڈین وغیرہ پر قبضہ کرلیا، ڈلماشیا بھی بغاوت کر کے آزاد ہوگیا، سرویا کے بیشتر حصے بھی ان کے ہاتھ سے نکل گئے، موریا وینس میں شامل کرلیا گیا، کہیں کہیں ترک فوج ان سے مقابلہ کر کے کامیاب ہوئی روس بھی ان اتحادیوں کے ساتھ ہوگیا مگر جب وہ کریمیا پر حملہ آور ہوا تو ترکوں سے شکست کھائی، بلقان کے صوبوں پر آسٹریا کی فوجیں حملہ آور ہوئیں۔ وینس، پوپ اور مالٹا کے متحدہ بیڑوں نے مل کر ترکی بیڑہ کو کمزور کردیا مگر عیسائیوں کے اس غیظ وغضب کے باوجود عثمانیوں نے اپنی عیسائی رعایا کے ساتھ اپنی مذہبی رواداری جاری رکھی جو شروع سے اس حکومت کا شیوہ رہا، سلیمان ثانی کے زمانہ میں اس کے وزیر اعظم کی طرف سے تمام پاشاؤں کے نام احکام جاری کیے گئے کہ عیسائی رعایا پر کسی قسم کی سختی نہ کی جائے، ان کو پوری مذہبی آزادی حاصل ہو، اس کی خلاف ورزی کرنے والے حکام کو سخت سزائیں دی جائیں، جزیہ کے علاوہ تمام محصول معاف کردیے جائیں، جزیہ کی بھی تقسیم آمدنی کے لحاظ سے کی گئی، امراء سے چار دو کاٹ فی شخص، متوسط درجہ کے لوگوں سے دو دو کاٹ اور ادنی درجہ کے باشندوں سے ایک دو کاٹ وصول کیا جانے لگا، ان کو نئے گرجے بنانے کی بھی اجازت دی گئی، ان رعایتوں کی وجہ سے عیسائی رعایا کی ہمدردی دولت عثمانیہ سے ہوگئی، مغرب کی عیسائی حکومتیں رومہ کے کلیسا کے ماتحت تھیں، کلیسائی اثر کی وجہ سے وہ اپنی رعایا کے ساتھ ظالمانہ برتاؤ کرتی تھیں، ان کو بہ جبر عیسائی مذہب کا پیرو بناتی تھیں، یونان کے عیسائی جب موروسینی کی حکومت میں آگئے تو ان کو دولت عثمانیہ کی رواداری یاد آئی اور انھوں نے اس کے خلاف بغاوت کردی، موریا کے باغیوں نے وینس کے لوگوں کو اپنے ملک سے باہر کردیا اور بہ طیب خاطر دولت عثمانیہ میں پھر آگئے کہ وہ ان کے مذہبی معاملات میں مداخلت نہیں کرتی تھی۔

عیسائی حکومتوں کے اتحاد سے جاں باز ترکوں میں زیادہ مایوسی نہیں پیدا ہوئی، چنانچہ سلیمان ثانی کے زمانہ میں انھوں نے مقدونیہ، بلغاریہ، سرویا، نیش، ٹرانسلوینیا اور بلغراد

پر چھوٹی بڑی لڑائیاں لڑ کر اپنی سیادت تسلیم کرائی۔ (کریسی ج ۲ ص ۸۶-۷۱، ایور سلے ص ۱۸۷-۱۸۳، تاریخ دولت عثمانیہ ج ۱ ص ۳۱۳-۳۰۶)

احمد ثانی کے خلاف عیسائیوں کی جارحیت: احمد ثانی (۱۶۹۵ء-۱۶۹۱ء) کے زمانہ میں ترکی اور عیسائی بحری بیڑوں میں سخت جنگ ہوئی تو عیسائی بیڑوں کو شکست ہوئی مگر بری لڑائیوں میں ترکوں کو ہزیمت ہوئی، تو آسٹریا نے ٹرانسلوینا پر پھر اپنا قبضہ جمالیا، جمہوریہ وینس سے لڑائی لڑنے میں جزیرۂ سافر بھی عثمانیوں کے قبضہ سے نکل گیا۔ (کریسی ج ۲ ص ۸۶-۸۸، ایور سلے ص ۱۸۶-۱۸۵، تاریخ دولت عثمانیہ ج ۱ ص ۱۵-۲۱۴)

مصطفیٰ ثانی کے خلاف معاندانہ اقدام: مصطفیٰ ثانی (۱۷۰۳ء-۱۶۹۵ء) کے عہد میں ترکوں کو آسٹریا کے مقابلہ میں تمیسوار اور ہنگری میں جو فتوحات ہوئیں تو ان کے حوصلے بڑھے لیکن اس کے دوسرے سال آسٹریا کے مقابلہ میں ان کو زنٹا کے مقام پر جو شکست ہوئی تو عیسائی حکومتیں خوش تھیں کہ اب مسلمانوں کی حکومت یورپ سے جلد ختم ہو جائے گی، اب دولت عثمانیہ اپنے عیسائی دشمنوں سے گھری ہوئی تھی اور جب اس لڑائی کے بعد کارلووٹز کا صلح نامہ ہوا تو اس میں آسٹریا، روس، پولینڈ، وینس، برطانیہ اور ہالینڈ شریک ہوئے اور اس میں یہ طے پایا کہ آسٹریا کا قبضہ ٹرانسلوینیا اور ہنگری کے ان علاقوں پر رہے گا جو دریائے مروش کے شمال اور دریائے تھامس کے مغرب میں واقع تھے، ہنگری کا صرف ایک ثلث عثمانیوں کے قبضہ میں رہا، آسٹریا، ہنگری اور ٹرانسلوینیا حکومت عثمانی کو خراج دینے سے آزاد کر دیئے گئے، وینس کا قبضہ موریا اور البانیہ پر برقرار رکھا گیا، آبنائے کورنتھ کے شمالی علاقے دولت عثمانیہ کو دلائے گئے، پولینڈ کو پوڈولیا اور کابینک مل گئے، روس کو شہر ازف اور بحر ازف کے شمالی علاقے دلائے گئے، اس صلح نامہ سے یورپ کی عیسائی حکومتیں خوش تھیں کہ عثمانیوں کا اقتدار یورپ سے جاتا رہا۔ (کریسی ج ۲ ص ۱۰۵-۸۹، ایور سلے ص ۱۹۰-۱۸۶، تاریخ دولت عثمانیہ ج ۱ ص ۲۵-۳۱۶)

احمد ثالث کی شرافت اخلاق کے خلاف عیسائیوں کا تعصب: احمد ثالث (۳۰-۱۷۰۳ء) کے زمانہ میں ترکوں نے اپنے کو بہت کچھ سنبھالا اور عیسائی حکومتوں کے تعصب

اور عداوت کا مقابلہ اچھی طرح کیا، روس کی للچائی نظریں عثمانیوں کے علاقوں پر پڑ رہی تھیں، گو دونوں میں صلح کا معاہدہ تھا مگر روس بحر اسود کے ساحل پر جو نئے قلعے بنوا رہا تھا تو عثمانی اس کو اپنے لیے خطرہ سمجھتے رہے، اسی زمانہ میں روس اور سوئڈن کی جنگ ہوئی تو سوئڈن کا فرماں روا چارلس نے اس سے شکست کھا کر سلطنت عثمانیہ کے حدود میں پناہ لی، جہاں اس کا شاہانہ استقبال کیا گیا، روس کو یہ ناگوار گذرا، اس نے چارلس کو اس کے حوالہ کر دینے کی فہمائش کی لیکن احمد ثالث نے اس کو یہ جواب دیا کہ آئین شرافت کی خلاف ورزی ممکن نہیں روس نے کچھ دھمکیاں دیں تو ان کی پرواہ نہیں کی گئی، روس کے کلیسا نے ترکوں کے خلاف نفرت پھیلانی شروع کی اور ترکوں کو یورپ سے نکالنا ایک مذہبی فریضہ قرار دیا چنانچہ جب اس جنگ کا اعلان کیا گیا تو روسی علم پر ایک طرف صلیب کی تصویر تھی اور دوسری طرف یہ لکھا ہوا تھا: "خدا اور مسیحیت کے لیے" روس کی طرف سے بلقان کی سلافی قوموں کو سلطنت عثمانیہ کے خلاف ابھارا گیا، پیٹر اعظم خود فوج لے کر عثمانیوں سے لڑنے کے لیے روانہ ہوا تو غیظ وغضب میں بڑھتا ہوا دریائے پرتھ کو عبور کر کے ایک ایسی جگہ پر خیمہ زن ہوا کہ اس کے ایک بازو پر دریا تھا، دوسرے پر ایک دلدل تھا، سامنے کی پہاڑیوں پر ترکوں کی فوج تھی جس کی توپوں کی زد میں اس کی پوری فوج آ گئی تھی، پیٹر اعظم پریشان ہوا کہ وہ اور اس کی پوری فوج ترکوں کی توپوں سے ہلاک کر دی جائے گی، اس موقع پر پیٹر اعظم کی ملکہ کیتھرائن نے ترکوں سے منت وزاری کی جنھوں نے روسیوں سے سفاکانہ اور بہیمانہ سلوک کرنے کے بجائے اس سے قلعۂ ازف، شہر تگروک اور کچھ اور علاقے لے کر پیٹر اعظم اور اس کی فوج کی جان بخشی کر دی، پیٹر اعظم نے وعدہ کیا کہ وہ سلطان کی رعایا کو کسی قسم کا نقصان نہ پہونچائے گا اور سوئڈن کے فرماں روا چارلس کو اپنے وطن واپس جانے میں مزاحمت نہ کرے گا مگر پرتھ کی یہ صلح عارضی رہی، روس کی وفاداری پر عثمانیوں کو یقین نہیں رہا۔

آسٹریا سے معاہدہ ہو چکا تھا مگر اس نے عثمانیوں کو نقصان پہونچانے کی غرض سے مونٹی نیگرو کے باشندوں کو سلطنت عثمانیہ کے خلاف بغاوت کرنے میں مدد کی تو عثمانی فوج اس نازک موقع کو سنبھالنے کے لیے متحرک ہوئی، ایک بار پھر اپنی سپہ گری کا جوہر دکھایا اور

اس نے موریا کو ایک سو ایک روز کے اندر فتح کر لیا، وہاں کے یونانی باشندوں نے اپنے عیسائی آقاؤں کی کوئی مدد نہیں کی کیونکہ وہ ان کے ظلم و تعدی سے عاجز تھی، عثمانی وہاں پہونچے تو اس نے ان کا استقبال کیا۔

آسٹریا معاہدۂ کارلوڈمز کا پابند نہ رہا اور وہ عثمانیوں کے علاقوں پر قابض ہونے کی فکر میں رہا، اس نے وینس سے مل کر عثمانیوں سے پھر جنگ کی، بلغراد کی جنگ میں عثمانیوں کو شکست ہوئی اور آسٹریا، سرویا اور مغربی لاجیا پر قابض ہو گیا، سرویا کے باشندے ترکوں کے مقابلہ میں آسٹریا کی حکومت کو پسند نہیں کرتے تھے، اسی لیے ڈینوب کے جنوبی علاقوں پر آسٹریا کا قبضہ عارضی ثابت ہوا، بائیس سال کے بعد عثمانیوں نے بلغراد کو پھر فتح کیا تو سرویا کے باشندوں نے آسٹریا والوں کو نکال باہر کیا، بلغراد کی لڑائی کے بعد جو صلح نامہ ہوا اس میں بہت سے عثمانی علاقے آسٹریا اور وینس کو دلائے گئے۔ (کریسی ج ۲ ص ۱۵۷-۱۰۷، ایور سلے ص ۲۰۲-۱۹۱، تاریخ دولت عثمانیہ ج ۱ ص ۱۴۱-۳۲۶)

محمود اول کی قسطنطنیہ پر قبضہ کرنے میں کوشش: محمود اول (۵۴-۱۷۳۰ء) کے عہد میں عثمانیوں کے خلاف یورپ کی عیسائی حکومتوں کی سازشیں بہت زیادہ بڑھ گئیں، روس قسطنطنیہ کی فتح کا خواب دیکھنے لگا اور اس نے اپنے اس ارادہ کا اعلان بھی کیا کہ وہ ترکوں کو یورپ سے نکال کر رہے گا، قسطنطنیہ کی فتح میں پہلا سنگ گراں کریمیا تھا جس نے اپنی تجارت کی خاطر عثمانی سلطنت سے اچھے تعلقات قائم کر رکھے تھے مگر روسی اس پر حملہ آور ہوئے اور جب کریمیا کے اندر روسی فوج داخل ہوئی تو دو ہزار مکانات، محلات اور تمام پبلک عمارتیں برباد کر دی گئیں، بوڑھوں، بچوں اور عورتوں پر ذرا بھی رحم نہیں کیا، جہاں روسی فوج کی مطلق مزاحمت نہیں کی گئی، وہاں بھی شہروں اور قصبوں میں آگ لگا دی گئی اور باشندوں کو تہ تیغ کیا گیا، قدیم یادگاریں مٹا دی گئیں، کتب خانے اور مدرسے شعلوں کی نذر کر دئے گئے، عبادت گاہیں منہدم کر دی گئیں۔ (کریسی ج ۲ ص ۱۸۱-۱۸۰) روس کی دوسری فوجیں اور طرف بھی بڑھ رہی تھیں، البتہ یوکرین میں ترکوں نے ان کو شکست دی اور تیس ہزار روسیوں کو قیدی بنا لیا، اس افراتفری کے زمانہ میں آسٹریا بھی خفیہ طور سے روس سے مل گیا اور دونوں

نے سلطنت عثمانیہ کے مختلف حصوں پر حملے کردیے، کریمیا پر ترکوں کا قبضہ پھر ہو گیا تھا مگر روس اور آسٹریا کی فوجوں کی یلغار اس پر از سر نو ہوئی تو کریسی کا بیان ہے کہ روسی فخر کرتے تھے کہ اس حملہ میں انھوں نے چھ ہزار مکانات، اڑتیس مسجدیں، دو گرجے اور پچاس چکیاں جلا ڈالیں۔

آسٹریا عثمانیوں سے برابر برسر پیکار رہا، کبھی ان کے علاقوں پر قابض ہو جاتا اور کبھی ان کو خالی کر دیتا، بالآخر ترکوں کے مشہور جنرل محمد پاشا نے اس کو پیٹروواراڈین کے مقام پر شکست فاش دی، جس کے بعد بلغراد کی صلح ہوئی، اس کی رو سے بلغراد، بوسینا، سرویا اور ولاچیا کے تمام علاقے عثمانیوں کو واپس کر دیے گئے، یہ عثمانیوں کی عظیم الشان کامیابی تھی اس کے بعد بائیس سال تک عیسائی حکومتیں عثمانیوں سے جنگ کرنے کی ہمت نہ کر سکیں۔ (کریسی ج ۲ ص ۲۰۶-۱۴۹، ایورسلے ص ۲۱۰-۲۰۲، تاریخ دولت عثمانیہ ج ۱ ص ۳۴۲-۲۶۴)

عثمان ثالث کا شریفانہ رویہ: عثمان ثالث (۱۷۵۴-۵۷ء) کی حکومت مختصر رہی، اس درمیان میں یوروپی حکومتیں اپنے نفاق اور اختلاف کی وجہ سے آپس ہی میں برسر پیکار رہیں مگر عثمانیوں نے اپنی شرافت اخلاق کی وجہ سے اس سے کوئی فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔

مصطفیٰ ثالث کے خلاف پرفریب ریشہ دوانیاں: مصطفیٰ ثالث (۱۷۵۷-۷۳ء) کے زمانہ میں ترکوں کی یہ کوشش رہی کہ عیسائی حکومتوں سے اتحاد رکھیں اور اپنے اندرونی حالات کی اصلاح کی طرف زیادہ توجہ کریں، اس زمانہ میں روس اور آسٹریا میں بڑی دشمنی ہو گئی تھی، البتہ پروشیا فریڈرک ثانی اعظم کی حکومت میں غیر معمولی طاقت کے ساتھ ابھر چکا تھا، ۱۷۶۱ء میں عثمانی سلطنت نے پروشیا سے دوستی کا معاہدہ کر لیا مگر فریڈرک اعظم نے بہت جلد اس معاہدہ کو مسترد کر کے عثمانیوں کے دشمنوں سے رشتۂ اخوت جوڑ لیا، اسی درمیان میں روس کی کیتھرائن ثانیہ نے اپنے شوہر زار کو قتل کرا کے خود تخت پر بیٹھ گئی، فریڈرک نے اس سے دوستی کا معاہدہ کر لیا اور دونوں نے مل کر پاس پڑوس کی سلطنتوں پر یلغار شروع کر دی، پہلے دونوں نے پولینڈ کی تقسیم کرا کے اس کو اپنے اپنے قبضہ میں رکھنا چاہا، پہلے پروشیا کی فوجوں نے پولینڈ پر قبضہ کر لیا، اس کے بعد کیتھرائن کے ایک سابق آشنا اسٹانسلاس کو اس کے تخت پر

بٹھایا، عثمانیوں نے اس ظالمانہ کارروائی کے خلاف احتجاج کیا تو روس نے کریمیا، موریا، مونٹی نگرو اور جارجیا میں ان کے خلاف بغاوت پھیلانے کی کوشش شروع کردی تو اکتوبر ۱۷۶۸ء میں عثمانیوں کو روسیوں کے خلاف محاذ آرائی کرنی پڑی، روس بڑی تیاریوں کے ساتھ جنگ میں شریک ہوا، ابتدا میں ترکوں کو فتح ضرور ہوئی لیکن جب روسیوں نے مولڈیویا پر قبضہ کرلیا تو کیتھرائن نے عثمانیوں کے خلاف موریا، کریمیا پھر مصر اور شام میں بھی بغاوت پھیلانے کی کوشش کی اور جب ترکی اور روسی بیڑوں کا مقابلہ ہوا تو ترکوں کو اپنی بہادرانہ جنگ کے بعد آخر میں شکست ہوئی اور عثمانی جہازوں کی بڑی بربادی ہوئی، روس کی فتوحات سے آسٹریا اور پروشیا دونوں متردد ہوئیں، ان کو اپنے اوپر روسی غلبہ کا خطرہ محسوس ہونے لگا، فرانس اس وقت تک دولت عثمانیہ کا دوست تھا لیکن روس کے خلاف اس نے عثمانیوں کی کوئی مدد نہیں کی بلکہ اندرونی طور پر اس کی یہ کوشش رہی کہ دولت عثمانیہ اور روس کو وہ باہم لڑاتا رہے اور خود علاحدہ رہے، انگلستان بھی دولت عثمانیہ کی دوستی کا دم بھرتا تھا مگر خفیہ طور سے روسیوں کو جنگ میں پوری مدد دے رہا تھا، عثمانیوں کا دوست بن کر اور ان کے رازوں سے واقف ہوکر روس کو باخبر رکھتا مگر فرانس انگلستان کی حکمت عملی کو پسند نہیں کرتا تھا کیونکہ ہندوستان میں انگلستان نے فرانس کو زیر کر کے وہاں اپنی حکومت قائم کرنے جارہا تھا، انگلستان کو ہندوستان میں روس سے کوئی خطرہ نہ تھا، اس لیے اس کا حامی خفیہ طور سے بنا رہا، پروشیا کو خیال ہوا کہ روس کی فتوحات سے سلطنت عثمانیہ کمزور ہوگئی تو روس اس کے لیے بڑا خطرہ بنا رہے گا، مگر وہ روس ہی کی مدد سے پولینڈ کی تقسیم چاہتا تھا، اس لیے خود ان عیسائی حکومتوں کے تعلقات ایک دوسرے کے ساتھ فریب، مکاری اور خداعی پر مبنی تھے، آسٹریا کی پالیسی اور بھی پر فریب تھی وہ روس کی بڑھتی ہوئی قوت سے خائف ہوکر دولت عثمانیہ سے اتحاد چاہتا تھا اور اسی بہانے اس کے علاقہ پر قبضہ بھی کرنا چاہتا تھا مگر روس کو ناراض بھی نہیں کرنا چاہتا تھا، اس لیے کبھی دولت عثمانیہ اور کبھی روس کی طرف مائل ہوجاتا پھر وہ فرانس اور دولت عثمانیہ کے اتحاد کو بھی پسند نہیں کرتا تھا مگر اس کی مخالفت کر کے دولت عثمانیہ کو بدظن بھی نہیں کرنا چاہتا تھا مگر جب روس نے کریمیا پر قبضہ کرلیا تو آسٹریا دولت عثمانیہ سے ایک معاہدہ کرنے پر تیار ہوگیا جس

میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ روس کے مقابلہ میں آسٹریا دولت عثمانیہ کی مدد کرے گا، اس کا کوئی حصہ آسٹریا علاحدہ نہ ہونے دے گا اور پولینڈ کے استقلال کی حفاظت کرے گا مگر قبل اس کے کہ آسٹریا اس پر دستخط کرے کیتھرائن نے سلطنت عثمانیہ کی تقسیم سے متعلق جو تجویزیں آسٹریا کے پاس بھیجیں اس میں یہ پیش کیا کہ دولت عثمانیہ کے علاقوں کو روس اور آسٹریا اپنے قبضہ میں لے کر ترکوں کو دریائے ڈینوب تک محدود رکھا جائے، آسٹریا دولت عثمانیہ سے بے رخی اختیار کر کے روس کی طرف مائل ہو گیا مگر انگلستان نے اس معاہدہ کو فاش کر دیا جو آسٹریا اور دولت عثمانیہ سے ہوا تھا، روس اور پروشیا پولینڈ کی تقسیم کے لیے راضی ہو چکے تھے، آسٹریا بھی اس تقسیم سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا، اس لیے آسٹریا نے شرافت اخلاق اور عہد و پیمان کے ایفا کا خیال کیے بغیر پولینڈ اور سلطنت عثمانیہ کی تقسیم سے متعلق کیتھرائن سے مراسلت شروع کر دی، اس پرفریب ماحول میں لڑائیاں بھی ہوتی رہیں اور صلح کی باتیں بھی کی گئیں، دو مرتبہ صلح کے شرائط مرتب ہوئے مگر فریقین ان کو تسلیم کرنے پر راضی نہ ہوئے تو ۱۷۷۳ء میں آسٹریا میں روسیوں اور عثمانیوں میں ایک بڑی لڑائی ہوئی، روسیوں کو اس میں زبردست شکست ہوئی مگر روسیوں نے اس کا بدلہ شوملہ اور جیک پر قبضہ کر کے لیا اور وہاں داخل ہو کر بڑے مظالم کیے، ان کی آمد کی خبر سن کر اکثر باشندے ان جگہوں کو چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے مگر جب روسی وہاں داخل ہوئے تو تقریباً تمام کمزور اور بوڑھے مردوں، بیکس عورتوں اور بچوں کے ساتھ بڑا ہی وحشیانہ سلوک کیا، عورتیں، بچے اور بوڑھے سب کے سب دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کے مار ڈالے گئے، ان کے مظالم سے پورا یورپ چیخ اٹھا، عثمانی فوج بھی ان مظالم کے خلاف متحرک ہوئی اور وارنا کی جنگ میں روسیوں کو شکست دی۔ (کریسی ج ۲ ص ۵۳-۲۰۸، ایور سلے ص ۲۱۹-۲۱۰، تاریخ دولت عثمانیہ ج ۱ ص ۳۹۲-۳۶۴)

عبدالحمید اول کے خلاف روسی ملکہ کیتھرائن کے منصوبے: عبدالحمید اول (۷۹-۱۷۷۴ء) کے زمانہ میں ۱۷۷۴ء میں روسیوں نے ہرسوا کے مقام پر ترکوں سے پھر ایک جنگ کی اور ان کو شکست دی مگر اس کو جانی اور مالی نقصان زیادہ ہوا، اس کے یہاں وبائی بیماریاں بھی پھیلی ہوئی تھیں، کیتھرائن کے خلاف شورش بھی تھی، اس لیے روس نے عثمانیوں

سے آسان شرائط پر صلح کرلی، صلح نامہ کینارجی میں روس تقریباً ان تمام عثمانی علاقوں سے دست بردار ہوگیا جن پر اس کی فوجوں نے قبضہ کرلیا تھا البتہ کریمیا اور اس کے سرحدی علاقوں میں آزاد تاتاری حکومت قائم کردی اور کچھ قلعے روسیوں کے قبضہ میں رہے، روس کے سفیروں کو عیسائیوں کی طرف سے عثمانی حکومت کو معروضات پیش کرنے کی اجازت دی گئی، یہ حق کسی دوسری مسیحی حکومت کو نہیں دیا گیا، روس کی رعایا کو بیت المقدس کی زیارت کی بھی عام اجازت دی گئی اور وہ ہر قسم کے محصول سے بری کردئے گئے، روس کے تجارتی جہازوں کو سمندروں میں آمد ورفت کی پوری آزادی دی گئی، دولت عثمانیہ نے روسی سفیر کو عیسائیوں کی طرف سے معروضات پیش کرنے کا جو حق دیا، یہ اس کی رواداری تھی لیکن اس سے عیسائیوں نے بے جا فائدہ اٹھایا جس سے دولت عثمانیہ پریشان رہی۔

کیتھرائن نے بہت جلد اس صلح نامہ کو نظر انداز کردیا، اس نے اپنی زندگی کا مقصد یہ بنا رکھا تھا کہ ترکوں کو یورپ سے نکال کر قسطنطنیہ پر قبضہ کرلے اور جب اس کا ایک پوتا ۱۷۷۸ء میں پیدا ہوا تو اس کا نام قسطنطین رکھا اور اس کی تربیت ایسی دلانی شروع کی کہ اس کو قسطنطنیہ کا فرماں روا ہونا ہے اور بازنطینی شہنشاہیت کو واپس لانا ہے اور اس نے آسٹریا سے یہ معاہدہ کرلیا کہ دولت عثمانیہ کو ختم کرنے کے بعد کتنے علاقے آسٹریا اور کتنے روس کے پاس رہیں گے، اس تقسیم کا پورا نقشہ تیار کرلیا گیا، یہ بھی تجویز تھی کہ تھریس، مقدونیا، بلغاریہ، شمالی یونان اور بلغاریہ کو ملا کر ایک نئی سلطنت قائم کی جائے گی جس کا دارالسلطنت قسطنطنیہ ہوگا اور اس کا شہنشاہ کیتھرائن کا پوتا کونس ٹن ٹائن ہوگا۔

اس منصوبہ کی تکمیل کے لیے کیتھرائن بے چین تھی، اس لیے وہ کریمیا پر حملہ آور ہوگئی اور وہاں کی تاتاری حکومت کو ختم کرکے کریمیا اور اس کے ملحق علاقہ کیوبان کو اپنی سلطنت میں شامل کرلیا، تاتاری اس کے خلاف جنگ پر آمادہ ہوئے تو ان کا قتل عام شروع کردیا گیا، تیس ہزار تاتاری تہ تیغ کردئے گئے، روسیوں کے مظالم سے پچھتر ہزار ارمنی عیسائی بھی وہاں سے فرار ہوئے جن میں سات ہزار کے علاوہ باقی سب فاقہ کشی اور سردی کی شدت سے ہلاک ہوگئے۔

کیتھرائن کے اس اقدام سے ترک، فرانس اور انگلستان سب ہی چوکنا ہوئے، لیکن ان میں سے کوئی دولت عثمانیہ کا ساتھ دینے کے لیے تیار نہیں ہوا، کیتھرائن کو یقین ہو چلا کہ وہ قسطنطنیہ کو آسانی سے فتح کر لے گی، دولت عثمانیہ کو اعلان جنگ کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، انگلستان عثمانیوں کا ہمدرد بنا رہا لیکن دوستی کے پردہ میں دشمنی کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا، اس کی کوشش تھی کہ فرانس اور دولت عثمانیہ میں اتحاد نہ ہو اور دولت عثمانیہ تنہا روس کے خلاف لڑنے کے لیے تیار ہو جائے، آسٹریا نے بھی عثمانیوں کو فریب میں مبتلا رکھا کہ وہ روس سے صلح کرا دے گا مگر پھر یکا یک وہ بلغراد پر حملہ آور ہوا مگر ترکوں نے اس کی فوج کو اس طرح گھیر لیا کہ اس کے سب لشکری ترکوں کے ہاتھوں قتل کیے جاتے مگر ان کے کمانڈر نے معافی مانگ کر ان کی جانیں بچالیں، دولت عثمانیہ نے آسٹریا پر پہلے بھی طرح طرح کے احسانات کیے تھے مگر بقول یوروپین مورخ کریسی حکومت آسٹریا پر حرص وہوس کا اتنا غلبہ تھا کہ احسان مندی ایمان داری اور وقار وعزت کے شریفانہ جذبات اس کو ذرا بھی متاثر نہ کر سکے، چنانچہ ۱۷۷۸ء میں آسٹریا نے عثمانیوں کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا مگر منڈیا کے مقام پر ترکوں نے آسٹریا کو شکست دی، اگست ۱۷۶۸ء میں روس نے عثمانیوں کے خلاف جنگ کر کے اوکزانوف کا محاصرہ کیا تو اس میں ترکوں کو شکست ہوئی، اس کے سقوط کے بعد کریسی نے یہ لکھا ہے۔

ترکی عورتیں اور بچے جن کی تعداد تقریباً چار سو تھی اوکزانوف کی فتح کے بعد جب شہر سے نکال کر روسی فوج کے پڑاؤ میں لائے گئے تو پہلی رات سب کے سب ایک خیمہ میں ٹھہرا دئے گئے، موجودہ حالات میں ان کے قیام کے لیے اس سے بہتر کوئی انتظام نہیں کیا جا سکتا تھا گو اس رات کو سخت برف باری ہو رہی تھی اور ان غریبوں کو سردی کی شدت اور کپڑوں کے نہ ہونے سے بے حد تکلیف تھی، ان میں سے بہتیرے دشمنوں کی شدید تکلیف میں مبتلا تھے، ان سبھوں پر کامل سکوت طاری تھا، کوئی عورت نہ روتی تھی اور نہ آہ وفغاں کرتی تھی حالانکہ ان میں سے شاید ہر ایک کا باپ یا بچہ یا شوہر قتل ہو چکا تھا، یہ عورتیں سکون اور استقلال کے لہجہ میں باتیں کرتی تھیں اور جو سوالات ان سے کیے جاتے ان کے جوابات کسی اضطراب کے بغیر دیتیں، یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ ان کی یہ حالت بے حسی کا نتیجہ ہے یا پھر

اس کا سبب تسلیم ورضا کی وہ تعلیم ہے جوان کا مذہب انھیں دیتا ہے(کریسی ج ۲ص ۳-۲۹۲ ایور سلے ص ۲۲۸-۲۱۹، تاریخ دولت عثمانیہ ج ۱ص ۴۲۵-۳۹۷) کریسی نے لکھا ہے کہ عبدالحمید مخلصانہ طور پر اپنے وزرا، جنرلوں اور اپنے امپائر کے ہر طبقہ کے لوگوں کے ساتھ صلح کا جویا رہا(ج ۲ص ۲۵۵) مگر یورپ کے عیسائیوں نے اس کو چین سے نہیں رہنے دیا۔

سلیم ثالث کے زمانہ میں ملکہ کیتھرائن کا خواب اور عیسائی حکومتوں کی دشمنی: سلیم ثالث (۱۸۰۷-۱۷۸۹ء) کے زمانہ میں آسٹریا کی طرف سے عثمانی علاقوں پر برابر یلغار ہوتی رہی ترکوں نے ان کے خلاف لڑائیاں لڑیں مگر وہ کامیاب نہ ہوئے، بوسنیا اور سرویا پر آسٹریا کا قبضہ ہوگیا، فریقین میں چھوٹی چھوٹی لڑائیاں ہوتی رہیں، دونوں اپنی اپنی فتح وشکست سے مطمئن نہ تھے تو ۱۷۹۱ء میں ایک صلح نامہ ہوا جس سے آسٹریا نے وہ تمام علاقے عثمانیوں کو واپس کردیئے جن پر وہ قابض ہوگئے تھے۔

کیتھرائن اب تک قسطنطنیہ کی فتح کا خواب دیکھ رہی تھی وہ فخریہ کہتی کہ اگر مغربی سلطنتوں نے اس کو سینٹ پیٹرس برگ چھوڑنے پر مجبور کیا تو وہ قسطنطنیہ کو اپنا دارالسلطنت بنالے گی، اس نے اپنے پوتے قسطنطین کو اس کا پہلا حکمراں نامزد بھی کردیا، اسی مقصد کی خاطر اس نے یونانیوں کو عثمانیوں کے خلاف بغاوت کرنے پر آمادہ کیا اور اپنے بحری بیڑے سے ان کی مدد بھی کی، شروع میں ترکوں کو فتح ہوئی، انھوں نے یونانی بیڑے کو تباہ کیا لیکن کیتھرائن کی فوج نے اسماعیل پر قبضہ کرلیا جو بحر اسود سے تقریباً چالیس میل کے فاصلہ پر دولت عثمانیہ کا ایک اہم قلعہ تھا، روسی فوجوں نے اس میں داخل ہوتے ہوئے جو درندگی دکھائی اس کے منظر کو دیکھ کر خود روسی سپہ سالار کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔(ایور سلے ص ۲۳۱)

عیسائی حکومتوں کے باہمی تعلقات میں بڑی منافقت رہی، ان کی دوستی اور دشمنی میں ان کا اپنا مفاد غالب رہتا، روس کی بڑھتی ہوئی طاقت یورپ کی اور مسیحی حکومتوں کو پسند نہ آئی، پروشیا، ہالینڈ اور انگلستان کے دباؤ سے کیتھرائن عثمانیوں سے صلح کرنے کے لیے اپنی مرضی کے خلاف تیار ہوگئی، جس کے بعد روس نے عثمانیوں کے تمام علاقے ان کو واپس کردیئے، یونان بھی ان کے زیر نگیں رہا، البتہ دریائے نیسٹر روس کی نئی سرحد قرار پائی مگر کیتھرائن یاسی

کے اس صلح نامہ سے مطمئن نہ تھی، اس کا ارادہ تھا کہ پہلے پولینڈ پر اس کا پورا تسلط ہوجائے تو پھر عثمانیوں کی طرف متوجہ ہو، ۱۷۹۵ء میں جب اس نے آسٹریا اور پروشیا سے مل کر پولینڈ کی تقسیم کرالی تو تین لاکھ فوج اور ایک زبردست بحری بیڑا تیار کر کے عثمانی علاقوں پر حملہ کرنا چاہا تو ۱۷۹۷ء میں اس کی موت ہوگئی۔

اسی درمیان میں انقلاب فرانس کی وجہ سے یورپ کی سیاست بدلنی شروع ہوگئی، لوئی شانز دہم کا وہاں قتل ہوا، اس کے بعد نپولین بوناپارٹ کا عروج ہوا، اس کا بس چلتا تو پورا یورپ کیا بلکہ پورے ایشیا کو اپنے اور فرانس کے زیرنگیں کردیتا، اس نے وینس کی قدیم جمہوری حکومت کو تہس نہس کردیا پھر اپنی فاتح فوج کے ساتھ آسٹریا کی طرف بڑھا، عثمانی چاہتے تو فرانس سے مل کر اپنے قدیم دشمنوں سے بدلہ لیتے مگر ان کی سیاست کی شرافت اور اخلاق میں ایسی چیزیں روانہیں رہیں، نپولین کی فتوحات کے سلسلہ میں جزائر ایونین اور ایڈریاٹک کے مشرقی ساحل کے علاقے آگئے تو فرانسیسی علاقہ سلطنت عثمانیہ کی سرحد سے بالکل متصل ہوگیا، جس کے بعد نپولین کو عثمانی مقبوضات کی طرف بڑھنے کا خیال پیدا ہوا، عثمانی سلطنت اندرونی طور پر کچھ کمزور ہوچلی تھی، اس لیے نپولین کے عزم کو اور تقویت پہونچی، وہ چاہتا تھا کہ اس حکومت کا خاتمہ اس کے ہاتھوں ہو، اس نے پہلے عثمانی علاقوں میں اپنے ایجنٹ بھیج کر وہاں بغاوت پھیلانے کی کوشش کی پھر مصر کی طرف رخ کیا، مصر کی فتح سے اس کو اپنے دو ارادوں کی تکمیل کی فکر تھی، ایک تو عثمانی سلطنت پر ضرب کاری لگانی تھی دوسرے اس کا ارادہ تھا کہ وہ مصر کو فتح کر کے ہندوستان پر حملہ کرے گا اور وہاں برطانیہ کی قوت کو تباہ کر کے اپنے اور فرانس کے لیے ایک عظیم ایشیائی سلطنت قائم کرلے گا، دولت عثمانیہ اور مصر سے دوستانہ تعلقات تھے، نپولین نے ان تعلقات کی مطلق پرواہ نہ کی، اس کا ارادہ تھا کہ ایشیا میں ایک بڑی سلطنت قائم کر کے یونانیوں اور دوسرے عیسائی فرقوں کو دولت عثمانیہ کے خلاف ابھارے پھر ترکوں کو شکست دے کر قسطنطنیہ پر قبضہ کرلے اور پھر وہاں سے یورپ پر حملہ آور ہو۔

مئی ۱۷۹۸ء میں نپولین اپنی فوج لے کر طولون سے روانہ ہوا، پہلے مالٹا کو زیر کیا

پھر اسکندریہ کی طرف بڑھا پھر قاہرہ کے قریب مصر کے مملوکوں سے جنگ اہرام ہوئی، وہ ہارے اور نپولین کو فتح ہوئی اور مصر پر اس کا قبضہ ہو گیا اور جب قاہرہ کے لوگوں نے اس کے خلاف بغاوت کی تو اس کو جس طرح فرو کیا گیا، اس کا حال ایک یوروپی مورخ ہی کی زبانی سنیے:

''یہ بغاوت ہولناک، وحشیانہ اور ظالمانہ طریقہ سے فرو کی گئی، دستے قائم کر کے فوج باغیوں پر ٹوٹ پڑی اور انھیں بیچ بیچ ذبح کر کے ڈال دیا، بوناپارٹ نے حکم دے دیا تھا کہ تمام مسلح باشندے جو سڑک پر پائے جائیں قتل کر دئے جائیں، باغیوں نے جلد اطاعت قبول کر لی، گرچہ ان کے پانچ ہزار سے زیادہ آدمی قتل ہو گئے، نپولین کی رحمدلی کی بہت کچھ تعریف کی گئی ہے لیکن اس کی رحمدلی کی ایک مثال یہ ہے، ایک مقررہ مدت تک تیس قیدی روزانہ قتل کیے جاتے رہے، مقصد یہ تھا کہ لوگوں کے دلوں میں وحشت بیٹھ جائے، ایک روز صبح کو فرانسیسی دستے خچروں کا ایک جھنڈ جن پر بورے لدے ہوئے تھے ہنکاتے ہوئے قاہرہ میں لائے، اس وقت وہاں آدمیوں کا بڑا اژدحام تھا، ہر شخص یہ معلوم کرنے کا مشتاق تھا کہ بوروں میں کیا چیز ہے، سپاہیوں نے بیک وقت تمام بورے کھول ڈالے، ان کے اندر سے سینکڑوں سر برآمد ہوئے، آخر ان بدنصیبوں کا جرم کیا تھا صرف یہ کہ وہ اپنے وطن کو آزاد کرانا چاہتے تھے، جسے دشمن نے حملہ کر کے برباد کر ڈالا تھا اس میں کوئی شک نہیں کہ ریگستان کے سیاہ باشندے یوروپین تہذیب کے متعلق کوئی اچھی رائے قائم نہ کریں گے۔'' (ہسٹورین ہسٹری آف دی ورلڈ ج ۱۲ص ۴۶۷، دولت عثمانیہ ج ۱ص ۶۲-۴۶۱)

مصر اگرچہ عملاً مملوکوں کے زیر تسلّط تھا مگر دولت عثمانیہ کی سیادت وہاں تسلیم کی جاتی تھی نپولین کے ارادوں سے انگلستان اور روس دونوں کو تشویش ہوئی اس لیے پہلے انگلستان نے عثمانی سلطنت کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا پھر روس نے بھی فرانس کی دشمنی میں عثمانی سلطنت کا ساتھ دیا اور اس نے اپنا جنگی بیڑا بھی پیش کرنے کا وعدہ کیا، روس اپنی

منافقانہ پالیسی کی وجہ سے عثمانی حکومت کا دوست بن گیا اور روسی اور ترکی بیڑوں نے مل کر جزائر ایئونین پر قبضہ کرلیا، اس اثنا میں نپولین شام کی طرف بڑھ گیا، ۱۷۹۹ء میں اس نے غزہ اور یافہ کو فتح کرلیا، یافہ کے ترکی دستہ نے اپنے اسلحے اس شرط پر ڈالے تھے کہ وہ جنگی قیدی سمجھے جائیں لیکن نپولین نے ایفائے وعدہ کے بجائے پورے دستہ کو قتل کرادیا پھر وہ عکا کی فتح کے لیے بڑھا مگر اس قلعہ کو ترکوں کی بہادری کی وجہ سے فتح نہ کرسکا اور مصر کو واپس ہوتے وقت بڑی حسرت سے کہا کہ اس حقیر قلعہ کے ساتھ مشرق کی قسمت وابستہ تھی یعنی اب وہ ہندوستان پہونچ کر ایک مشرقی سلطنت قائم نہ کرسکے گا۔

اسی زمانہ میں روڈس کی پندرہ ہزار عثمانی فوج خلیج ابوقیر میں پہونچی اور فرانسیسیوں کو آسانی سے شکست دے دی، یہ سن کر نپولین قاہرہ سے چل کر ابوقیر پہونچا اور ترکوں سے جنگ کی، ترک فاتح ہوگئے تھے مگر اپنی بداحتیاطی سے پھر سپر ڈال دی، جس کے بعد مصر پر نپولین کا قبضہ برقرار رہا مگر پھر ترکی اور انگریزی فوجوں نے مل کر نپولین کی فوج کو قاہرہ میں ہتھیار ڈالنے پر مجبور کیا اور مصر پر پھر دولت عثمانیہ کا ازسرنو قبضہ ہوگیا، اس کے بعد ایک صلح نامہ ہوا جس میں فرانس نے مصر پر دولت عثمانیہ کی فرماں روائی تسلیم کی، اس کے بدلہ میں اہل فرانس کو وہ مراعات دی گئیں جو سلطنت عثمانیہ کی طرف سے پہلے حاصل تھیں۔

عثمانیوں کو پھر بھی چین نصیب نہیں ہوا، سرویا میں ان کے خلاف پھر شورش شروع ہوگئی جو یہاں تک بڑھی کہ وہ آزادی کا مطالبہ کرنے لگا، ادھر روس اور فرانس میں جنگ چھڑ گئی تھی، روس اس جنگ میں دولت عثمانیہ کو اپنی حمایت میں استعمال کرنا چاہتا تھا وہ بحراسود کے جنوبی مشرقی ساحل پر اپنا اقتدار بڑھا رہا تھا اور اس کے ساحل پر ایک اور جنگی قلعہ بنالیا تھا پھر جب روس نپولین کے خلاف آسٹریا اور انگلستان سے اتحاد کرنے جارہا تھا تو اس کی طرف سے یہ مطالبہ ہوا کہ عثمانی حکومت اس سے ایک جارحانہ اور مدافعانہ اتحاد کرلے اور اپنی تمام رعایا کو جو یونانی کلیسا کی پیرو ہو کی ماتحتی میں دے دیا جائے، عثمانیوں کے لیے ان مطالبات کو قبول کرنا ممکن نہ تھا، اس درمیان میں یورپ میں پھر جنگ چھڑ گئی، ایک طرف فرانس اور دوسری طرف روس اور انگلستان تھے، دونوں فریقوں نے سلطنت عثمانی کو اپنا حلیف بنانے کی

کوشش کی، نپولین نے آسٹریا اور روس کی فوجوں کو شکست فاش دی تو روس کی طرف سے عثمانیوں کو زیادہ خطرہ نہیں رہا مگر برطانوی بیڑا عثمانیوں کے خلاف متحرک ہو کر قسطنطنیہ سے چند میل کے فاصلہ پر لنگر انداز ہو گیا اور عثمانیوں پر دباؤ ڈالا کہ وہ روس اور انگلستان سے اتحاد کر لے اور اپنا بیڑہ اور درۂ دانیال کے قلعے انگلستان کے حوالے کر دیے جائیں اور مولڈیویا اور والاچیا پر روس کا قبضہ تسلیم کر لیا جائے مگر دولت عثمانیہ اس کے لیے تیار نہیں ہوئی تو انگریزی بیڑہ ذلت کے ساتھ واپس ہو گیا مگر پھر انگریزی فوج مارچ ۱۸۰۷ء میں اسکندریہ پر حملہ آور ہوگئی، وہاں بھی اس فوج کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا، روس نے عثمانیوں کو تخت پر بیٹھنے نہیں دیا اور اپنے سلسلۂ جنگ کو چھوٹی چھوٹی لڑائی سے جاری رکھا۔ (کریسی ج ۲ ص ۳۳۰-۲۹۵، ایور سلے ص ۲۵۴-۲۳۸، تاریخ دولت عثمانیہ ج ۱ ص ۸۲-۴۲۷)

مصطفیٰ رابع کے عہد میں یورپ سے ترکوں کے اخراج کی کوشش: مصطفیٰ رابع کے مختصر زمانہ (۸-۱۸۰۷ء) میں یوروپین طاقتوں کی سازشیں عثمانیوں کے خلاف جاری رہیں، نپولین نے روسیوں کو فریڈلینڈ میں زبردست شکست دی تو پھر روس نے نپولین سے یہ خفیہ معاہدہ کیا کہ ترکوں کو قسطنطنیہ اور رومیلیا کے علاوہ باقی تمام ولایتوں سے نکال دیا جائے اور ان کی سلطنت کو باہم تقسیم کر لیں، اس تقسیم میں قسطنطنیہ کو بھی حاصل کرنے کا اصرار ہوا، لیکن نپولین اس پر راضی نہ ہوا، نپولین عثمانیوں کا حلیف تھا لیکن ذاتی اغراض کی خاطر سلطنت عثمانیہ کو قربان کرنے کے لیے تیار ہو گیا مگر اس پر جلد عمل نہ ہو سکا۔

محمود ثانی سے نپولین کی غداری اور عیسائی حکومتوں کی تخریبی کارروائیاں: محمود ثانی (۳۹-۱۸۰۸ء) کے عہد میں بھی نپولین اور زار الیگزنڈر میں عثمانی سلطنت کو تقسیم کرنے کا مُعاہدہ ہوتا رہا، اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لارڈ ایور سلے لکھتا ہے کہ اس میں شبہ نہیں کہ نپولین اپنے نئے حلیف ترکوں کو چھوڑ دینے اور ان کی سلطنت کے حصے بخرے کرنے کے لیے ان کے قدیم دشمن سے مل جانے پر راضی تھا، تاریخ میں غداری کی اس سے بڑی مثال نہیں مل سکتی۔ (ایور سلے ص ۲۵۳) آسٹریا کو نپولین کے عزائم معلوم ہوئے تو اس نے خوف زدہ ہو کر عثمانی سلطنت اور انگلستان کے درمیان صلح کرانے کی کوشش کی اور ۱۸۰۹ء میں درۂ دانیال

کا صلح نامہ ہو گیا روس کے خلاف ترکوں کو جنگ کا اعلان کرنا پڑا مگر ان کو کامیابی نہیں ہوئی اور ان کے اہم جنگی قلعے روسیوں کے قبضے میں چلے گئے، اس درمیان میں الیگزنڈر اور نپولین کے تعلقات خراب ہو گئے تو روس نے عثمانیوں سے صلح کر لی اور بخارسٹ کے صلح نامہ میں روس نے عثمانیوں کو بہت سے مقامات واپس کر دئے اور دریاے پرتھ دونوں سلطنتوں کے درمیان حد فاصل قرار پایا، سرویا اس سے مطمئن نہ تھا اور وہاں عثمانی سلطنت کے خلاف بغاوت شروع ہو گئی بالآخران کی ملکی، مذہبی اور عدالتی خودمختاری تسلیم کر لی گئی مگر عثمانی سلطنت کے سلطان کی فرماں روائی قائم رکھی گئی۔

اسی زمانہ میں یونان نے عثمانی سلطنت کے خلاف بغاوت کر دی، حالانکہ خود یوروپی مورخوں کا بیان ہے کہ ان کے ساتھ عثمانی فرماں رواؤں کا جتنا اچھا سلوک رہا کسی اور جگہ دیکھنے میں نہیں آیا، عثمانیوں کی عام حکمت عملی یہ تھی کہ وہ جب کوئی علاقہ فتح کرتے تو اس سے صرف خراج وصول کر لینے پر قناعت کر لیتے، وہاں کی زبان، رسم و رواج اور مذہبی معاملات میں کوئی مداخلت نہ کرتے، سرچارلس ایلیٹ لکھتا ہے کہ جنوب مشرقی یورپ پر حکومت ترکوں کی تھی، انیسویں صدی تک اس کے مذہب، تعلیم، تجارت اور مالیات کا انتظام یونانیوں کے ہاتھوں میں تھا (ایسٹرن کویسچن از میریٹ ص ۱۹۸، تاریخ دولت عثمانیہ ج ۲ ص ۱۵) یونان اور اس کے متعلقہ جزائر کی حکومت بھی یونانیوں کے سپرد تھی، ان کا کوئی عہدیدار سال میں ایک مرتبہ عثمانی سلطنت کے پاس خراج ادا کرنے جاتا پھر کوئی وہاں نظر نہیں آتا، انھیں ہتھیار رکھنے کی بھی اجازت تھی، ان کو بحری بیڑے رکھنے کی آزادی حاصل تھی، جس سے ان کی بحری قوت برابر بڑھتی رہی، یونانیوں کو سلطنت عثمانیہ کے ملکی معاملات میں بڑا اقتدار حاصل تھا، قسطنطنیہ کا ایک حصہ فنار کہلاتا تھا، اس میں یونانی کلیسا کا بطریق اور اونچے درجے کے پادری اور اسقف رہا کرتے تھے، وہاں دولت مند یونانی بھی آ کر بس گئے تھے، یہ لوگ کلیسا کے شعبۂ مال کے گماشتے بھی تھے، وہ عثمانی سلطنت کی طرف سے محصول جمع کرتے تھے، بعض یونانی عہدۂ وزارت پر بھی مامور ہوئے، سلطنت عثمانیہ کے غیر ملکی معاملات زیادہ تر ان ہی کے ہاتھوں میں رہے، اٹھارہویں صدی میں مولڈیویا اور ولاچیا کی امارت بھی ان ہی

کے سپرد کردی گئی، جارج فنلے اپنی مشہور کتاب تاریخ یونان میں لکھتا ہے کہ حکومت عثمانیہ کو بعض حیثیتوں سے یورپ میں سب سے زیادہ مستبد حکومت تھی، تاہم دوسرے اعتبار سے سب سے زیادہ متحمل اور روادار بھی تھی، وہ جسم کو قید کرتی تھی لیکن دماغ کو آزاد چھوڑتی تھی، اس کی عیسائی رعایا کے نیچے کے طبقے یورپ کے دوسرے حصوں کے مساوی طبقوں کی بہ نسبت ذہنی حیثیت سے عموماً زیادہ ترقی یافتہ تھے، اٹھارہویں صدی کے آخر کے قریب عثمانی تسلط کا بار اس قدر ہلکا ہوگیا کہ یونانی ایک ترقی کرنے والی قوم بن گئے تھے، یونانیوں کو پوری شخصی آزادی حاصل تھی، معاشرتی مدارج کی ترقی میں یونانیوں کے مقابلہ میں لوگوں کے لیے سیاسی رکاوٹیں عموماً زیادہ تھیں صوبوں کے بہت کم ترک باشندوں کو انتظام حکومت میں کبھی بھی اتنا دخل حاصل ہوا جتنا اہل فنار کو حاصل تھا، دیہاتی علاقوں میں اسلامی آبادی کے مسلمان افسر شاذ ہی لوگوں کو بے انصافی سے بچانے کی اتنی قدرت رکھتے تھے جتنی یونانی جماعتوں کو حاصل تھی، انھیں یونانیوں سے کم حقوق و مراعات حاصل تھے، یونانیوں کی مذہبی آزادی پر آئر لینڈ کے کیتھولک رشک کرتے تھے، یورپ کی کسی قوم پر محصول کا بار اتنا ہلکا نہ تھا جتنا یونانیوں پر تھا اور نہ کسی قوم پر شخصی حیثیت سے اس قدر کم پابندیاں عائد تھیں، یونانی کلیسا کے پاس بڑی دولت تھی اور تمام ترکی میں اس کا سیاسی اقتدار بھی زیادہ تھا، یورپ میں سلطنت عثمانیہ کے محاصل کا بڑا حصہ یونانی ہی وصول کرتے تھے اور بہت سے اضلاع کی میونسپلٹیوں میں ان کو غیر محدود اختیارات حاصل تھے۔ (تاریخ یونان از جارج فنلے ج ۵ ص ۸۹-۲۸۸، ج ۶ ص ۸-۶ و ۱۸، تاریخ دولت عثمانیہ ج ۲ ص ۲۰-۱۹) ایک دوسرا یوروپی مورخ ایلیسن فلپس لکھتا ہے کہ سلطان کی عیسائی رعایا اپنے مذہبی ارکان کے ادا کرنے، دولت جمع کرنے اور تعلیم حاصل کرنے میں بالکل آزاد تھی، عیسائی کلیسا نیز حکومت کے اونچے درجے تک ترقی کرسکتا تھا، ایک عیسائی کسی صوبہ کا گورنر بھی ہوسکتا تھا، عثمانی حکومت میں کسانوں کا درجہ اٹھارہویں صدی میں یورپ کے اکثر حصوں سے کہیں بہتر تھا، زرعی غلامی جو تمام عیسائی یورپ میں تقریباً عالمگیر تھی، ترکی میں مفقود ہوچکی تھی اور ترکی مملکت کے بہت سے حصوں میں کاشتکاروں کو ایسی خوش حالی حاصل تھی کہ اس سے بعض ان قوموں کے

کسان جو زیادہ مہذب سمجھے جاتے تھے، واقف بھی نہ تھے۔ (دی والوف گریک ان ڈی پنڈنس از ایلیسن فلپس ۱۸۹۷ء ایڈیشن، تاریخ دولت عثمانیہ ج ۲ ص ۲۳)

یہ ساری رعایتیں عثمانی سلطنت میں نہ صرف یونان کے عیسائیوں کو حاصل تھیں بلکہ ان تمام علاقوں میں بھی رائج تھیں جہاں جہاں عیسائی آباد تھے مگر یورپ کی بڑی عیسائی حکومتوں کو عثمانی سلطنت سے ازلی دشمنی تھی، اس لیے جہاں اور علاقوں کے عیسائی باشندوں کو اس کے خلاف ابھارا، وہاں یونانیوں کو بھی اس کے خلاف بغاوت کرنے پر آمادہ کیا، روس کے پیٹر اعظم اور ملکہ کیتھرائن دونوں نے یونان کو اپنا آلۂ کار بنانے کی کوشش کی اور اس کو یقین دلایا کہ روس اس کو مکمل آزادی دلادے گا اور جب عثمانی فوجیں یانینا کے والی علی پاشا کی سرکوبی میں مشغول ہوئیں تو یونانیوں نے باغیانہ روش اختیار کی جس کی پوری مدد روسیوں نے کی، فروری ۱۸۲۱ء میں ایک یونانی امیر نے جس کا باپ مولڈیویا اور ولاچیا کا حاکم رہ چکا تھا اور جو اس وقت روسی فوج کا افسر تھا، مولڈیویا میں داخل ہو کر علم بغاوت بلند کیا اور تمام یونانیوں کو سلطنت عثمانیہ کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی دعوت دی، مولڈیویا کے باشندوں نے اس بغاوت کا ساتھ نہیں دیا کیونکہ ان کو یونانیوں اور روسیوں کے مظالم کا تجربہ ہو چکا تھا مگر یونانیوں اور روسیوں نے مولڈیویا میں مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا، ہر طبقہ کے ترکوں تاجروں، سپاہیوں اور جہاز رانوں کو بے دردی سے قتل کر دیا، کلیسا نے اس بغاوت کو مذہبی جنگ قرار دیا اور روس کے نام سے اس بغاوت سے پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی گئی، قسطنطنیہ کے لوگوں پر کفر کا فتوی دیا گیا مگر عثمانی حکومت نے اس بغاوت پر قابو پالیا تو موریا کے یونانی ترکوں کو صفحۂ ہستی سے مٹادینے کے لیے اٹھے اور اپریل ۱۸۲۱ء میں پچیس ہزار ترکوں کو تہ تیغ کر دیا گیا اور جو ترک بھاگ کر قلعہ بند شہروں میں پہونچ گئے تھے ان کے قلعوں کو سر کر کے ان کا سفاکانہ قتل کیا گیا (لارڈ ایورسلے ص ۲۶۲) سلطنت عثمانیہ کو اس کا انتقام لینے کا جذبہ فطری تھا، اسی افراتفری میں یونانیوں نے ایک ایسے جہاز کو گرفتار کر لیا جس میں قسطنطنیہ کے شیخ الاسلام حج کو جارہے تھے، انھوں نے شیخ الاسلام کی نظر کے سامنے ان کے لڑکوں اور خاندان والوں کو ذبح کر کے سمندر میں پھینک دیا، اس کے بعد ترک مسافر قتل کیے

گئے اور آخر میں خود شیخ الاسلام کو سخت اذیتوں کے ساتھ قتل کیا، جارج فنلے لکھتا ہے کہ معذور، مجبور، بوڑھے مرد اور اونچے طبقہ کی عورتیں، خوبصورت لونڈیاں، غلام اور کم سن بچے، جہاز کے عرشہ پر گائے بیل کی طرح ذبح کر دیے گئے، یونانیوں کی یہ سفاکیاں ابھی ختم نہیں ہوئیں، یونانیوں اور ترکوں کا پہلا مقابلہ ٹریپولٹرا کے قریب والٹی پر ہوا تو ترکوں نے ہتھیار ڈال دیے جس کے بعد یونانیوں نے پھر ان کا قتل عام شروع کیا، ان کے تمام مردوں، عورتوں اور بچوں کو قتل کر دیا، ایک یونانی پادری اس موقع پر موجود تھا، اس نے اس کے چشم دید حالات اس طرح لکھے ہیں کہ عورتیں بندوق کی گولیوں اور تیغوں کے زخم سے مجروح ہو کر سمندر کی طرف بھاگتی تھیں تو انھیں عمداً گولیوں سے مارا جاتا تھا مائیں شیر خوار بچوں کو سینے سے لگائے ہوئے اپنی برہنگی کو چھپانے کی غرض سے سمندر میں کود پڑتی تھیں لیکن جب وہ پانی میں چھپنے کی کوشش کرتیں تو یہ سنگدل رائفل بردار انھیں گولیوں کا نشانہ بناتے، شیر خوار بچوں کو ماؤں کے سینوں سے چھین کر چٹانوں سے ٹکراتے اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے، تین چار سال کے بچے زندہ سمندر میں پھینک دیے جاتے تھے (تاریخ یونان، جارج فنلے ج ۶ ص ۲۱۵، تاریخ دولت عثمانیہ ج ۲ ص ۴۳) اس قتل عام سے جو بچ گئے تھے ان کو یونانیوں نے خصوصاً عورتوں اور بچوں کو جمع کیا اور پہاڑ کی ایک گھاٹی میں لے جا کر ایک ایک کو قتل کر ڈالا (ایضاً ص ۲۱۹، تاریخ دولت عثمانیہ ج ۲ ص ۴۳) ۱۸۲۱ء سے ۱۸۲۳ء تک یونانی علاقوں میں بغاوت کی شورش جاری رہی اور زیادہ تر علاقے عثمانیوں سے آزاد ہو گئے، یورپ کی مسیحی حکومتوں نے ان کا ساتھ دیا، ان کی ہمدردی میں دین مسیحی کے نام سے ایک زبردست تحریک بھی چلائی گئی، انگلستان اور فرانس اس تحریک کے حامی ہو گئے، انگلستان کا مشہور شاعر لارڈ بائرن اور اسی طرح فرانس کا شاعر وکٹر ہیوگو بھی اس تحریک کے حامی ہو گئے، لیکن لارڈ بائرن کو جب باغیوں کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا تب اس کو اندازہ ہوا کہ یونانی سردار اپنے نفاق، سازش اور خود غرضی کی خاطر یہ تحریک چلا رہے ہیں، برطانیہ، دولت عثمانیہ سے اچھے تعلقات رکھتا تھا مگر وہ بھی یونانیوں کی پاسداری کرنے لگا مگر ۱۰۲۵ء میں عثمانیوں نے نوارینوں کے مقام پر یونانیوں کو شکست دی، جب یونانیوں نے ہتھیار ڈال دیے تو ان کا خیال تھا کہ ان کے ساتھ وہی

ظالمانہ سلوک کیا جائے گا جوانھوں نے ترکوں کے ساتھ کیا ہے لیکن عثمانی سپہ سالار ابراہیم پاشا نے ان کو فرانسیسی اور آسٹروی جہازوں میں سوار کر کے کلاماٹا روانہ کر دیا، کچھ مسلمان انتقام کی خاطر اکٹھے ہوئے تو ابراہیم پاشا نے ان کو روکا اور یہ یونانی عثمانی پیدل فوج کی سنگینوں کے سایہ میں جہازوں تک پہونچادیے گئے۔ (تاریخ یونان از جارج فنلے ج۶ ص ۳۶۴، تاریخ دولت عثمانیہ ج ۲ ص ۴۹)

اسی کے بعد عثمانیوں نے موریا پر پھر سے قبضہ کرلیا جس کے بعد یونان کی نئی قومی حکومت کو جزیرہ پوروس میں منتقل ہوجانا پڑا مگر یورپ کی مسیحی حکومتوں کی دشمنی جاری رہی اور جب ۱۸۲۵ء میں روس میں الیگزنڈر کا انتقال ہوگیا تو اس کا بھائی نکولس اس کا جانشین ہوا، اس نے ترکوں کو یورپ سے نکال دینا اپنی زندگی کا بڑا مقصد قرار دیا، عثمانی سلطنت پر دباؤ ڈال کر معاہدۂ آق کرمان کرایا، جس میں مولڈیویا اور ولاچیا کو تقریباً پوری خودمختاری دے دی گئی، سرویا کو زیادہ سے زیادہ آزادی دلائی گئی، پھر بھی مسیحی حکومتیں مطمئن نہیں ہوئی اور ۱۸۲۷ء میں روس، انگلستان اور فرانس کا ایک معاہدہ ہوا جس میں یہ طے کیا گیا کہ یونان کو سلطنت عثمانی سے بالکل آزاد کرادیا جائے اور سلطان کی فرماں روائی صرف نام کے لیے باقی رہے، حکومت عثمانی اس کے لیے راضی نہیں ہوئی تو اتحاد ثلاثہ نے ایک جنگی بیڑہ بھیج کر یونانیوں کی مدد کی اور نوارینو کی بحری لڑائی میں عثمانی بیڑہ برباد کردیا گیا، ہزاروں ترک ہلاک ہوگئے، نوارینو کی اس بحری جنگ کے بعد زار نکولس خود لڑائی لڑنے کے لے میدان میں آ گیا، وہ فوج لے کر مولڈیویا میں داخل ہوگیا اور ایک روسی بیڑہ درۂ دانیال کی طرف بھیجا پھر اس کی کچھ فوجیں عثمانیوں کے ایشیائی صوبوں میں بھی داخل ہوگئیں، بحر یونان میں اس کا بیڑہ پہلے سے موجود تھا، روسیوں کو مولڈیویا اور ولاچیا میں کامیابی ہوئی پھر انھوں نے عثمانیوں کے اور جنگی قلعے بھی فتح کرلیے، ایشیاے کوچک میں بھی ان کی کامیابی ہوئی، بالآخر عثمانیوں نے روس سے صلح کرنے میں پیش قدمی کی اور اورنہ میں ایک صلح نامہ ہوا، جس میں یہ طے پایا کہ جن عثمانی علاقوں پر روس نے قبضہ کرلیا ہے وہ واپس کردیے جائیں لیکن دولت عثمانیہ پچاس لاکھ پونڈ تاوانِ جنگ ادا کرے اور جب تک یہ تاوان ادا نہ ہو روس ان علاقوں پر قابض

رہے، یونان ایک خود مختار مملکت قرار پایا، البانیہ کے صوبے دولت عثمانیہ کے سرحدی صوبے بنائے گئے، جزائر آیونین پر برطانیہ کا قبضہ تسلیم کیا گیا، کریٹ اور تھریس کے ایشیا ساحل پر عثمانیوں کی فرماں روا رہی، اس لوٹ میں فرانس شریک نہ تھا لیکن اس صلح نامہ کے دوسرے ہی مہینہ جولا ۱۸۳۰ء میں اس نے الجزائر پر قبضہ کرلیا جو عثمانیوں کی فرماں روا تسلیم کرتا تھا اور جب سلطنت عثمانی اور مصر کے محمد علی پاشا سے اختلاف ہوا اور لڑا کی نوبت آگئی تو روس نے عثمانیوں کو مدد دینے کے بہانے اپنا جنگی بیڑہ باسفورس کے ذریعہ قسطنطنیہ کے قریب بھیج دیا، انگلستان اور فرانس کو تشویش ہو کہ کہیں قسطنطنیہ پر روسیوں کا تسلط نہ ہو جائے، اس لیے ان دونوں نے دباؤ ڈال کر محمد علی اور عثمانی سلطنت سے صلح کرادی، جس کی رو سے بیت المقدس، طرابلس، حلب، دمشق اور اطنہ کی حکومتیں محمد علی کو مل گئیں، یہ عثمانی سلطنت کے لیے اچھا نہ ہوا اور مسیحی حکومتیں خوش تھیں کہ یہ اور کمزور ہوگئی اور یہ اور بھی کمزور ہوتی گئی، جب مصر کے محمد علی نے اپنے اور مطالبات منوانے کے لیے اپنی جنگ جاری رکھی، اسی میں عیسائی حکومتوں کا مفاد بھی تھا اس لیے وہ اس کو ہوا دیتی رہیں مگر وہ مصر کے محمد علی کے بڑھتے ہوئے اثرات کو بھی دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ (ایڈورڈ کریسی ج ۲ص ۲۰-۲۱۴، ایور سلے ص ۲۵۶-۲۵۵)

فرانسیسی مصنف ولاثون کنیر کے بیان کے مطابق محمود ثانی کو اپنے عیسائی باشندوں کا بڑا خیال رہتا، وہ دورہ کرتا تو ان سے ملتا، ان کے مطالبات کو پورا کرتا، ان کی شکایتیں سنتا، ان کی دادرسی کرتا، ان کے شکووں کو دور کرتا اور ان کو مطمئن کر کے خوش ہوتا کہ اس کی تمام رعایا میں قوم وملت کے امتیاز کے بغیر انصاف کی حکمرانی ہو رہی تھی۔ (ولاثون کنیر اردو ترجمہ ص ۴۶۲، تاریخ دولت عثمانیہ ج ۲ص ۷۸)

ایڈورڈ کریسی دولت عثمانیہ کے حکمرانوں کی اچھی تصویر نہیں کھینچتا مگر محمود ثانی نے اپنی مملکت میں جتنی اصلاحات کیں ان کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے اور لکھتا ہے کہ سلطان نے ان اصلاحات کے دستاویزات پر لکھا کہ کوئی اس سے ناواقف نہ رہے کہ میرا یہ فرض ہے کہ میں اپنی تمام رعایا کو تکلیف دہ باتوں سے دور رکھنے میں ان کی مدد کروں اور میری یہ

مسلسل کوشش ہے کہ ان کی مصیبتوں کے بار کو ہلکا کروں، ان میں اضافہ نہ کروں اور ان کو امن وامان کا یقین دلاؤں، ان پر مظالم کے قوانین، اللہ تعالیٰ کے حکم اور میری حکمرانی کی فلاح کے خلاف ہے۔ (ج ۲ص ۴۵۰)

سلطان عبدالمجید خان کی حکومت: یہ سلطان سولہ سال کی عمر میں فرماں روا ہوا، اس کی مدت حکومت ۱۸۳۹ء سے ۱۸۶۱ء تک رہی، انگلستان، فرانس، روس، آسٹریا اور پروشیا مصر کے محمد علی کی بڑھتی ہوئی قوت کو اپنے مصالح کے خلاف سمجھتے تھے، اس لیے ان کی حمایت اور انگریزوں کے بحری بیڑے کی مدد سے محمد علی سے پورا شام خالی کرالیا، جس کے بعد ایک صلح کے ذریعہ سے یہ طے پایا کہ صرف مصر کی پاشائی محمد علی اور اس کے ورثہ کے لیے مستقل کردی جائے، بقیہ تمام علاقے اس کے قبضہ سے نکال لیے جائیں اس کے بعد بارہ سال تک دولت عثمانیہ کو کسی غیر ملکی طاقت سے جنگ نہیں کرنی پڑی، اس مدت میں یہاں بہت سی اصلاحات کی گئیں، سلطان عبدالمجید خان کے باپ سلطان محمود نے ایک دستور اپنی زندگی میں بنایا تھا اس کا اعلان اپنی حکومت کے زمانے میں کیا، یہ تاریخ میں ''خط شریف گل خانہ'' کے نام سے مشہور ہے، اس میں جہاں قرآن اور سنت کی پابندی کا لحاظ رکھا گیا ہے وہاں عیسائیوں کو زیادہ سے زیادہ مراعات دیے گئے اور اس خط شریف کے مطابق سلطان عبدالمجید نے اپنا دستور بنایا، جس میں عیسائیوں کے لیے ضابطے بنائے گئے جن کے علاحدہ علاحدہ ٹکڑوں کو اس طرح جمع کیا جاسکتا ہے۔

تمام رعایا کی جان ومال اور عزت وآبرو کی ضمانت جو خط شریف گل خانہ میں کی گئی ہے اس کی توثیق کی جاتی ہے، اس باب میں رعایا کے مراتب و مذاہب میں کسی قسم کا امتیاز جائز نہ ہوگا، ان تمام حقوق و مراعات کی از سر نو تصدیق کی جاتی ہے جو نصاریٰ اور سلطنت کے دوسرے فرقوں کو دیے گئے ہیں، ان حقوق و مراعات پر بلا تاخیر نظر ثانی کر کے زمانہ اور سوسائٹی کی ضروریات کے مطابق انھیں ترقی دی جائے گی اور اس غرض سے بطریق کے زیر صدارت ایک مجلس منعقد کی جائے گی جو مذکورہ بالا اصلاحات پر بحث کر کے اپنی رائے حکومت میں پیش کرے گی، سلطان محمد فاتح اور اس کے جانشینوں نے جو حقوق بطریق کو

عطا کیے تھے ان میں جدید حق کا اضافہ کیا جائے گا اور آیندہ بطریق کا انتخاب تمام عمر کے لیے ہوا کرے گا، نصاریٰ اور دوسرے فرقوں کے بطریقوں، اسقفوں اور مذہبی عہدہ داروں کو باب عالی کے تجویز کردہ طریقے کے مطابق وفاداری کا حلف لینا پڑے گا، وہ تمام محصول اور چندے جو مختلف فرقوں کے پادری اپنی جماعتوں سے وصول کیا کرتے ہیں ممنوع قرار دیے جاتے ہیں، مقررہ تنخواہیں بطریقوں، اسقفوں اور تمام چھوٹے بڑے مذہبی عہدہ داروں کو ان کے مراتب اور خدمات کے لحاظ سے دی جائیں گی، پادریوں کی منقولہ یا غیر منقولہ جائداد سے کوئی تعرض نہ کیا جائے گا، موجودہ کلیساؤں، مدرسوں، ہسپتالوں اور قبرستانوں کو برقرار رکھنے کی عام اجازت ہے، اگر کسی جدید کلیسا، مدرسہ، قبرستان یا اسپتال کے تعمیر کرنے کی ضرورت ہوگی اور بطریق یا اس فرقہ کا مذہبی پیشوا اسے منظور کرے گا تو ہر جدید تعمیر کا نقشہ باب عالی میں پیش کیا جائے گا، اگر کوئی وجہ مانع نہ ہوگی تو سلطان نقشہ کو ملاحظہ کر کے تعمیر کی منظوری خود صادر فرمائے گا، ہر فرقہ کو اپنے مذہبی فرایض کی ادائیگی کی پوری آزادی حاصل ہوگی، وہ تمام القاب وامتیازات جن سے رعایا کے بعض طبقے اعلیٰ اور بعض ادنیٰ شمار ہوتے ہیں، ہمیشہ کے لیے شاہی دفتر سے خارج کیے جاتے ہیں، اسی طرح عہدیداروں اور عام لوگوں کو بھی دل آزار اور اہانت آمیز کلمات کے استعمال سے سختی سے روکا جاتا ہے، اس حکم کی خلاف ورزی کرنے والے سزا کے مستوجب ہوں گے، چونکہ تمام مذاہب کو آزادی حاصل ہے، اس لیے کوئی شخص اپنے مذہب کی وجہ سے ستایا نہ جائے گا اور نہ کسی کو اپنا مذہب تبدیل کرنے پر مجبور کیا جائے گا ملکی اور فوجی عہدے تمام رعایا کے لیے یکساں طور پر کھلے رہیں گے، تقرر صرف قواعد وضوابط کے مطابق اور قابلیت کی بنا پر ہوگا، ہر فرقہ کو علوم وفنون کے مدارس قائم کرنے کی اجازت ہے، البتہ نصاب تعلیم اور اساتذہ کا انتخاب ایک مخلوط مجلس کے زیر نگرانی ہوگا جو باب عالی کی طرف سے مقرر کی جائے گی، وہ تمام مقدمات جن کا تعلق تجارت یا فوجداری سے ہوگا اور جن میں فریقین مختلف فرقوں کے ہوں گے مخلوط عدالتوں ہی میں پیش کیے جائیں گے اور ان کا اجلاس برسرعام ہوا کرے گا، صوبوں کے دیوانی کے مقدمات بھی مخلوط عدالتوں میں وکیل اور قاضی کی موجودگی میں پیش ہوں گے، ان عدالتوں کا

اجلاس بھی بر سر عام ہوگا، جن مقدمات میں فریقین ایک ہی فرقہ کے ہوں گے یا جو مقدمات وراثت سے متعلق ہوں گے وہ فریقین کی خواہش کے مطابق یا ان کے بطریق کے سامنے پیش ہوں گے یا ان کی قومی مجلس کے مسلمانوں کے علاوہ دوسرے فرقوں کو بھی فوج میں بھرتی کرنے کے ضوابط مرتب کر کے جلد شایع کر دیے جائیں گے، عیسائی اور دوسرے فرقوں کی نگرانی کے لیے ایک افسر مقرر ہوگا جو اپنے مشوروں سے اسٹیٹ کونسل کو مدد دے گا، یہ افسر صدر اعظم کی مجلس وزراء میں سے منتخب کیے جائیں گے اور ان کا تقرر ایک سال کے لیے ہوا کرے گا۔ (ایڈورڈ کریسی ج ۲ص ۶۰-۴۵۷، ایور سلے ص ۳۱۵-۲۸۷، تاریخ دولت عثمانیہ ج ۲ص ۹۱-۸۱)

یہ وہی حقوق ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے زمانے میں عیسائیوں اور غیر مسلموں کو دیے گئے تھے، جن کا ذکر ہم اس کتاب کے آغاز میں کر چکے ہیں، اسی کی پابندی ہر اسلامی حکومت میں کی گئی، دولت عثمانیہ کا ہر فرماں روا اسی کا پابند رہا، جیسا کہ گذشتہ اوراق سے ظاہر ہوگا، دولت عثمانیہ پر یوروپی مورخوں نے جو کچھ لکھا ہے ان میں سے کسی نے عیسائیوں اور غیر مسلموں کے ساتھ ان کی سفاکی اور ظلم کا ذکر نہیں کیا ہے بلکہ ان کی رواداری کا ذکر بار بار کیا ہے، اس کے برخلاف عیسائی فاتحوں اور سپاہیوں کی ظالمانہ حرکتوں کا ذکر کرتے ہیں تو کہیں کہیں وہ رو پڑتے ہیں لیکن مسلمان حکمراں اپنی رواداری اور فراخ دلی میں چاہے جیسی اچھی حکومت کرتے رہے ہوں ان کے معاصر حکمراں اور خصوصاً کلیسا کے پادری ان پر طرح طرح کے الزامات رکھ کر عیسائیوں میں ان کے خلاف نفرت پیدا کرتے رہے اور اس نفرت کو مقدس مذہبی جنگ میں تبدیل کرنے میں کامیاب ہوتے گئے پھر عیسائی حکومتیں ان کے خلاف جو سازشیں یا تخریبی کارروائیاں کرنے میں شریفانہ اخلاق کو جس طرح بالائے طاق رکھتی رہیں، اس کو تدبر، سیاست اور حکمت عملی قرار دے کر اپنی سیاسی فہم اور بصیرت پر ناز کرتے رہے، ان کے نزدیک جنگ کرنے یا کرانے میں ضابطۂ اخلاق کا پابند ہونا اہل سیاست اور ارباب تدبر کا شیوہ نہیں ہوتا بلکہ فضا میں منڈلاتے ہوئے گدھوں کے وطیرہ کو اپنانے میں کامیاب حکمت عملی قرار دیتے رہے، اس قسم کا سیاسی اخلاق مسلمان

حکمرانوں کے یہاں نہیں رہا اسی لیے وہ چالاک اور فریب کار حریفوں سے مات کھاتے گئے۔

سلطان عبدالمجید خان کے زمانہ میں دولت عثمانیہ نے بڑی ترقی کی، اس کو بارہ برس تک مسیحی حکومتوں سے جنگ نہ کرنی پڑی تو اس نے اپنے یہاں کی روادارانہ حکومت کی وجہ سے اچھے اچھے اصلاحات کر کے اپنی سلطنت کے لوگوں کو بھی مطمئن کیا اور بیرونی اور بین الاقوامی اقتدار بھی بڑھایا، روس کی نگاہوں میں یہ بات کھٹکتی رہی لیکن سلطان نے اس کو لڑائی لڑنے کا موقع نہیں دیا مگر جب ہنگری نے اپنے یہاں آزادی کا مطالبہ کیا تو گو روس اور آسٹریا عثمانی علاقوں کی آزادی کے لیے کوشاں تھے مگر ہنگری کی آزادی کی تحریک کو دونوں نے مل کر کچل کر رکھ دیا اور جب ہنگری کے فوجی سردار نے ترکی میں پناہ لی تو دونوں نے عثمانیوں سے جنگ کرنے کی دھمکی دی مگر عثمانی سلطنت نے اپنے شریفانہ اخلاق کی وجہ سے ان پناہ گزینوں کو ان کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا، روس اور آسٹریا عثمانی سلطنت کے خلاف لڑائی کی تیاری کرنے والی ہی تھے کہ انگلستان نے دولت عثمانیہ کی حمایت کرنے کا اعلان کیا تو دونوں جنگ نہ کر سکے، روس نے پھر انگلستان سے مل کر یہ سازش کی کہ دونوں مل کر جلد از جلد سلطنت عثمانیہ پر حملہ کر دیں اور اسے آپس میں بانٹ لیں اور انگستان کو یہ سمجھایا کہ سلطنت عثمانی کی حیثیت جلد دم توڑنے والے مرد بیمار کی ہے، انگلستان سردست اس کے لیے تیار نہیں ہوا مگر روس میں نکولس جنگ کی تیاری میں مشغول رہا اور جب اس زمانہ میں فلسطین کے مقامات مقدسہ کا سوال اٹھا تو روس نے مطالبہ کیا کہ سلطنت عثمانیہ اپنے تمام عیسائی فرقوں کا محافظ روس کو قبول کرلے حالانکہ عیسائیوں کو ہر قسم کی آزادی اور رعایتیں حاصل تھیں، وہ محصول ادا کیے بغیر بیت المقدس اور دوسرے مقامات مقدسہ کی زیارت کر سکتے تھے، وہ قسطنطنیہ کے ایک خاص حصے میں نئے گرجے بھی تعمیر کر سکتے تھے اور اگر ان کو کچھ شکایتیں ہوئیں تو روس کلیسائے یونان کی طرف سے حکومت عثمانیہ کو معروضات بھی پیش کر سکتا تھا، ہر حال میں سلطنت عثمانیہ ہی ان کی محافظ ہوتی مگر روس کا جارحانہ مطالبہ یہ تھا کہ عیسائیوں کا محافظ اس کو تسلیم کیا جائے، اس کا مقصد صرف چھیڑ چھاڑ اور مداخلت کا بہانہ حاصل کرنا تھا، دولت عثمانیہ کے انکار پر روس نے جنگ چھیڑ دی، روسی فوجیں دریائے ڈینوب

کو عبور کر کے مولڈیویا اور ولاچیا پر قابض ہو گئیں، سائی ٹیٹ کے مقام پر ترکوں سے شکست کھا گئیں، انگلستان اور فرانس کو روس کی توسیع پسندی گوارا نہ تھی، اس لیے وہ دونوں عثمانی سلطنت کے طرفدار ہو گئے، آسٹریا بھی روسی عزائم سے خوف زدہ ہوا پھر تو ترکوں سے روسیوں کو پے در پے شکستیں ہوئیں، ایشیا کی طرف بھی روسی فوجیں بڑھ گئی تھیں، شروع میں ان کو کامیابی حاصل ہوئی لیکن پھر ترکوں سے شکست کھانے لگیں، اسی درمیان میں زار نکولس کا انتقال ۱۸۵۵ء میں ہو گیا، وہ اپنی زندگی میں دولت عثمانیہ کو ختم کرنے کے ارادہ میں کامیاب نہیں ہوا، اس کا لڑکا الیگزنڈر ثانی اس کا جانشین ہوا تو اس کی بھی یہی پالیسی رہی مگر روسیوں کی پے در پے شکستوں کے بعد اس کو صلح کرنی پڑی جو صلح نامہ پیرس کے نام سے مشہور ہوا، اس کی رو سے وہ تمام علاقے جو دوران جنگ میں فریقین نے فتح کر لیے تھے واپس کر دئے گئے، سلطان سے بلا امتیاز نسل و مذہب رعایا کی اصلاح حال کا وعدہ لیا گیا اور یوروپی حکومتوں نے بھی یقین دلایا کہ وہ سلطنت عثمانیہ کے اندرونی معاملات میں دخل نہ دیں گی، بحر اسود تمام قوموں کے تجارتی جہازوں کے لیے کھول دیا گیا، جنوبی بسرابیا مولڈیویا میں شامل کر دیا گیا، مولڈیویا اور ولاچیا پر عثمانی سلطنت کی فرماں روائی بدستور قائم رہی، برطانیہ، آسٹریا اور فرانس نے دولت عثمانیہ کی آزادی اور سالمیت کو قائم رکھنے کی ضمانت بھی لی، اس صلح نامہ سے روس کی ساری امیدوں پر پانی پھر گیا، سلطنت عثمانیہ کی تقسیم اور قسطنطنیہ پر قبضہ کرنے کا اس کا خواب پورا نہ ہو سکا۔

روس کو یہ کیسے گوارا ہو سکتا تھا، اس نے آگے چل کر اس صلح نامہ کو نظر انداز کر دیا، مگر جن حکومتوں نے عثمانیہ سلطنت میں مداخلت نہ کرنے کی ضمانت دی تھی وہی اندر اندر کریٹ سرویا، مونٹی نگرو، بوسنیا، ہرزیگووینا، بلغاریہ اور پھر ایشیا میں جدہ اور لبنان میں عثمانی سلطنت کے خلاف شورش برپا کرنے کی کوشش کرتی رہیں، جدہ میں عیسائیوں اور مسلمانوں میں جھگڑا ہوا تو اس میں انگریز قونصل کی بیوی ماری گئی، برطانوی حکومت نے غصہ میں اپنا بیڑہ بھیج کر اس پر گولہ باری کرائی، لبنان میں مسلمان دروزیوں اور کیتھولک مارونیوں کے دو فرقوں میں جھگڑا شروع ہوا تو پادریوں کے بھڑکانے سے اس شورش نے مذہبی جنگ اختیار کر لی اور

نہایت تیزی سے شام کے اکثر حصوں میں پھیل گئی، مارونیوں نے قتل و غارت کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا اور جب دروزی مسلمان ان پر غالب آئے تو انھوں نے انتقامی غصہ میں تمام عیسائیوں خصوصاً دمشق کے عیسائیوں کو قتل کر کے اس خطہ کو ان سے پاک کر دینا چاہا مگر ان عیسائیوں کے لیے امیر عبدالقادر الجزائری فرشتۂ رحمت بن گیا، یہ امیر وہی تھا جس نے الجزائر میں فرانسیسیوں کے خلاف سترہ برس تک جنگ کی، وہ فرانسیسیوں کے اس غاصبانہ قبضہ کو پسند نہ کرتا تھا، اپنے وطن کی آزادی کے لیے برابر لڑتا رہا، جب وہ پسپا ہوا تو فرانسیسیوں نے اس کو قید میں ڈال دیا، جہاں وہ بارہ برس تک رہا جب وہ آزاد کیا گیا تو آخر میں دمشق میں آ کر آباد ہو گیا جب دمشق کے مسلمانوں نے عیسائیوں کا قتل عام کرنا چاہا تو امیر عبدالقادر نے کسی پس وپیش کے بغیر اپنے کو اس آگ کے شعلہ میں ڈال دیا اور ایک چھوٹی سی فوج کے ساتھ اس نے عیسائیوں کو عوام الناس سے چھڑایا، اپنے محل میں لا کر ان کو پناہ دی اور عرب سواروں کی پہرہ بندی کر دی، وہ فرانس کا قدیم دشمن تھا مگر ایک سے زیادہ مرتبہ اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر خونخوار ٹولیوں کو پسپا کیا، ان پناہ گزینوں کے لیے بے دریغ روپے خرچ کیے اور پھر عیسائی محافظین کی نگرانی میں ان کو بیروت پہونچایا جہاں ان کو کسی قسم کا خطرہ نہ تھا، فرانسیسی مورخ ولاژون کنیر اس کے اس کارنامہ پر لکھتا ہے کہ اس کی یہ شرافت اور اس کی یہ شریفانہ بہادری ایک لمحہ کے لیے بھی کم نہ ہوئی، اس کی زندگی کا یہ صفحہ ایسا شاندار ہے جس کے آگے ایک صدی کا کارنامہ بھی مدھم پڑ جاتا ہے۔ (تاریخ دولت عثمانیہ از ولاژون کنیر اردو ترجمہ ج ۱ ص ۵۰۶، تاریخ دولت عثمانیہ ج ۲ ص ۱۰۷-۱۰۶)

شام میں جو کچھ ہو رہا تھا اس سے یورپ کی مسیحی حکومتوں نے فائدہ اٹھانا چاہا فرانس کیتھولک فرقہ کا حامی بن گیا لیکن انگلستان کو فکر دامن گیر ہوئی کہ کہیں فرانس کا قبضہ شام پر نہ ہو جائے، اس لیے ۱۸۶۰ء میں یہ طے کیا گیا کہ یورپ کی ایک متحدہ فوج وہاں امن قائم کرنے کے لیے بھیجی جائے مگر اس سے پہلے عثمانی سلطنت کی فوج وہاں پہونچ گئی اور دروزیوں اور مارونیوں کی لڑائی کو ختم کرایا۔

یہ بات لکھنے کے لائق ہے کہ جن عثمانی سپاہیوں نے وہاں کے باشندوں کے

ساتھ ظلم کیا تھا ان میں سے ایک سو گیارہ سپاہیوں کو گولی ماردی گئی، ستاون بڑے بڑے دروزی پھانسی پر لٹکائے گئے، مسلمان والیٔ دمشق کو سزاے موت دی گئی، سیکڑوں دروزی جلاوطن کردیے گئے اور پھر مسلمان حاکم بیروت کو معزول کردیا گیا اور عیسائیوں کے نقصانات کی تلافی کے لیے سات کرور پچاس لاکھ قرش کی رقم بالاقساط ادا کی گئی" ظلم کے خلاف یہ عدل پروری مسلمانوں کے ساتھ مسیحی حکومتوں نے کبھی نہیں دکھائی۔ (تاریخ دولت عثمانیہ ج ۲ص ۱۰۷)

لارڈ ایورسلے نے سلطان عبدالمجید کی برائیوں کا ذکر کرنے کے باوجود یہ لکھا ہے کہ اس میں جبلی طور پر بہت سی قوتیں اور خوبیاں تھیں اور وہ دولت عثمانیہ کے تمام حکمرانوں میں سب سے زیادہ انسان دوست تھا۔ (ٹرکش امپائر ص ۳۱۳)

سلطان عبدالعزیز: سلطان عبدالعزیز (۷۶-۱۸۶۱ء) کی حکومت کی کمزوریوں سے یوروپی حکومتیں فوراً فائدہ اٹھالیتیں، ۱۸۶۷ء میں ولاچیا اور مولڈیویا نے متحد ہوکر رومانیا کے نام سے ایک علاقہ بنالیا اور ایک جرمن شہزادہ چارلس کو اس کا فرماں روا بنادیا، یورپ کی حکومتوں نے عثمانی سلطنت پر دباؤ ڈالا کہ رومانیا کی آزادی کو قبول کرلے، ان علاقوں پر سلطان کی فرماں روائی نام کو رہ گئی تھی، اس کے بعد رومانیا بالکل آزاد ہوگیا، اسی طرح یورپ کی حکومتوں کی سرپستی میں سرویا نے بھی دولت عثمانیہ سے آزادی حاصل کرلی، یونانیوں نے کریٹ میں بغاوت کرادی اور جب عثمانی فوجیں اس کو کچلنے والی تھیں تو یورپ کی حکومتیں پھر بیچ میں حائل ہوگئیں اور اس پر سمجھوتہ کرلیا کہ کریٹ کو حکومت خوداختیاری پوری نہ سہی کچھ ضرور دی جائے۔ (ایورسلے ص ۱۵-۳۱۴، تاریخ دولت عثمانیہ ج ۲، ص ۱۱۵-۱۱۴)

برطانوی سامراجیت کا عروج: اس وقت تک انگریزوں نے ہندوستان کی مغلیہ حکومت کو ختم کرکے پورے ہندوستان کو اپنے زیرنگیں کرلیا تھا اور اس کے سہارے برٹش حکومت برٹش امپائر بن گیا، وہ اپنی توسیع پسندی سے امریکہ، کنیڈا، آسٹریلیا کا مالک بنا رہا گو امریکہ اس کے اقتدار سے باہر نکل گیا تھا لیکن ہندوستان پر اس کے تسلط سے اس کی قوت یورپ میں بھی بڑھ گئی تھی، وہ اپنے امپائر کے مقابلہ میں کسی اور امپائر کے عروج اور اقتدار کو پسند

نہیں کرسکتا تھا، رومن امپائر کے خاتمہ کے بعد ٹرکش امپائر ہی برسر اقتدار رہا، اس کی حکومت تین براعظموں اور دو بحروں تک پھیل گئی تھی، وہ اسلام کے پیرو تھے، مسیحی حکومتیں مسلمانوں کا یہ عروج کیسے گوارا کرسکتی تھیں، یورپ کی ہر مسیحی حکومت کی یہ کوشش رہی کہ یورپ میں مسلمانوں کا قدم نہ جمنے پائے، پہلے سسلی سے ان کو دربدر کیا، پھر آٹھ سو برس کی مسلسل لڑائیوں کے بعد اندلس کو مسلمانوں سے خالی کرایا، یورپ میں دولت عثمانیہ کی حکومت کیسے گوارا کرسکتی تھی، ولندیزیوں نے انڈونیشیا میں جا کر اپنی حکومت قائم کرلی، فرانسیسیوں نے الجزائر پر قبضہ کرلیا پھر شام کو بھی ہضم کرنے کی کوشش کی، پرتگالیوں نے ایشیا اور افریقہ کے مختلف مقامات پر اپنی سامراجیت کا پرچم لہرایا، انگلستان نے ہندوستان کے علاوہ ایشیا کے اور افریقہ کے مختلف ملکوں کو اپنا زیرنگیں بنالیا، خود روس وسط ایشیا پر اب تک قابض ہے، یہ سب کچھ یورپ کے سیاسی فلسفہ کی رو سے جائز ہے مگر یورپ میں مسلمانوں کی حکومت کسی سیاسی اخلاق اور سیاسی فلسفہ سے ان کے نزدیک جائز نہیں بلکہ یہ مسلمانون کا جرم ہے، اس لیے عثمانیوں کو ختم کرنے کے لیے بڑی بڑی لڑائیاں لڑی گئیں، ان کے علاقوں میں بغاوتیں کرائی گئیں، شورشیں برپا کی گئیں اور یورپ اس تدبر اور سیاست دانی پر نازاں رہا مگر دوسروں کی عدم رواداری اور سیاسی سفاکی کا ڈھنڈورا پیٹنے میں بھی آگے آگے رہا، گو یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ یورپ کی مسیحی حکومتوں میں کون زیادہ بدعہد، بے وفا، عدم روادار، ظالم اور سفاک ہے، اس کا تجربہ نہ صرف دولت عثمانیہ سے ان کے تعلقات اور لڑائیوں سے ہوتا ہے بلکہ ہر جگہ ان کی سیاست میں یہی چیزیں کارفرما ہیں، البتہ دولت عثمانیہ ان کی زیادہ نخچیر رہی، گو وہ اس لحاظ سے بھی قابل تعریف ہے، کہ وہ ان سے بچھڑتی رہی لیکن ان کو پچھاڑتی بھی رہی، اگر اس کے یہاں اندرونی انتشار اور خلفشار نہ رہتا تو شاید اپنے چال باز حریفوں کو برابر مغلوب کرتی رہتی۔

روس کی سامراجیت: روس آج کل انسانی مساوات اور اخوت کا بہت بڑا علمبردار بنا ہوا ہے لیکن اس کی پوری تاریخ عیاری، بے وفائی اور غداری سے بھری ہوئی ہے، اس کی حکمرانی کا سب سے بڑا مقصد دولت عثمانی کا یورپ سے اخراج تھا، ان کے اخراج سے زیادہ ان کی مملکتوں پر غاصبانہ قبضہ پیش نظر تھا، اس لیے معاہدہ کرکے اس کو نظر انداز کردینا اس کے لیے

کوئی سیاسی جرم نہ تھا، چنانچہ ۱۸۷۰ء میں اس نے پیرس کے صلح نامہ کو ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا اور بحر اسود میں اپنا جنگی بیڑہ عثمانیوں کے خلاف بھیج دیا، اس وقت جرمنی میں بسمارک کا طوطی بول رہا تھا اور انگلستان میں گلیڈ اسٹون کے تدبر کی دھوم تھی، دونوں نے اپنی خاموشی سے روس کے اس یلغار کا ساتھ دیا۔ (ایور سلے ص ۳۱۴)

بلغاریہ پہلے یونانی کلیسا کے ماتحت تھا لیکن اب وہ اپنے قومی کلیسا کے خواہاں ہوئے، عثمانی حکومت اور روس دونوں یونانیوں سے بدظن تھے، اس لیے روس نے عثمانی سلطنت پر دباؤ ڈال کر بلغاریہ کے قومی کلیسا کو تسلیم کر لیا مگر اس طرح بلقان میں ایک جدید قومیت کی بنیاد پڑ گئی، جو عثمانیوں کے لیے مضر ثابت ہوئی مگر روس سے کچھ نہ کچھ جنگ ہوتی رہی، پلونا کی لڑائی میں روسیوں کو ترکوں سے شکست ہوئی تو عثمانی سلطنت کی دھاک پھر پوری دنیا میں جم گئی پھر بھی روس عثمانی سلطنت کا دوست بن کر اس کے خلاف سازش کرتا رہا، اب اس کی یہ چال ہوئی کہ پان سلاوزم کا نعرہ دے کر تمام سلانی قوموں کو روس کے زیر سیادت منظم کر کے دولت عثمانیہ کے خلاف ابھارا جائے۔ (ایور سلے، ص ۳۱۵)

بلقان میں بغاوت کرانے کی کوشش: سرویا، بوسنیا، ہرزیگووینا اور مونٹی نگرو وغیرہ سلانی تھے، اس طرح روس سے نسلی اور دینی تعلقات بھی رکھتے تھے، سلانی تحریک کو روسی لٹریچر، پروپیگنڈا اور مختلف انجمنوں کے ذریعہ سے بڑا مستحکم بنایا گیا، اس کے خلاف عثمانیوں کی کوئی تحریک چلی تو روسیوں نے اپنے دجل وفریب سے کام لے کر اس کو چلنے نہ دیا اور سلانی انجمنیں بلقان کے عیسائیوں کو برابر بھڑکاتی رہیں اور جب ان میں بغاوتیں ہونے لگیں تو یورپ کی حکومتیں امن قائم کرنے کے بہانے آگے بڑھیں، روس، آسٹریا اور جرمنی کے فرماں رواؤں نے باہمی مشورہ کر کے آسٹریا کے چانسلر کے ذریعہ حکومت عثمانیہ کو ایک نوٹ بھجوایا جو اندراسی نوٹ کے نام سے مشہور ہوا، اس میں عثمانی سلطنت پر زور دیا گیا کہ بوسنیا اور ہرزیگووینا کے باشندوں کو پوری مذہبی آزادی دی جائے اور مسلم اور غیر مسلم رعایا کے ساتھ یکساں سلوک کیا جائے، یہ تو پہلے ہی سے ان کو حاصل تھا مگر یہ شرط اس لیے رکھی گئی تاکہ ظاہر ہو کہ عثمانی سلطنت یہ تفریق کرتی ہے اور یہ بھی شرط رکھی گئی کہ ان علاقوں کے

باشندوں سے جو ٹیکس لیے جائیں وہ ان ہی کے لیے صرف کیے جائیں وغیرہ، عثمانی سلطنت نے یہ سب کچھ تھوڑی ترمیمات کے ساتھ منظور کرلیا لیکن اس پر بھی بغاوت فرو نہیں ہوئی اور یورپ کی حکومتیں اس کو ہوا دیتی رہیں، اسی زمانہ میں ایک بلغاری لڑکی نے اسلام قبول کرلیا، وہ ایک مسلمان سے شادی کرنا چاہتی تھی تو بلغاریہ کے عیسائیوں نے وہاں کے مسلمانوں کے خلاف بڑا ہنگامہ کیا، جس میں اتفاقاً جرمنی اور فرانس کے قونصل مارے گئے، عثمانی حکومت نے قاتلوں کو پھانسی کی سزا دی اور بہتوں کو قید کی سزائیں دی گئیں مگر یورپ کے عیسائیوں کا جوش انتقام ٹھنڈا نہ ہوا اور انھوں نے یہ تجویزیں پیش کیں کہ ترکوں کے خلاف صلیبی اتحاد قائم کیا جائے، بلغاریہ میں بغاوت جاری تھی وہاں کے مسلمان قتل کیے جانے لگے، ان کے مکانات میں آگ لگائی گئی، ایک پادری لوگوں کو حکومت کے خلاف بغاوت پر مجبور کرنے کی غرض سے ہاتھ میں چاقوں لے کر ادھر ادھر دوڑتا پھرتا اور ان کو بشارت دیتا کہ اب ان کی آزادی قریب ہے، بلغاریوں نے ایک ترک لڑکے کی دونوں بانہوں کی کھال کہنی تک کھینچ لی اور ایک بچہ کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس کا گوشت علانیہ فروخت کیا، عورتوں کے ساتھ اور بھی انتہائی وحشیانہ مظالم کیے گئے اور جب ترکوں نے غیظ وغضب میں آکر انتقام لینا شروع کیا تو اس کی خبریں اخبار والوں نے اتنی بڑھا چڑھا کر ہر جگہ شایع کیں کہ سارا یورپ ترکوں کے خلاف ہوگیا، روس، پرشیا، آسٹریا اور جرمنی نے دولت عثمانیہ پر زور دیا کہ بلغاریہ کو زیادہ سے زیادہ مراعات دے کر اس سے صلح کرلی جائے مگر یہ ساری باتیں برطانیہ کے مشورہ کے بغیر طے کر کے عثمانیوں کو بھیجی گئی تھیں، جو اس کو ناگوار ہوا اور اس نے ان کی ضد میں قسطنطنیہ کی حفاظت کے لیے درۂ دانیال میں اپنا بحری بیڑہ بھیج دیا، عثمانی سلطنت ہر طرف سے دشمنوں میں گھری ہوئی تھی، بلقان میں بغاوت کی آگ پھیلتی جارہی تھی، روس اور آسٹریا کی سرپرستی میں بوسنیا، ہرزی گووینا اور بلغاریہ میں شورشیں جاری تھیں، مونٹی نگرو بھی عنقریب اعلان جنگ کرنے والا تھا، سرویا روسی افسروں کی نگرانی میں مسلح ہورہا تھا، رومانیا میں بھی لڑائی کی تیاریاں ہورہی تھیں، یوروپی پریس ترکوں کا شدید دشمن بنا ہوا تھا، ایسی نازک حالت میں سلطان عبدالعزیز کو معزول کردیا گیا۔

سلطان مراد خامس: یہ سلطان بھی چند مہینوں کے بعد معزول کر دیا گیا۔

سلطان عبدالحمید خان ثانی کی مذہبی رواداری: اس سلطان کا زمانہ ۱۸۷۶ء سے ۱۹۰۹ء تک رہا جو کافی طویل تھا، اس نے اپنی حکومت کے آغاز میں ملک کے دستور کے مطابق اس پر زور دیا کہ سلطنت کے تمام باشندوں کو بلا امتیاز مذہب وملت برابر حقوق دیے جائیں اور حکومت کے عہدے سب کے لیے یکساں طور پر کھلے رہیں اور سب کے لیے ایک مشترکہ قانون ہو، جلسوں اور پریس کو آزادی ہو، عدل وانصاف پر زور دیا جائے اور جبری تعلیم رائج کی جائے، اس اعلان پر ملک کا ہر طبقہ خوش ہوا، مسجدوں میں چراغاں کیا گیا، سڑکوں پر جلوس نکال کر سلطان زندہ باد کے نعرے لگائے گئے، یونانی اور آرمینی بطریقوں نے بھی مبارکباد پیش کی مگر سلطنت عثمانیہ کا یہ اقدام یوروپی حکومتوں اور خصوصاً برطانیہ کو پسند نہ آیا کیونکہ اس کے بعد اس حکومت کے اندرونی معاملات میں مداخلت کا موقع نہیں مل سکتا تھا انھوں نے قسطنطنیہ ہی میں ۱۸۷۶ء میں ایک کانفرنس کی جس میں طرح طرح کے مطالبات کے بعد آخر میں یہ مطالبہ کیا گیا کہ بلغاریہ، ہرزیگووینا اور بوسنیا کے صوبوں کے والی پانچ سال تک یورپ کی حکومتوں کی منظوری سے مقرر کیے جائیں مگر عثمانی حکومت نے اس کو منظور نہیں کیا اور اس کا ساتھ سلطنت کے عیسائیوں اور یہودیوں نے بھی دیا، دولت عثمانیہ کی نامنظوری سے روس کو بہانہ مل گیا، وہ پہلے ہی سے عثمانی سلطنت کے علاقہ پر حملہ کرنے کے لیے تیار بیٹھا تھا، اس نے آسٹریا، بوسنیا اور ہرزی گووینا کو طرح طرح کی رشوتیں دیں انگلستان سے غیر جانب دار رہنے کا وعدہ لیا، رومانیا نے بھی صورت حال سے فائدہ اٹھا کر اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا، روس نے بلغاریہ پر قبضہ کر لیا اور قسطنطنیہ کی طرف بڑھنا چاہتا تھا مگر پلونا میں روس کو شکست ہوئی جس کے بعد روسی سلطنت موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا ہوگئی مگر اس میں جان پھر سے اس وقت پیدا ہوگئی جب اس کی فوجوں نے ایشیا میں ترکوں کو متعدد شکستیں دیں اور کئی اہم مقامات پر قابض ہوگئیں، جس کے بعد سرویا نے بھی عثمانیوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا، مونٹی نگرو بھی کچھ عثمانی علاقوں پر قابض ہوگیا، پھر روسی فوج ادرنہ میں داخل ہوگئی، انگلستان چوکنا ہوا کہ اگر روس قسطنطنیہ میں داخل ہوگیا تو پھر توازن بگڑ جائے گا،

اس لیے اپنے بحری بیڑہ کو درۂ دانیال میں بھیجنے کا حکم دیا، اس کے بعد روس نے سان اسٹیفانو میں عثمانیوں سے ایک معاہدہ کیا، جس میں قسطنطنیہ، تھریس اور اورنہ تو ترکوں کے قبضہ میں رہنے دیے گئے، رومانیا، مونٹی نگرو کو آزاد قرار دے دیا گیا، بوسنیا اور ہرزی گووینا کو بھی تقریباً آزادی دے دی گئی اور روس کو جو علاقے ملے اس سے روس کی سلطنت دریائے ڈینوب تک پہونچ گئی، بلغاریہ کو ایک باج گزار خودمختار ریاست بنا کر اس کا رقبہ بھی کافی بڑھا دیا گیا، ایشیا میں قارص، اردہان، بایزید اور باطوم بھی روس کو ملے، سلطنت عثمانیہ پر ایک کرور بیس لاکھ پونڈ تاوان جنگ بھی عائد کیا گیا، اس معاہدہ کی مخالفت سارے یورپ میں ہوئی تو اس پر پھر سے غور کرنے کے لیے پیرس میں اس کے نمایندوں کا اجتماع ہوا، اس اثنا میں انگلستان ایک خفیہ معاہدہ کر کے روس سے مل گیا جس کے بعد یہ طے ہوا کہ یونان، رومانیا، سرویا، مونٹی نیگرو اور بلغاریہ خودمختار حکومتیں ہو جائیں گی اور حکومت عثمانی سے تعلق محض سالانہ خراج کی حد تک رہ جائے گا، اس کے بعد دولت عثمانیہ کو کسی بیرونی سلطنت سے جنگ کی نوبت تو نہیں آئی لیکن اس کے مختلف صوبوں میں شورش برپا رہی اور خودمختار مملکتوں میں کوئی نہ کوئی نزاع برابر جاری رہا (یہ تمام تفصیلات ایور سلے کے باب ۲۱-۲۰ اور تاریخ دولت عثمانیہ ج ۲ کے باب سلطان عبدالحمید ثانی سے ماخوذ ہیں) یورپ کی عیسائی حکومتیں عثمانی علاقے کی شکست و ریخت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتیں، کبھی وہ اپنے مفاد کی خاطر آپس ہی میں لڑ جاتیں لیکن عثمانی سلطنت کی دشمنی میں پھر متحد بھی ہو جاتیں مگر وہ ترکوں کی بہادری، شجاعت، سپہ گری، پامردی اور جاں بازی سے کچھ ایسی مرعوب رہیں کہ وہ آگے بڑھ کر رک بھی جاتیں، ان سب کا تو مقصد یہ تھا کہ جس طرح مسلمانوں کا خاتمہ اسپین میں کیا گیا، اسی طرح ان کا استیصال سرزمین یورپ سے بھی کیا جائے اور قسطنطنیہ پھر ان کے تسلط میں آجائے جس پر رومیوں کی پسپائی کے بعد ترکوں کا قبضہ تھا مگر وہ خود آپس میں متحد نہ تھیں، ایک دوسرے کو شکوک، نفاق اور خطرہ کی نظر سے دیکھتیں کہ کہیں ایک کی غیر معمولی قوت کے اضافہ سے دوسرے کو نقصان نہ پہونچ جائے، اسی لیے ترکوں کو کچھ دنوں اطمینان حاصل ہو جاتا اور جب ان کی قوت بڑھتی دکھائی دیتی تو وہ چھیڑ چھاڑ پھر شروع کر دیتیں، اسی لیے برلن معاہدہ کے بعد کبھی یورپ

کی حکومتیں، کبھی بلغاریہ، کبھی سرویا، کبھی کریٹ، کبھی یونان اور کبھی آرمینیا میں شورش، بغاوت اور فتنہ پیدا کرنے کی کوشش کرتی رہیں اور ضرورت ہوتی تو ان ہی میں جنگ بھی کرادیتیں اور پھر اپنے مفاد کی خاطر عثمانیوں سے بھی محاذ آرائی کرلیتیں، وہ بظاہر عثمانیوں کے عیسائی علاقے کے باشندوں کے محافظ بن جاتے مگر اس ظاہری محافظت میں ان کو اپنا سیاسی مفاد پیش نظر ہوتا۔

اب ہم آیندہ کی تفصیلات لارڈ ایور سلے کی ٹرکش امپائر، ولیم سیلر کی دی اوٹومن امپائر اینڈ اٹس سکسیرز، گرین ول بیکر کی دی پاسنگ آف دی ٹرکش امپائز اور تاریخ دولت عثمانیہ جلد دوم کی مدد سے قلم بند کرتے ہیں۔

دولت عثمانیہ ان یورپی حکومتوں کی دشمنی سے کمزور تو ہوتی ہی جا رہی تھی، اندرونی اختلاف، اختلال اور انتشار سے بھی اس کو نقصان پہونچتا رہا، اندرونی خلفشار میں بھی ان عیسائی حکومتوں کا ہاتھ رہا مگر وہ متحد ہونے کے بجائے یورپ کی سیاسی چالوں سے مات کھاتے رہے، یورپی حکومتوں نے دولت عثمانیہ کو یورپ میں کمزور کرنے کے ساتھ اس کے افریقی اور ایشیائی علاقوں میں بھی اپنی سامراجی سازشوں کا جال بچھا دیا، ۱۸۳۰ء میں فرانس نے الجزائر پر قبضہ کرلیا تھا اور جب یہاں کے مسلمانوں نے اپنے ملک کے تحفظ کے لیے ہتھیار اٹھائے تو چالیس سال تک فرانسیسیوں نے اپنی پوری قوت کے ساتھ وہاں قتل و غارت گری کا بازار گرم رکھا پھر ان کی نظر تونس کی طرف اٹھی جو دولت عثمانیہ ہی کا ایک صوبہ تھا، اس نے ۱۸۸۱ء میں تونس پر حملہ کردیا اور اس پر بے دردی سے گولہ باری کی، یہاں کے مکانات، ان کے مکینوں باشندوں کے ساتھ جلا دئے گئے، قتل اور غارت گری کا بازار برابر جاری رکھا، جس طرح آگ اور خون کے ذریعہ سے تونس فرانس کے اقتدار میں لایا گیا اس پر مسیحی حکومتیں خاموش رہیں، اس لیے کہ خود ان کو دولت عثمانیہ کی تقسیم میں حصہ دار بننا تھا، اسی زمانہ میں برطانیہ نے قبرص پر قبضہ کرلیا تھا، وہ فرانس کے تونس پر قبضہ کرنے کے موقع پر خاموش اس لیے رہا کہ فرانس اس کے قبرص کے تسلط پر معترض نہ ہو، البتہ وہ روس کو آگے بڑھنے نہیں دینا چاہتا تھا کہ کہیں مشرق میں اس کی توسیع پسندی سے اس کا مفاد خطرہ میں نہ پڑ جائے۔

مصر دولت عثمانیہ ہی کا باج گزار تھا، وہاں نہر سوئز یورپ کے ساہوکاروں کے قرض سے جاری کی گئی تھی، یہ قرض ادا نہ ہو سکا تو یورپ کی سیاسی چال بروئے کار آگئی اور مصر کا صیغۂ مالیات فرانس اور انگلستان کی نگرانی میں آگیا، جس کے بعد اس کی تمام آمدنی قرض کی ادائیگی میں خرچ ہونے لگی، رفتہ رفتہ نہر پر ان یوروپی طاقتوں کا سیاسی قبضہ بھی ہونے لگا، ایک موقع ایسا بھی آیا کہ انگریزوں نے اپنے مفاد کی خاطر اسکندریہ پر گولہ باری بھی کی اور جب وطن دوستوں نے ان کے خلاف جنگ کی تو کفر ودار، اسماعیلیہ، قصاصین اور تل الکبیر میں ان کو پسپا کیا، پھر خدیو مصر کی غداری سے اپنے مطلب کی وہاں کٹھ پتلی حکومت قائم کر لی اور وطنی تحریک کے علم برداروں کو باغی قرار دے کر باغیوں جیسی سزائیں دیں، انگریزوں کا یہ اقتدار جرمنوں کو پسند نہ آیا اور وہاں کا قیصر ولیم ثانی دولت عثمانیہ کا دوست بن گیا اور اپنی دوستی میں ایشیائے کوچک میں ریلوے لائن کی تعمیر کی تجویز پیش کی، بغداد کی ریلوے کو ایشیائے کوچک سے بڑھا کر مسوپوٹامیہ تک لے جانے کا ارادہ ظاہر کیا، انگریزوں کو یہ تشویش ہوئی کہ اس سے نہر سوئز کی اہمیت ختم ہو جائے گی اور اس ریلوے لائن کے ذریعہ جرمنی کا اثر ایشیا میں بڑھا تو ہندوستان میں اس کی حکومت خطرہ میں پڑ جائے گی، اس کے بعد روس، فرانس اور انگلستان میں ایک اتحاد ثلاثہ ہو گیا، جس کی اصل غرض یہ تھی کہ جہاں تک ممکن ہو اسلامی سلطنتوں کے ٹکڑے کر کے ان پر قبضہ کر لیا جائے، اس کے بعد ۱۹۰۷ء میں ایران کی سلطنت ایک معاہدہ کی رو سے دو حصوں میں تقسیم کر دی گئی، ایک پر روس اور دوسرے پر انگلستان کا قبضہ ہو گیا۔

یہ طاقتیں عثمانی صوبوں پر قبضہ کرنے کے ساتھ اس فکر میں لگی رہیں کہ ان کے اور علاقوں میں بدامنی اور بغاوت پھیلے، چنانچہ ان کی نظریں اب عثمانیوں کے بلقانی صوبوں کی طرف اٹھیں، پہلے انھوں نے مقدونیہ کی تقسیم کا منصوبہ بنایا تاکہ یوروپین ترکی کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی تجویز آگے بڑھائی جائے۔

اسی کے ساتھ ۱۹۰۴ء کے بعد انگلستان، روس اور فرانس نے ترکی کو مرد بیمار قرار دے کر اس کے ملک کے حصے بخرے کرنے کا قطعی فیصلہ کر لیا، اسی درمیان میں ترکی کے اندر

نوجوان ترکوں کی ایک تحریک چل کھڑی ہوئی، جس سے مسیحی حکومتوں کے عزائم میں رکاوٹ پیدا ہوگئی، ان نوجوان ترکوں نے لائحۂ عمل تیار کیا کہ سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے بچانے کے لیے نہایت ضروری ہے کہ اس کی تمام قوموں اور مذہبی فرقوں کو یکساں حقوق دے دیے جائیں، چنانچہ انھوں نے آرمینی، بلغاری اور دوسری غیر مسلم انقلابی انجمنوں سے جو پیرس میں تھیں اتحاد عمل پیدا کرنے کی کوشش کی، ان کی تنظیم انجمن اتحاد و ترقی کی ایک کانگریس پیرس میں ہوئی تو اس میں آرمینی، بلغاری، یہودی، عرب، البانی اور دوسرے فرقہ کے لوگ بھی شامل ہوئے اور اس میں یہ طے پایا کہ سلطنت عثمانیہ کی سالمیت کا تحفظ اور اس کے قانون کی نگاہ میں تمام نسلوں اور مذہبوں کو کامل مساوات حاصل ہو اور سلطان عبدالحمید کی حکومت کے بجائے دستوری حکومت ہو، اس انجمن نے اپنا صدر دفتر مقدونیہ ہی میں بنایا تاکہ یہاں آسٹریا اور روس کی ریشہ دوانیوں کا سدباب بھی ہو جائے پھر اس کا دفتر سالونیکا تبدیل ہو گیا مگر اس کی شاخیں ہر جگہ پھیل گئیں، اس کی سرگرمیوں سے ایک بڑا انقلاب آ گیا اور ایک دستوری حکومت قائم کی گئی جس میں اس پر زور دیا گیا کہ عثمانی سلطنت کے اندر رہنے والے تمام باشندوں کو کسی نسلی امتیاز کے بغیر ذاتی آزادی حاصل ہوگی اور حقوق و فرائض کے اعتبار سے سب برابر ہوں گے، ان کو حق حاصل ہوگا کہ جہاں چاہیں بود و باش اختیار کریں اسی کے مطابق وزارت بنی مگر یوروپی طاقتوں کو یہ انقلاب پسند نہ آیا وہ تو سلطنت عثمانی کو کمزور کر کے اپنا فائدہ حاصل کرنا چاہتی تھیں اور جب دستوری حکومت نے یہ چاہا کہ دستور کا نفاذ بوسنیا اور ہرزی گووینا میں ہو تو آسٹریا نے اس کو پسند نہیں کیا، ان دونوں علاقوں پر سلطنت عثمانیہ کی فرماں روائی اب بھی تسلیم کی جاتی تھی مگر ان کو آسٹریا کی نگرانی میں کر دیا گیا تھا آسٹریا کو خیال ہوا کہ کہیں دولت عثمانیہ پھر اپنی قوت کے ساتھ نہ ابھر جائے تو اس نے بوسنیا اور ہرزی گووینا میں نوجوان ترکوں کے دستور کی مخالفت کی، آسٹریا کی مخالفت دیکھ کر بلغاریہ کے فرماں روا نے اپنا قدیم لقب اختیار کر لیا اور کریٹ نے مملکت یونان سے اپنے الحاق کا اعلان کر دیا، ترکی میں پارلیمنٹ کا انتخاب ہوا تو انجمن اتحاد و ترقی کو کامیابی حاصل ہوئی، انھوں نے اپنی پارلیمنٹ میں یہ اعلان کیا کہ اس کے یہاں تمام قوموں کو مساوی حقوق

حاصل ہوں گے، غیر مسلم بھی فوجی خدمت کے ذمہ دار ہوں گے مگر یورپ کی مسیحی حکومتیں خاموش نہیں رہیں، انھوں نے اس انجمن کے خلاف ملک میں بغاوت کرادی، جس سے دستوری حکومت کے وزیروں اور اس کے حامیوں کو قسطنطنیہ چھوڑ کر کہیں اور پناہ لینی پڑی اور اس کے بہت سے ممبر مارے بھی گئے لیکن جب دستوری حکومت نے بغاوت پر قابو پالیا تو باغیوں کو سخت سزائیں دیں اور سلطان عبدالحمید کی جگہ اس کے بھائی شہزادہ محمد شاہ کو محمد خامس کے نام سے تخت پر بٹھایا۔

عیسائیوں کی مخالفت: نئے دستور میں عیسائیوں کو وہ تمام حقوق دیے گئے تھے جو ترکوں کو حاصل تھے مگر وہ شہریت کے حقوق سے تو پورا فائدہ اٹھانا چاہتے تھے، فرائض ادا کرنے کی ذمہ داری لینے کے لیے تیار نہ تھے، ان پر فوجی خدمت بھی عائد کی گئی تھی اس کو پسند نہیں کیا پھر ابتدائی مدارس میں ترکی زبان کی تعلیم لازم قرار دے دی گئی تھی، اس سے ان کو ناگواری پیدا ہوئی، کلیسا نے اس بے چینی سے فوراً فائدہ اٹھایا اور اس کے ذریعہ مقدونیہ، سرویا اور بلغاریہ میں قومیت کے نام پر شورش شروع کرادی پھر مسیحی حکومتوں نے غیر ترک مسلمانوں یعنی عرب، البانی اور کرد وغیرہ میں انفرادی قومیت کا احساس دلایا، ان تمام باتوں کو ہوا دینے میں انگلستان کے اخباروں نے زیادہ معاندانہ رویہ اختیار کیا، یورپ ترکی کو اپنے دست نگر کی حیثیت سے تو پسند کرتا تھا، اپنا مدمقابل دیکھنا کسی حال میں گوارا نہیں کرسکتا تھا، یورپ کے اخباروں کی مہم اس جذبہ کے ماتحت جاری تھی، بلغاریہ نے اپنی فرماں روائی کا اعلان کردیا تو ترکی کی دستوری حکومت کو تسلیم کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا، ترکوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر آسٹریا نے بوسنیا اور ہرزی گووینا کو اپنی مملکت میں شامل کرلیا۔

طرابلس پر فرانس کا حملہ: ان دست درازیوں میں اٹلی اب تک شامل نہ تھا مگر وہ کیوں خاموش رہتا، اس لیے ۱۹۱۰ء میں اٹلی نے طرابلس پر حملہ کردیا اور یہ عجیب بات ہے کہ آخر میں اس جنگ میں اٹلی کو شکست فاش ہوئی لیکن ستم ظریفی یہ ہوئی کہ جب لوزان کا صلح نامہ ہوا تو یورپ کی دول عظمیٰ نے اپنے دباؤ سے کام لے کر طرابلس کو اٹلی کے حوالہ کردیا، عثمانی سلطنت اس کو تسلیم کرنے کے لیے اس لیے بھی تیار ہوگئی کہ بلقان کی ریاستوں میں اس کے خلاف

بڑی شورش پیدا کردی گئی تھی ، بلقان کی تمام ریاستوں نے متحد ہوکر عثمانی سلطنت کے خلاف اعلانِ جنگ کردیا، اس میں روس کی طرف سے ان کو خفیہ طور سے پوری مدد ملی۔

بلقان کی جنگ: روس بے چین تھا کہ کس طرح بلقانی ریاستوں کو متحد کر کے ترکوں کو بلقان سے نکال دے اور پھر خود آبنائے فاسفورس اور قسطنطنیہ پر قبضہ کرلے، اس لیے اس نے بلقانی ریاستوں کو ہر طرح اکسایا، جس کے نتیجہ میں البانیہ میں بغاوت ہوئی، پھر سرویا چاہتا تھا کہ اس کی مملکت کی سرحد بحرا یجین اور بحر ایڈریاٹک کے ساحلوں تک پہونچ جایے، مونٹی نگرد اپنی آزادی چاہتا تھا، بلغاریہ قسطنطنیہ پر قبضہ کرنا چاہتا تھا، سرویا اور یونان آزاد ہوکر خود مختار بننا چاہتے تھے، روس کی سازش سے ان سب ریاستوں نے اعلان جنگ کردیا، بحری اور بری لڑائیوں میں آخر میں ترک ہارے، یورپ میں صرف اورنہ، یانینا اور سقوطری پر ان کا قبضہ رہا مگر اس غارت گری کی تقسیم میں خود ان ریاستوں میں اختلاف ہوگیا، اس افتراق سے فائدہ ترکوں نے ضرور اٹھایا اور انھوں نے اپنے کچھ علاقے ان سے ضرور واپس لیے لیکن یورپ کی سازشوں کے خلاف وہ زیادہ کامیاب نہیں ہوسکے، بار بار صلح نامے ہوئے ان کی شکست و ریخت ہوتی رہی لیکن ۱۹۱۳ء میں بخارسٹ میں جو صلح نامہ ہوا تو مقدونیہ، یونان اور سرویا کے درمیان تقسیم کردیا گیا، سرویا کو وسطی مقدونیہ ملا، اس کا کچھ حصہ مونٹی نگرو کو بھی دیا گیا، یونان کے حصہ میں پائرس جنوبی مقدونیہ، سالونیکا اور مشرق میں دریائے مستا تک ساحلی علاقہ آیا، رومانیا نے دوبروجا کا ایک بڑا حصہ سلسٹر یا قلعہ کے ساتھ پایا، اس تقسیم سے پہلے ترکی کی یوروپین آبادی اکسٹھ لاکھ سے زیادہ تھی اور اس کا رقبہ پینسٹھ ہزار مربع میل تھا لیکن بلقان کی جنگ کے بعد یوروپین آبادی چار لاکھ سے کچھ زیادہ رہ گئی اور رقبہ صرف گیارہ ہزار مربع میل رہ گیا۔

جنگ عظیم اول: اور جب اگست ۱۹۱۴ء میں دنیا کی سب سے بڑی جنگ شروع ہوئی تو اس میں ترکوں کو مسیحی حکومتوں کی دشمنی سے اور نقصان پہونچا، جنگ کا آغاز تو آسٹریا کے ایک شہزادہ کے قتل سے ہوا جس کا تعلق ترکوں سے نہ تھا مگر جب اس سلسلہ میں جنگ چھڑی تو جرمنی ایک طرف اور بقیہ یورپ کی ساری حکومتیں دوسری طرف تھیں، ترک اس جنگ سے علاحدہ رہنا چاہتے تھے لیکن بعض ناگزیر اسباب کی بنا پر اس کو جرمنی کا ساتھ دینا پڑا، یورپ

کی حکومتوں نے جو دشمنی اور عناد اس کے ساتھ دکھایا تھا اس کا یہ لازمی نتیجہ خلاف توقع نہ تھا، ترک اس مسیحی حکومتوں کی اس مداخلت سے تنگ آ گئے تھے جو وہ ان کے علاقوں میں ہر قسم کی تخریبی سازشوں کے ذریعہ مدتوں سے کر رہے تھے، اس کو سب سے زیادہ خطرہ روس سے تھا جو قسطنطنیہ پر قبضہ کرنے کے لیے بے چین تھا، یورپ کی حکومتیں اپنی متعصّبانہ ذہنیت کی وجہ سے عثمانی علاقوں کے عیسائیوں کی حمایت کرنے کے بہانے وہاں کے مسلمانوں پر ہر قسم کے مظالم ڈھا رہی تھیں نوجوان ترک جرمنی کی طرف مائل اس لیے تھے کہ وہ روس کا مخالف تھا، ان کو خیال ہوا کہ اس جنگ میں اتحادیوں کو شکست ہوئی تو ترکوں کے اچھے دن شاید پلٹ آئیں۔

اس جنگ میں ترکوں کی شرکت کی وجہ سے اتحادیوں میں بڑی پریشانی ہوئی، وہ ترکوں کو برابر شکست دے رہے تھے مگر وہ ان کی فوجی کارکردگی اور جاں بازی سے ہر زمانہ میں مرعوب رہے، ان کو خیال ہوا کہ ترکوں کو جرمنی کی طرف سے موثر سامان جنگ مل گیا تو پھر ان کو شکست دینا آسان نہ ہوگا۔

جنگ شروع ہوئی تو انگریزوں کا جنگی منصوبہ یہ ہوا کہ اس کا بحری بیڑہ درۂ دانیال میں داخل ہو کر قسطنطنیہ پہونچ جائے اور پھر ترکی کا خاتمہ کر دیا جائے مگر اس میں ان کو مایوسی ہوئی، ترکوں نے یہاں اپنی سپہ گری کا پورا جوہر دکھایا اور اتحادیوں کے سارے عزائم برباد کر دیے، اس بحری لڑائی میں اتحادیوں کے تقریباً پچاس ہزار سپاہی ہلاک ہوئے اور ان کے جنگی جہازوں کی بڑی تعداد غرق ہوگئی۔

بحری جنگ کی اس ناکامی کے بعد انگلستان اور فرانس نے بری جنگ میں ترکوں کو شکست دینے کا پلان بنایا اور انھوں نے ایک زبردست فوج گیلی پولی بھیج دی، ترکوں نے اس جنگ میں اپنی نبرد آزمائی اور پامردی کا جو ثبوت دیا، وہ دنیا کی لڑائیوں کی تاریخ میں ہمیشہ یاد کی جائے گی، اتحادی اپنی فوج کی ہزاروں لاشیں چھوڑ کر میدان جنگ چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔

ایشیائے کوچک میں یہ کامیابی ترکوں کو حاصل نہ ہوسکی، روسیوں نے آرمینیا،

ارض روم، وان اور بطلس پر قبضہ کرلیا، عربوں کے علاقوں میں اتحادیوں اور خصوصاً انگریزوں نے عرب قومیت کو ابھار کر عربوں کو ترکوں کے خلاف ابھارا اور انھیں یہ سبز باغ دکھایا کہ جب ان کی علاحدہ علاحدہ حکومتیں ہو جائیں گی تو وہ زیادہ بہتر حال میں ہوں گے، ترکوں نے اتحادیوں کی فوج کو عراق کے قطر العمارہ کے محاصرہ میں سخت شکست دی مگر جب بغداد کی جنگ ہوئی تو انگریزوں نے عراقیوں کو یقین دلایا کہ وہ جنگ جیت کر اہل عراق کی ایک علاحدہ حکومت قائم کردیں گے، بغداد میں ترکوں کو شکست ہوئی، جس کے بعد انگریزوں کی سازش سے شریف حسین نے عرب میں ترکوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا مکہ معظمہ اور جدہ پر قبضہ کرلیا اور شاہ حجاز ہونے کا اعلان کیا، حکومت برطانیہ نے اس کی مستقل بادشاہت ترکوں کی ضد میں تسلیم کرلی، شریف حسین کا لڑکا امیر فیصل عربوں کی ایک فوج لے کر ترکوں کے مقابلہ میں شام کی طرف بڑھا، انگریزوں نے اسلحہ اور روپے کی پوری مدد کی، ترکوں کو شام میں شکست دی۔

اس وقت تک دولت عثمانیہ کا سلطان دنیا کے تمام مسلمانوں کا خلیفہ بھی سمجھا جاتا تھا اس لحاظ سے وہ حرمین شریفین کا نگران اعلیٰ بھی تھا مگر انگریزوں کی سازش سے شریف حسین جب مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کا بادشاہ ہوگیا تو خلافت کا مسئلہ بھی خطرہ میں پڑ گیا مگر عربوں کو اس کی فکر نہیں ہوئی اور وہ اپنے نسلی مفادات کی خاطر اتحادیوں سے مل گئے تو اتحادی شام میں داخل ہوکر بیت المقدس پر قابض ہوگئے اور ۱۹۱۸ء کے آخر تک حجاز، شام، لبنان اور عراق کے تمام علاقے ترکوں کے ہاتھوں سے نکل گئے، مصر بھی برطانوی اور فرانسیسی جنگی جہازوں کی لڑائیوں کے بعد ترکوں کی فرماں روائی سے آزاد ہوگیا، یورپ میں اتحادیوں نے سلیشیا اور قسطنطنیہ پر بھی قبضہ کرلیا اور بقول پروفیسر ٹوائن بی جس طرح بھوکے بھیڑئے شکار کی تاک میں چشمہ گاہ کے گرد چکر کاٹتے ہیں اسی طرح تمام اتحادی طاقتیں اس فکر میں تھیں کہ موقع پاکر ترکی پر ٹوٹ پڑیں کیونکہ ترکی فطرۃً ایک زرخیز ملک ہے۔ (ترکی از آرنلڈ ٹوائن بی مطبوعہ لندن ۱۹۲۶ء ص ۶۸، تاریخ دولت عثمانیہ ج ۲ ص ۳۴۶) وہ آپس میں خفیہ معاہدے کرتے رہے کہ کس طرح ترکی کی تقسیم کی جائے، اس درمیان میں یونانیوں نے برطانوی،

فرانسیسی اور امریکن جنگی جہازوں کی مدد سے سمرنا پر قبضہ کرلیا، ہیرلڈ آرم اسٹرانگ اپنی کتاب ترکی دروازہ (ص ۸۴-۸۳، تاریخ دولت عثمانیہ جلد دوم ص ۳۵۴) میں لکھتا ہے کہ انھوں نے ساحل پر اترنے کے بعد قتل عام شروع کردیا، مکانوں میں آگ لگادی، عورتوں کی عصمت دری کی، ٹوائن بی لکھتا ہے کہ مغربی اناطولیہ پر ایک بلائے ناگہانی نازل ہوگئی جیسے کوہ آتش فشاں پھٹتا ہے، لوگ قتل ہونے لگے، زرخیز وادیوں میں آگ کے شعلے بھڑکنے لگے، خون کی ندیاں بہتی دکھائی دیں، جو بچ رہے وہ زبردستی فوج میں بھرتی کرلیے گئے یا جلاوطن کردیے گئے، غرض قتل وغارت گری کا یہ سیلاب سمرنا سے شروع ہوا اور دور دور تک پھیلتا گیا، آرم اسٹرانگ ہی کا بیان ہے کہ ہر طرف سے یہ آواز اٹھ رہی تھی کہ قسطنطنیہ اور اباصوفیہ پر مسیحی تسلط پھر قائم کردیا جائے اور ترکوں کو یورپ سے نکال دیا جائے، جو لوگ مذہبی جذبات سے متاثر نہ تھے وہ بھی اس سے اتفاق کرتے کہ ترکی کا خاتمہ کردیا جائے، برطانیہ کا وزیر اعظم لارڈ جارج اس خیال کا سب سے بڑا حامی تھا۔ (ترکی دروازہ ص ۶۴، تاریخ دولت عثمانیہ ج ۲ ص ۳۵۴)

ترک یورپ سے تو نہیں نکالے گئے لیکن وہ یورپ کے ایک محدود علاقہ میں سمٹ کر رہ گئے اور یہ اس کا انجام ہوا، جس کے امپائر کا رقبہ ایک زمانہ میں معلوم نہیں کتنے ہزاروں مربع میل تک پھیلا ہوا تھا اور اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ اس امپائر کا خاتمہ یورپ کے عیسائیوں کے مذہبی تعصب، عدم رواداری، دشمنی، فریب کاری، دھوکا دھڑی اور نفرت کی وجہ سے ہوا مگر اس کے پیچھے جو شاندار تاریخ ہے اس کو مورخین بھلا نہیں سکتے۔

ترکوں کے کارناموں پر ایک نظر: سر ولنٹین چیرول اپنے ہم مذہبوں اور ہم وطنوں کی طرح ترکوں کا بہت بڑا ناقدر رہا ہے اور ان کی قدح کی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ہے لیکن اس نے لارڈ ایورسلے کے ساتھ جو دی ٹرکش امپائر لکھی ہے اس میں اس نے اس کے آخری باب میں ترکوں کے کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''تین سو برس تک دس سلاطین اور ایک وزیر اعظم سوکولی نے اس سلطنت کی توسیع میں حصہ لیا، اس مدت میں ان کو مسلسل فتوحات اور کامرانیاں حاصل ہوئیں، اس عرصہ میں ان کو ۱۴۰۲ء میں تیمور اور منگول

حملہ آوروں سے ایک زبردست شکست بھی ہوئی، اس وقت ایسا معلوم ہوا کہ اس ضرب کاری سے یہ سلطنت سنبھل نہ سکے گی لیکن یہ بہت جلد سنبھل گئی اور اس کی فتوحات پھر ہونے لگیں، انھوں نے میدان کی ایسی لڑائیاں تو زیادہ نہیں لڑیں جن سے ریاستوں کی قسمت کا فیصلہ ہوجاتا لیکن ان کو کامیابیاں برابر ہوتی رہیں، ۱۳۶۳ء میں مراد اول نے بازنطینیوں کو شکست دے کر تھریس حاصل کیا، ۱۳۷۱ء میں ساما کوف کی جنگ کے بعد بلغاریہ فتح ہوا، کوسووا کی لڑائی میں سرویا حاصل ہوا، ۱۵۲۹ء میں ہنگری کو زیر کیا گیا، ۱۵۱۴ء میں ایران پر ان کا تسلط ہوا، ۱۵۱۶ء میں مصر ان کے قبضہ میں آیا اور جب یورپ کے صلیبی ان سے برسرپیکار ہوئے تو ان کو ۱۳۶۳ء میں مریٹ زا ۱۳۹۶ء میں نکوپولس اور ۱۴۴۴ء میں وارنا میں شکست دی، ان تمام لڑائیوں میں ترک لشکریوں کی تعداد زیادہ رہی اور جب وہ ایران اور مصر کی مہم پر گئے تو ان کے ساتھ بہت طاقتور توپ خانے تھے، ان کے مقابلے میں ان کے دشمن کمزور پڑے، وہ محاصروں کی جنگ بھی کامیابی کے ساتھ کرتے رہے، گرچہ محصورین محاصروں کو طویل کردینے میں برسوں تک کامیاب ہوجاتے۔

عثمانی بحری جنگ میں بھی کامیاب رہے، لپانٹو کی بحری لڑائی میں تو یورپ کی حکومتوں کے مجموعی بیڑوں سے ضرور بری طرح ہارے لیکن اس سے پہلے وہ اپنی بحری قوت کی وجہ سے اپنے امپائر کے حدود کو الجزائر اور ٹیونس تک بڑھا سکے، لپانٹو کی شکست سے ان کے وقار کو صدمہ ضرور پہونچا، لیکن جب یورپ کی حکومتوں کا یہ اتحاد باقی نہیں رہا تو مشرقی بحر قلزم میں ان ہی کا اقتدار رہا، وزیر اعظم سوکولی کے زمانہ میں تو عثمانی امپائر اپنے انتہائی عروج کو پہونچ گیا تھا اس کے بعض حصوں پر ان کا پورا تسلط تو نہیں ہوا مثلاً شمالی ہنگری کے کچھ حصے خود مختار تھے لیکن ان کو خراج ادا کرتے رہے، کریمیا، ولاچیا اور مالڈیویا باج گزار ریاستیں رہیں، ان کے حکمراں سلطنت عثمانیہ

کا سلطان ہی مقرر کرتا اور جب سلطنت عثمانیہ کی لڑائی کسی سے ہوتی تو وہ اس کے لیے لشکری بھی فراہم کرتے، یورپ میں جو خاص علاقے اس امپائر کے ساتھ بالکل منسلک رہے، وہ تھریس، مقدونیہ، بلغاریہ، یونان سرویا، بوسنیا اور البانیہ تھے، ایشیا میں ان کی حکمرانی اناطولیہ، مسوپوٹومیا، شام اور عرب کے بڑے حصے پر تھی، افریقہ میں طرابلس، مصر اور تونس ان کی حکومت کے اندر تھے، الجزائر نے عملی طور پر آزادی حاصل کر لی تھی لیکن اس پر سلطان کی فرماں روائی کچھ نہ کچھ باقی تھی، اس طرح یہ امپائر اپنے زمانہ کے عظیم ترین امپائروں میں تھا۔'' (ص ۴۲۶-۴۲۵، ۱۹۲۱ء ایڈیشن)

یہی مصنف لکھتا ہے کہ یورپ میں عام خیال ہے کہ ترکوں نے جب یورپ پر حملہ کیا تو ان میں اسلام کے پھیلانے کا متعصّبانہ جذبہ تھا اور ان کے ساتھ صرف ترکی نسل کے سپاہی تھے مگر مصنف کا خیال ہے کہ ان کے سپاہیوں میں وہ لوگ بھی تھے جو بازنطینی امپائر کی شکست کے بعد عثمانیوں کے ماتحت ہو گئے اور انھوں نے خود اسلام قبول کر لیا اور اپنے کو عثمانی کہنے لگے تھے، یہی مصنف اناطولیہ کے ترک سپاہیوں کی بڑی تعریف کرتا ہے کہ وہ بڑے بہادر، جفاکش، سنجیدہ، کفایت شعار اور صفائی پسند ہوتے، یہی ان کے مذہب کی بھی تعلیم تھی اور پھر اس کی وجہ سے ان کو کامیابیاں حاصل ہوتی رہیں، یہی مصنف یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ ان کی لڑائیوں میں اسلام کی تبلیغ کا جذبہ نہ ہوتا، شمالی حکمرانوں نے ان لڑائیوں کے بعد کسی کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا اور نہ امن کے زمانے میں اپنی غیر مسلم رعایا میں اسلام پھیلانے کی کوشش کی۔ (ص ۴۲۸-۴۲۷)

وہ اسلام کی جبری تبلیغ واشاعت کے کبھی قائل نہیں رہے، انھوں نے شروع ہی سے اپنی رعایا کو مکمل مذہبی اور شخصی آزادی دے رکھی تھی، جیسا کہ گذشتہ اوراق میں ذکر آچکا ہے۔

مراد اول نے تیس سال تک حکومت کی، اس کا زیادہ وقت میدانِ جنگ میں گذرتا، اس کی ناقابل تسخیر فوجوں کی وجہ سے یورپ کی نہایت طاقتور سلانی قومیں اس کے زیر نگیں ہو گئی تھیں، ہربرٹ گبنس لکھتا ہے کہ تیس سال اس نے عثمانیوں کی سیادت میں اپنے

سیاسی تدبر کے ساتھ کی ، اس عہد کا کوئی مدبر اس پر فوقیت حاصل نہ کرسکا،" اس کی فتوحات پانچ صدیوں تک قائم رہیں، ہم پہلے بھی ذکر کر چکے ہیں کہ اس کے عہد میں عیسائیوں کے ساتھ مسلمانوں کی بدسلوکی کی کوئی شکایت یونانی کلیسا کے بطریق کے دفتر میں درج نہیں۔ (ہربرٹ گبنس ص ۱۷۸، تاریخ دولت عثمانیہ ج ا ص ۵۳)

محمد اول اپنے تدبر اور نظم ونسق کی صلاحیت اور اپنی سپہ گری میں اپنے کسی پیش رو سے کم نہیں تھا، وہ کشادہ دل تھا، اپنی عیسائی رعایا کے لیے کسی قسم کی زیادتی روا نہیں رکھتا، وہ شریف محمد کے نام سے مشہور رہا، اس کے بعد کے سلطان مراد ثانی کے متعلق گبن لکھتا ہے کہ اس کے عدل اور بردباری کی تصدیق اس کے طرز عمل نیز خود عیسائیوں کی شہادت سے ہوتی ہے، جن کا خیال تھا کہ اس کے عہد کی خوشحالی اور اس کی پرسکون موت اس کے غیر معمولی اوصاف کا صلہ تھی۔ (فال اینڈ ڈکلائن آف دی رومن امپائر جلد ۴ ص ۴۲۱-۴۲۰)

مراد ثانی ہی کے زمانہ کے ہنگری کے ایک معاصر عیسائی جنرل ہونالے ڈے کے متعلق اسٹینلی لین پول لکھتا ہے کہ اس نے ٹرانسلونیا کی ایک جنگ میں بیس ہزار ترکوں کو ہلاک کیا اور ان کے سپہ سالار کو گرفتار کر کے سرعام قتل کرایا اور اس کی لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کرادئے، اسٹینلی لین پول یہ بھی لکھتا ہے کہ اس کو سفاکی اور خوں ریزی سے خوشی ہوتی، وہ کوئی دعوت کرتا تو اپنے دشمنوں کے کٹے ہوئے سروں کو دعوت میں دیکھ کر خوش ہوتا اور حکمراں تو دعوتوں میں موسیقی سے محظوظ ہوتے مگر وہ اپنی دعوت میں مرتے ہوئے قیدیوں کی آہ وبکا سن کر محظوظ ہوتا۔ (ٹرکی ص ۸۸)

ایسی مثالیں عثمانی بلکہ کسی علاقہ کے مسلمان حکمرانوں کی تاریخ میں نہیں ملیں گی۔

جب محمد دوم فاتح اپنی فتح کے بعد قسطنطنیہ میں داخل ہوا تو اس کا ذکر پروفیسر ٹی. ڈبلیو. آرنلڈ نے اپنی مشہور کتاب پریچنگ آف اسلام میں جو کچھ کہا ہے اس کا حوالہ گذشتہ اوراق میں بھی آچکا ہے، ذرا یہاں پر اس کتاب کے ایک لمبے اقتباس کو بھی پڑھیں:

> "سلطان محمد ثانی نے قسطنطنیہ پر قبضہ کرنے اور شہر میں امن ہونے پر پہلا انتظام یہ کیا کہ یونانی کلیسا کا حامی اور سرپرست بنا تا کہ

عیسائی اس کی اطاعت قبول کریں عیسائیوں پر سختی کرنے کی ممانعت کردی اور ایک فرمان جاری کیا جس کے بموجب قسطنطنیہ کے نئے بطریق اور اس کے جانشینوں اور ماتحت اسقفوں کو قدیم اختیارات جو حکومت سابقہ میں ان کو حاصل تھے دیے گئے اور جو ذریعے ان کی آمدنی کے تھے وہ بحال ہوئے اور جن قواعد سے وہ مستثنیٰ تھے ان سے بدستور مستثنیٰ کیے گئے، گناروس کو جو ترکوں کی فتح کے بعد قسطنطنیہ کا پہلا بطریق ہوا، سلطان نے اپنے ہاتھ سے وہ عصا عنایت فرمایا جو اس کے منصب کا نشان تھا اور ایک خریطہ میں ایک ہزار اشرفیاں تھیں اور ایک گھوڑا جس پر بہت پر تکلف سامان تھا اس کو دیا اور اجازت دی کہ وہ اپنے سامان جلوس کے ساتھ شہر میں سوار ہو کر دورہ کرے، ترکوں نے صرف یہی نہیں کیا کہ کلیسا کے سب سے بڑے افسر کی وہی عزت اور وقعت قائم رکھی جو اس کو عیسائی شہنشاہان روم کے وقت میں حاصل تھی بلکہ عدالت کے وسیع اختیارات بھی اس کو دیے، بطریق قسطنطنیہ کی عدالت ایسے کل مقدمات کا جن میں فریقین مسیح المذہب ہوں فیصلہ کرتی تھی، جرمانہ کرنے اور مجرموں کو قید کی سزا دینے کے اختیارات جس کے لیے علاحدہ قید خانے بنے ہوئے تھے اور خاص صورتوں میں سزائے موت کے حکم دینے کا اختیار اس کو حاصل تھا، وزرائے سلطنت اور ترک حکام کو ہدایت تھی کہ اس عدالت کے فیصلوں کی تعمیل کریں، سابق کی عیسوی سلطنت نے رعایا کے مذہبی امور میں طرح طرح کی دست اندازیاں کی تھیں لیکن ترکوں نے ان میں کچھ دخل نہیں دیا، بطریق اور اس کی مذہبی مجلس کو پورے اختیارات مذہب اور مذہبی انتظام کے بارہ میں حاصل ہوئے، بطریق مجاز تھا کہ مذہبی مشوروں کی مجلس کو جب چاہے جمع کرے اور اس کے ذریعہ سے عیسوی فقہ اور اصول کے تمام مسائل کو بغیر سلطنت کی مداخلت کے طے کرے اور چونکہ ایک حیثیت سے وہ سلطانی عہدہ دار بھی تھا اس لیے اس

کے اختیار میں تھا کہ مصیبت زدہ عیسائیوں کی حالت کی اصلاح اس طرح کرے کہ ناانصاف ترک گورنروں کے کاموں سے سلطان کو مطلع کردے، یونانی اسقف جو اضلاع میں تھے ان کی بھی بہت عزت تھی اور عدالت کے اختیارات ان کو اس قدر دئے گئے کہ موجودہ زمانہ تک انھوں نے اپنے علاقوں میں عیسائیوں پر ترک حاکموں کی طرح حکومت کی۔'' (دعوت اسلام اردو ترجمہ ص۱۶۳-۱۶۲)

وان ہیمبر سلیمان اعظم کے متعلق لکھتا ہے کہ اسلامی قانون کا پابند ہونے کے باوجود اس میں رواداری تھی، ایک فرانسیسی مورخ لکھتا ہے کہ قرآن مجید کی یہ دو آیتیں اس کا دستور العمل رہیں، اللہ انصاف اور مہربانی کا حکم دیتا ہے، انصاف سے لوگوں کا فیصلہ کرو اور اپنی خواہش کی اتباع نہ کرو۔

سلیمان اعظم نے عیسائیوں کو جو مذہبی اور سیاسی رعایتیں دیں اس کا ذکر ہم گذشتہ اوراق میں کر چکے ہیں اور یہ تمام رعایتیں اس کے جانشینوں کے عہد میں باقی رکھی گئیں، اس زمانہ میں ولاچیا کے عیسائی فرماں روا کی جو تصویر لارڈ ایورسلے نے کھینچی ہے، وہ موازنہ کے لیے ملاحظہ کریں:

''اس کا نام تاریخ کے شدید ترین ظالموں اور خونخوار بدمعاشوں میں تھا، وہ اپیلر یعنی جسم میں میخیں ٹھوک کر ہلاک کرنے والے کے نام سے مشہور تھا، اسے ان قیدیوں اور دوسرے مظلوموں کو جنھیں وہ ظالمانہ طریقہ سے قتل کرتا، مرتے وقت ان کی اذیت اور تڑپ دیکھنے میں لطف آتا، وہ اس غرض سے اس کی ضیافتوں کی رونق کے لیے محفوظ رکھے جاتے تھے، ایک بار کسی مہمان نے اس بات پر تعجب ظاہر کیا کہ وہ ایسی موت سے مرنے والے کے جسم کی بو کیسے برداشت کرتا ہے تو اس نے اس مہمان کو فوراً سولی پر چڑھا دیا اور حکم دیا کہ سولی کا کھمبا دوسروں سے زیادہ بلند رکھا جائے جس کی بو کی شکایت مہمان نے کی ہے تاکہ اس کی تکلیف اسے نہ پہونچے۔

(ایور سلےص ۹۵، تاریخ دولت عثمانیہ ج اص ۱۳۷)

یہ کوئی دعویٰ نہیں کرسکتا ہے کہ تمام عثمانی فرماں روا فرشتے بن کر حکومت کرتے رہے اوران میں بشری کمزوریاں نہیں تھیں لیکن یہ وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اپنے پورے دور حکومت میں وہ سفا کی، بہیمیت اور خوں ریزی نہیں کیں جو ۱۵۹۴ء میں ٹرانسلونیا یا روسیوں نے ۱۷۷۳ء میں شوملہ یا اس کے بعد کیتھرائن کے زمانہ میں یونان یا روسیوں نے اوکزاکوف کی فتح کے موقع پر یا نپولین اعظم نے ۱۷۹۸ء میں مصر میں یا ۱۸۲۱ء میں عیسائیوں نے یا پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں خود عیسائیوں نے یورپ کے عیسائیوں پر اور پھر ایشیا میں ہیروشیما اور ناگاساکی میں یا امریکن عیسائیوں نے ویٹ نام میں کیں، ویسی مثالیں مسلمانوں کی تاریخ میں نہیں ملیں گی۔

پھر گذشتہ اوراق میں یورپ کی مسیحی حکومتوں نے عثمانی سلطنت کے ساتھ جو کچھ کیا، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کون زیادہ ظالم اور غیر روادار رہا، عثمانی حکومت یا مسیحی حکومتیں، مسلمان یا عیسائی، پھر بھی مسیحی مورخوں میں ولیم میلر اپنی کتاب دی اوٹومن امپائر اینڈ اٹس سکسیسرز (۱۹۲۲ء-۱۸۰۱ء) میں لکھتا ہے کہ کسی غیر متعصب مشاہد کو اس میں شک نہیں ہوسکتا کہ عثمانیوں سے یورپ کے مشرقی علاقوں کی آزادی ایک رحمت ہے (ص ۵۴۶) یہ بات انگریز عیسائی مورخ نے اس وقت لکھی جب انگریزوں نے اپنی سامراجی حکومت سے پورے ہندوستان کو غلام بنا کر رکھ چھوڑا تھا ان کا قبضہ ایشیا کے بہت سے علاقوں پر تھا، افریقہ میں روڈیشیا اور جنوبی افریقہ میں ان ہی کا سامراجی جھنڈا لہرا رہا تھا، فرانس، الجزائر اور تونس پر قابض تھا، پرتگالی ہر جگہ جوع الارض کی تسکین میں لگے ہوئے تھے، ولندیزی انڈونیشیا پر مسلط تھے، روسیوں نے پورے وسط ایشیا کو اپنا غلام بنالیا تھا اور یہ مسیحی قوتیں جہاں رہیں وہاں کے مذہب، کلچر، تمدن اور تاریخ کو بگاڑ کر اپنی مطلب برآری اور سیاسی استحصال کی فکر میں لگی رہیں، کیا ان ساری باتوں کو رحمت الٰہی تصور کیا جائے گا؟

مسیحی عورتوں کی سازش: عثمانی فرماں روا اپنی رواداری اور فراخ دلی میں مسیحی عورتوں سے شادی کر کے ان کو اپنے حرم میں داخل کر لیتے مگر ان کو اس کی خبر نہ ہوتی کہ مسیحی فرماں روا

اپنی لڑکیاں ان کو نذر کر کے ان کے حرم کے اندر بھی تخریبی سازشیں کر کے ان کی حکومت کو نقصان پہونچاتے، بازنطینیوں نے اورخان کو یونانی شہزادی تھیوڈرا نذر کیا، بایزید اول کی محبوبہ سرویا کی شہزادی ڈیسپنا بن گئی اور پھر یونانی، سلانی، اطالوی اور روسی عورتیں بھی ان کے حرم میں داخل ہوتی رہیں، جب تک یہ سلاطین اپنی بیدار مغزی سے کام لیتے رہے ان سے زیادہ نقصان نہیں پہونچا، جیسا کہ سر والنٹائن چیرول کے اس تبصرہ سے ظاہر ہوگا، وہ لکھتا ہے:

''دس نسلوں تک عثمانی خاندان میں ایسے لائق حکمراں پیدا ہوتے رہے جو اپنی فوج کی رہنمائی کر کے میدان جنگ میں کامرانی حاصل کرتے اور پھر نظم ونسق اور تدبر میں بھی اپنی لیاقت کا ثبوت دیتے رہے، جس طرح ایک خاندان میں باپ بیٹے نے اپنی اعلیٰ کارگذاری دس نسلوں تک دکھائی اور جس کی انتہا سلیمان اعظم کی ذات میں پہونچ گئی تھی، اس کی مثال تاریخ میں نہیں، عثمانی نسلاً خالص ترک تھے لیکن ان کے خون میں آمیزش ہونے لگی، آگے چل کر سلاطین کی مائیں یا تو جنگ کی قیدی ہوتیں یا اپنی خوبصورتی کی وجہ سے محل میں داخل کرلی جاتیں، ان میں ہر قسم کی عورتیں ہوتیں، یونانی، سلانی، اطالوی اور روسی، اس کے باوجود دس نسلوں تک اس آمیزش سے سلاطین کے اچھے نہ ہونے میں زیادہ اثر نہ پڑا، تین سو برس تک اس خاندان کا وقار بڑھتا رہا، وہ ایک امپائر کے بانی ہوگئے، وہ اچھے نظم ونسق کرنے والے بھی ہوئے، اچھے سپہ سالار بھی ہوئے جو اپنی فوجوں کو فاتح اور کامران بناتے رہے، ان کے کارناموں سے خود عثمانی متاثر ہوئے اور وہ اب تک یاد کیے جاتے ہیں، گو بعد میں اس خاندان میں نااہل فرماں رواؤں کی ایک لمبی فہرست بھی ہے لیکن اس پر چوں و چرا کرنے کی گنجایش نہیں کہ اس امپائر کی تاسیس اور ترقی اس خاندان کے فرماں رواؤں کی ذاتی خوبیوں کی وجہ سے ہوئی۔'' (دی ٹرکش امپائر ص ۴۳۰-۴۲۹)

محمد دوم فاتح کے حرم میں ایک فرانسیسی خاتون تھی، وہ قسطنطنیہ میں فاتح کی حیثیت

سے داخل ہوا تو اسی خاتون کے اشارے سے اس نے شروع میں بڑے مظالم کیے۔ (دی اوٹومن ٹرکش از ای. ایس. کریسی ص ۱۲۹)

مگر سلیمان اعظم جیسے بیدار مغز اور طاقتور فرماں روا پر ایک روسی بطریق کی لڑکی روکسے لینا ایسی چھا گئی کہ اس نے عثمانی سلطنت کی فرماں روائی کا رخ ہی بدل دیا، سلیمان اعظم اور اس کے معاشقہ کا حال فیرفیکس دونی نے اپنی کتاب گرینڈ ٹرک میں بڑے رومانی اور ڈرامائی انداز میں لکھا ہے، اس کا لب لباب یہ ہے کہ اس نے اپنے نالائق اور عیش پسند لڑکے سلیم کو تخت کا جانشین بنانے کی خاطر سلیمان اعظم کے بڑے ہی لائق اور کارگزار بیٹے مصطفیٰ اور اس کے ایک بھائی کو سلیمان اعظم ہی کے ذریعہ سے قتل کرایا۔ مورخوں کا خیال ہے کہ سلیمان اعظم کے بعد اگر مصطفیٰ جانشین ہوتا تو سلیمان اعظم کی شاندار روایات باقی رہتیں مگر سلیم سلیم ثانی بن کر تخت پر بیٹھا تو اس وقت سے تخت و تاج کا رنگ بدلنے لگا۔

مراد ثالث کے حرم میں وینس کے مشہور سر برآوردہ خاندان بفو کی رئیس زادی داخل ہوئی تو وہ مراد ثالث پر ایسی حاوی ہوگئی کہ وینس نے ایک سے زائد بار سلطان کو برانگیختہ کیا لیکن اس رئیس زادی کی وجہ سے جنگ کی نوبت نہ آئی، اس نے اپنے لڑکے کی جانشینی کے لیے، اس کے انیس بھائیوں اور سات کنیزوں کا قتل کرایا۔ (دی اوٹومن ٹرکش از ایڈورڈ کریسی ج ا ص ۶۹ - ۳۶۸) اس کی ایک اور بیوی ہنگری کی تھی جس کی وجہ سے بھی حکومت میں پیچیدگی پیدا ہوتی رہی۔ (ٹرکی از اسٹینلی لین پول ص ۲۱۳)

ترکوں کی خوبیاں: ایڈورڈ کریسی نے اپنی کتاب دی اوٹومن ٹرکش میں عثمانیوں کی حکومت اور حکمرانی کے مختلف پہلوؤں پر جلد اول باب ۶ میں اپنا تبصرہ کیا ہے مگر اس میں بھی عیسائیت کے تعصب میں اس کا قلم جا بہ جا بچھو کا ڈنک بن گیا ہے مگر عثمانیوں کی حکومت کے روشن پہلوؤں کا ذکر بھی یا تو مجبوراً یا اضطراراً اس کی تحریروں میں آ گیا ہے، اس کے نیش عقرب کو نظر انداز کرتے ہوئے، جہاں جہاں ترکوں کے محاسن اس تبصرہ میں آ گئے ہیں، ان کے کچھ اقتباسات ہم یہاں پر پیش کرتے ہیں تاکہ ان کی رواداری کا مزید اندازہ ہو جائے، واضح رہے کہ اس کی یہ تحریریں ۱۸۵۴ء کی ہیں۔

وہ اپنے زمانہ کے ترکوں کے بارہ میں لکھتا ہے کہ وہ سپاہیانہ اوصاف سے متصف اور بلند حوصلہ قوم ہے، ان کو اپنے مذہب سے پورے طور پر لگاؤ ہے اور اپنی قومی عزت کے معاملہ میں بڑے حساس واقع ہوئے ہیں (ج ا ص ۱۵۹) وہ اپنے استاد کی بڑی عزت کرتے ہیں، ایسی عزت عیسائیوں کے اسکولوں میں نہیں ہوتی (ج ا ص ۱۷۲) ان کے جاگیردارانہ نظام کے باوجود ان کی عیسائی رعایا ان یہودیوں سے زیادہ بہتر حال میں رہی جو عیسائی حکومت کے ماتحت تھے، جب عثمانیوں کا زوال شروع ہوا تو عیسائی رعایا کے ساتھ بدامنی کی وجہ سے مظالم ضرور ہوئے لیکن یہ حکومت کی زوال پذیری کی وجہ سے عمل میں آئے، ان کے قوانین میں خرابی نہ تھی جو ان کے لیے ان کے عہد عروج میں وضع کیے گئے تھے (ج ا ص ۴-۱۷۳) وہ اپنے غلاموں سے اچھا سلوک کرتے، ان کے یہاں غلاموں کے ساتھ ظلم کرنا، ان کو ضرورت سے زیادہ سزا دینا ان کے ساتھ ظالمانہ طور پر پیش آنا قانوناً منع تھا، ان کا قرآن بھی ان کو یہی تعلیم دیتا ہے اور غلام کو آزاد کردینے میں ثواب عظیم کی بشارت دیتا ہے اور جب غلام آزاد کردیا جاتا تو وہ سلطان کی ہر رعایا کے برابر ہوجاتا، اسی لیے آزاد کیے ہوئے غلام بڑے بڑے جنگی اور ملکی عہدوں پر فائز ہوئے اور سلاطین بھی ان کی صلاحیت اور قابلیت کے لحاظ سے ان کو بڑے بڑے عہدوں پر مامور کرتے رہے۔ (ج ا ص ۱۷۴)

کریسی اس کا بھی اعتراف کرتا ہے کہ ترک سلاطین نے جبری طور پر کسی سے اسلام قبول نہیں کرایا، ان کے دربار میں ترقی کرنے کے لیے خاندانی وجاہت کی کوئی قید نہ تھی۔ دولت، امتیاز اور اقتدار ان کو حاصل ہوتا جو بہادر اور شجاع ہوتے، عیسائی باشندوں کے لیے یہی بڑی ترغیب ہوتی جو ان کو عیسائیوں کی حکومتوں میں حاصل نہ تھی، وہ بہادر اور شجاع بھی ہوتے تو عیسائیوں کی حکومتوں میں ان کو آگے بڑھنے کا موقع نہ ہوتا، اس کے لیے یا تو وہ خود قصوروار ہوتے یا ان کے ہم مذہب ان کو بڑھنے نہ دیتے، اس لیے ان کو خیال ہوتا کہ اگر وہ اسلام قبول کرلیں تو وہ اپنی صلاحیتوں سے پورا فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اسی لیے وہ اسلام قبول کرلیتے، خصوصاً جب ترکوں کی حکومت اپنے عروج پر تھی تو عیسائی خود اسلام قبول کرنے کی طرف مائل ہوتے گئے اور انھوں نے بڑے بڑے عہدے حاصل کیے،

سلیمان اول اور سلیمان ثانی کے دور کے درمیان جو وزرائے اعظم ہوئے ان میں آٹھ نومسلم عیسائی تھے، اسی زمانہ میں کم سے کم بارہ بہترین جنرل اور چار مشہور ترین ایڈمرل کروشیا، البانیا، بوسنیا، یونان، ہنگری، سلیریا اور روس کے عیسائی علاقہ سے تھے، یہ لوگ مسلمان ہوجاتے تو ان کو عیسائیوں سے اس بات کا خطرہ نہ ہوتا کہ وہ اپنے نئے آقاؤں کو اپنی سرگرمیاں دکھائیں، ایڈورڈ کریسی کو دکھ ہے کہ وہ اپنے پرانے مذہب مسیحیت کے دشمن بنے رہے، اس طرح عیسائیوں کی طرف سے عثمانیوں کو لائق ترین، غیر متامل اور خطرناک سردار ملتے رہے۔ (ج اص ۱۷۵)

کریسی کا تجزیہ ہے کہ ترکوں کو اپنی فتوحات کی کامرانی کی وجہ سے برتری کا احساس پیدا ہوتا گیا، اس احساس کے ساتھ ان کے عادات و اطوار اور خودداری میں بھی فوقیت پیدا ہوتی گئی ان کی سچائی، دیانت داری اور انصاف پسندی میں بھی اضافہ ہوا، ان میں شرافت اور انسان نوازی بھی بڑھتی گئی، ان کے ان اوصاف کا اعتراف ان کے شدید دشمن بھی کرتے اور جو بیرونی سیاح وہاں گیا ان کے ان اوصاف کا مداح رہا، یہ کہنا بھی بالکل صحیح نہیں کہ ان میں یہ خوبیاں ان کی فاتحانہ کامرانی اور حاکمانہ کامیابی کی وجہ سے تھیں بلکہ یہ ساری باتیں ان کے زوال کے زمانہ میں بھی دیکھی گئیں، ان کی یہ خوبیاں زیادہ تر ان کی مذہبی تعلیمات کی وجہ سے تھیں، ان کا مذہب ان کو سنجیدگی، صفائی پسندی، بلند حوصلگی، دینت داری اور لوگوں کے ساتھ نیکی کرنے اور ان کی مدد کرنے کی تعلیم دیتا ہے، بشرطیکہ یہ تعلیم سچائی کے ساتھ حاصل کی جائے۔ (ج اص ۱۷۷) کریسی یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ اناطولیہ اور رومانیہ کے ترک بڑے عالی دماغ، فیاض اور اپنی خانگی زندگی میں اپنی مثال آپ ہوتے مگر ترکوں میں ایسے نمونے بھی ملتے ہیں کہ ان کو پاشا کا جب اقتدار حاصل ہوجاتا تو وہ ظالم اور عیاش بھی ہوجاتے لیکن وہ اس کا بھی اعتراف کرتا ہے کہ جب عیسائی نومسلم ہوکر بڑی تعداد میں ترک بن گئے تو وہ اپنی اصلی خرابیاں بھی ساتھ لائے اور لڑائیوں میں بربریت، سفاکی اور خوں ریزی ان کے ساتھ رہنے کی وجہ سے بھی ہوتی رہیں، ورنہ ترک اپنی روزمرہ کی زندگی میں پرامن، نرم دل اور مہربان ہوتا۔ (ج اص ۱۷۸)

ترکوں کا تمدن: ترکوں کی تاریخ پر انگریزوں نے بہت سی کتابیں لکھیں لیکن ان کے تمدنی اور تہذیبی کارناموں کے بیان کرنے میں بخل سے کام لیا ہے، پھر بھی لوسی گارنٹ نے ٹرکش لائف ان ٹون اور کنٹری اور لارنٹ نے ترکی کی تاریخ بیسویں صدی میں اور دوسرے مصنفوں نے جو کچھ لکھا ہے ان کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے مکانوں کی تعمیر کے لیے خوبصورت مقامات پسند کرتے، جہاں درختوں کا سایہ ہو، ٹھنڈے چشمے ہوں، وسیع میدان ہوں، خوبصورتی کے لحاظ سے بے مثل ہوں، ان کو حمام بہت پسند تھا، رفاہی عمارتوں میں حمام ہوتے، وہ شراب نہیں پیتے تھے، ہر قسم کی شراب سے کامل اجتناب کرتے، اسلام نے انھیں جسمانی حیثیت سے ایک صاف ستھری قوم بنادیا ہے، غریب سے غریب ترک میں بڑی صفائی ہوتی، جن سے ان کے عیسائی پڑوسی سبق لیتے، ان کے یہاں وہ اجڈپن اور وحشیانہ پن بہت کم پایا جاتا جو مغرب کے شہروں میں عام طور پر پایا جاتا ہے، قسطنطنیہ میں غیر ملکی عورتیں کامل حفاظت کے ساتھ سڑک کے ایک طرف سے دوسری طرف جاسکتیں لیکن سالونیکا میں جو یورپ میں واقع ہے معمولی حالات میں بھی کوئی خاتون کسی شریف آدمی یا ملازم کے بغیر باہر نکلنے کی ہمت نہیں کرتی۔ ڈاکہ، نقب زنی، یہاں تک کہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کی چوری بھی ترکوں کے یہاں مطلق نہیں، ترکی میں کنیزیں مغرب کی خانگی خادماؤں سے بہتر حالت میں ہوتیں، وہ خاندان کی عورتوں کے ساتھ وتفریح میں برابر کی شریک رہتیں، ان کو دیکھ کر بیرونی لوگوں کو غلط فہمی ہوتی کہ ترکوں میں تعدد ازواج کی کثرت ہے، غلاموں کی حالت بھی اچھی ہوتی، وہ آزاد کردیا جاتا تو آزاد ہونے سے انکار کردیتا اور اسی گھر میں مستقل طور پر قیام اختیار کر لیتا اور چھوٹے بچوں کا محافظ ہوجاتا، ترکوں کی دلیری، راست بازی، فرماں برداری اور پرہیز گاری سے ترکوں کے عیسائیوں نے بہت کچھ سیکھا ہے، اگر کوئی ترک سڑک پر کسی عورت سے ملتا ہے تو اس کی طرف سے منھ پھیر لیتا ہے، اس کو گھور کر دیکھنا ممنوع سمجھا جاتا ہے، کسی ترک کے لیے سب سے بڑی ذلت یہ ہے کہ کسی عورت پر ہاتھ اٹھائے۔ (مزید تفصیل کے لیے دیکھو تاریخ دولت عثمانیہ جلد دوم باب آخر)

ایسا بھی وقت آیا کہ ترکی کا تمدن یورپ پر حاوی ہوگیا، ایک انگریز مورخ گیسٹن

گیلارد نے اپنی کتاب دی ٹرکش اینڈ یورپ میں لکھا ہے کہ یورپ اپنے آرٹ میں ٹرکش امپائر کے مشرقی باشندوں ہی سے استفادہ کرتا، اٹھارہویں صدی کے آخر تک جو چیز ترکوں کی ہوتی وہی فیشن میں داخل ہوجاتی حتی کہ موسیقی اور مصوری میں بھی ترکوں ہی کا اسٹائل پسند کیا جاتا، ان کے لباس کی وضع قطع اور شان وشوکت کی بھی نقالی کی جاتی، ترکوں کی ہر چیز فیشن میں داخل ہوجاتی۔ (ص ۲۷-۲۵، ۱۹۲۱ء ایڈیشن)

مگر ترکوں کی اس اعلیٰ متمدن اور مہذب زندگی کا اعتراف کرنے کے بجائے سر ولنٹائن چیرول نے عثمانی سلطنت سے مسلمانوں کے خلیفہ کے عہدہ کے ختم ہوجانے پر یہ لکھ کر اپنی خوشی کا اظہار کیا ہے کہ اچھا ہوا یہ خلافت ترکوں کے مضبوط لیکن وحشیانہ اقتدار سے نکل گئی۔ (دی ٹرکش امپائر ص ۴۶۶)

قدرت کا انتقام: یورپ کے عیسائیوں نے اپنے وحشیانہ تعصب اور ظالمانہ عدم رواداری میں ایک طاقتور اور متمدن امپائر کو دنیا کی پہلی جنگ عظیم میں ضرور ختم کیا، مگر قدرت نے ان سے پورا انتقام بھی لیا کیونکہ اس جنگ میں یورپ کی جو بربادی ہوئی اس کی تصویر انگریز مورخوں نے اس طرح کھینچی ہے:

> پہلی جنگ عظیم میں صرف فرانس کو جو نقصان پہونچا اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ اس کے تیرہ لاکھ چونسٹھ ہزار آدمی مارے گئے، سات لاکھ چالیس ہزار آدمی جسمانی حیثیت سے بیکار ہوگئے، بیس لاکھ آدمی زخمی ہوئے، پانچ لاکھ جرمنوں کے ہاتھوں قید ہوئے اور جب وہ قید سے لوٹے تو یا تو وہ بیمار تھے یا اتنے کمزور ہوگئے تھے کہ کسی کام کے نہیں رہ گئے تھے، جو سپاہی ہلاک ہوئے ان میں ستاون فی صدی وہ تھے جن کی عمریں اٹھارہ سے تیس سال کے درمیان میں تھیں۔ (موڈرن یورپ سی. ڈی ہیزن ۶۲۱، ۱۹۷۹ء ایڈیشن)

مشہور مورخ ایچ. جی. ویلس نے لکھا ہے کہ اس جنگ میں ایک کرور آدمی تو میدان جنگ میں مارے گئے، دو کرور کی جانیں زمانہ کے مصائب میں تلف ہوئیں، تین کرور طرح

طرح کی مصیبتوں میں گھرے اور اچھی غذاؤں سے محروم رہے۔(دی آوٹ لائن آف دی ہسٹری آف ورلڈ ص ۷۰)

عیسائیوں سے قدرت کا مزید انتقام: یورپ کے عیسائی اور خصوصاً انگریز خوش تھے کہ ٹرکش امپائر کا خاتمہ کر دیا گیا مگر ان عیسائیوں اور خصوصاً انگریزوں کے خلاف جو نفرت پھیلی اس کا خمیازہ ان کو بھگتنا پڑا، انگریزوں کو غرور تھا کہ امریکہ، کنیڈا، آسٹریلیا، ایشیا اور افریقہ میں ان کے اتنے مقبوضات ہیں کہ ان کے امپائر میں کبھی آفتاب غروب نہیں ہوتا مگر امریکہ تو ان کے تسلط سے بہت پہلے نکلا، کنیڈا اور آسٹریلیا بھی ان کے زیر نگیں نہیں رہے اور جب انگریزوں نے ٹرکش امپائر کو ختم کیا تھا تو اس کے پچیس تیس برس کے بعد ہندوستان ان کی غلامی سے آزاد ہو گیا، اس کا رقبہ ٹرکش امپائر سے کم نہ تھا پھر ایشیا اور افریقہ کے مقبوضات ان کے تسلط سے آزاد ہو گئے، آئر لینڈ بھی ان کے خلاف ہو گیا، جس کی تقسیم کرا کے شمالی آئر لینڈ کو برطانیہ کی حکومت کے ماتحت کر دیا، رفتہ رفتہ وہ برطانیہ کے جزیرہ میں اسی طرح سمٹ گئے، جس طرح ترکی اپنے علاقہ میں سمٹ گئے، ٹرکش امپائر کے سقوط کا بدلہ برٹش امپائر کے خاتمہ میں مل گیا، اسی طرح فرانسیسیوں کے قبضہ سے مراکش، الجزائر اور تیونس بھی آزاد ہو گئے، دلندیزیوں سے انڈونیشیا علاحدہ ہو گیا، البتہ روس کا آہنی پنجہ وسط ایشیا کے مسلمانوں کے علاقوں پر ابھی تک مسلط ہے مگر ترکوں کے امپائر کو ختم کرنے کے باوجود عیسائیوں کے مسلمانوں کے خلاف غیض وغضب کی آگ ٹھنڈی نہیں ہوئی ہے، انھوں نے عربوں کو ٹرکش امپائر سے علاحدہ کر کے مشرق وسطی میں ان کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں ضرور بنوادیں مگر اب ان کو خوف ہے کہ کہیں یہ متحد ہو گئیں تو عیسائیوں اور ان کی حکومتوں کے لیے ٹرکش امپائر سے زیادہ خطرناک ہو جائیں گی، خصوصاً جب وہ پٹرول کی وجہ سے بہت مالا مال ہو رہی ہیں، خود پٹرول عیسائیوں کے لیے مہلک ترین اسلحہ ہے، اس لیے یورپ اور پہلی جنگ عظیم کے بعد امریکہ کی عیسائی حکومتوں کی فریب کارانہ سیاست دوسری شکل میں نمودار ہوئی اور انھوں نے فلسطین میں یہودیوں اور عربوں کا تنازعہ پیدا کر کے اس علاقہ کی زندگی کو جہنم بنا دیا ہے، اس کی نوعیت پر بھی ایک سرسری نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔

مسئلہ فلسطین: پہلی جنگ عظیم میں انگریزوں نے ترکوں کی ضد میں فلسطین پر قبضہ کرنا چاہا تو اس کے دعویدار یہودی اور عرب دونوں ہوئے لیکن انگریزوں نے اپنی مفاد پرستی میں دونوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کی، عربوں سے تو وعدہ کیا کہ یہ علاقہ ان ہی کے قبضہ میں رہے گا لیکن نومبر ۱۹۱۷ء میں اعلان بالفور کے ذریعہ فلسطین میں یہودیوں کے قومی وطن کے قیام کا وعدہ کرلیا مگر اسی سال اپنی فوجوں کے ساتھ جنوبی فلسطین پر قابض ہوگئے اور پھر بیت المقدس کو بھی اپنے زیرنگیں کرلیا، وہ پھر اسی خطہ میں ترکی اور جرمنی کی متحدہ فوج سے لڑے، انگریزوں کو فتح ہوئی تو فلسطین کی حکومت ان کی نگرانی میں آگئی اور ۱۹۲۰ء سے وہاں انگریزوں کا ایک ہائی کمشنر رہنے لگا پھر لیف آف نیشنز کی اجازت سے ۱۹۳۳ء میں برطانیہ نے وہاں کی باضابطہ حکومت سنبھال لی، برطانوی اقتدار کے ماتحت اس علاقہ کا کل رقبہ دولاکھ ترسٹھ ہزار مربع میل تھا، ۱۹۳۱ء میں اس کی آبادی تقریباً دس لاکھ تھی مگر اعلان بالفور کے بعد یہودی چوری چھپے یہاں آنے لگے، جس میں انگریزوں نے خفیہ طور سے مدد پہونچائی ۱۹۳۹ء تک ان کی تعداد چار لاکھ ہوگئی، عرب ان کی روزافزوں تعداد سے خوفزدہ ہوئے اور دونوں میں خوں ریز فسادات ہونے لگے، جس کو ہوا انگریزوں نے دی، ان دونوں میں سمجھوتہ کرانے کے لیے لندن میں ۱۹۳۹ء میں ایک گول میز کانفرنس ہوئی لیکن سیاسی سمجھوتہ نہ ہوسکا، بظاہر برطانوی حکومت نے فلسطین میں یہودیوں کے داخلہ کو محدود کردیا جس کی پابندی نہ ہوسکی، یہودیوں کی خفیہ انجمنوں نے دہشت اور تشدد کی کارروائیاں شروع کردیں اور نظام حکومت کو معطل کردیا، حکومت برطانیہ نے بظاہر تنگ آکر یہاں کی حکومت سے دست بردار ہوجانے کا اعلان کیا مگر اس سے پہلے یہاں دو ریاستیں قائم کردیں، ایک عرب اور ایک یہودیوں کی، ۱۹۴۸ء میں وہاں برطانوی حکومت ختم ہوگئی لیکن اسی سال وہاں یہودیوں کی ایک آزاد حکومت ریاست اسرائیل کے نام سے قائم کردی گئی لیکن اسرائیل نے امریکہ کے عیسائیوں کے سرمایہ اور اسلحہ کی مدد سے فلسطین کے عرب علاقوں پر بھی قبضہ کرلیا اور لاکھوں فلسطینی عرب بے گھر ہوکر دوسرے ملکوں میں جاکر پناہ لینے پر مجبور ہوئے پھر یہی یہودی بیت المقدس پر بھی قابض ہوگئے اور اپنی توسیع پسندی میں ۱۹۶۷ء میں مصر اور شام

سے جنگ کی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ مصر اور شام دونوں پر قبضہ کرلیں گے۔ اور اخباروں میں یہ خبر شایع ہونے لگی کہ وہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ تک اپنی حکومت کا دائرہ بڑھا دیں گے مگر وہ مصر کے غزہ کی پٹی اور جزیرہ نمائے سینا پر قبضہ کر کے رک گئے اور شام کی طرف جولان کی پہاڑیوں پر قابض ہو گئے، امریکہ کے طاقتور اسلحہ کی مدد سے یہودیوں کو یہ ساری کامیابی حاصل ہو رہی تھی، امریکہ اور یورپ کے عیسائی خوش تھے کہ ترکوں کی طرح عربوں کے بھی برے دن آ گئے مگر اکتوبر ۱۹۷۳ء میں ایک بار پھر عرب اسرائیل جنگ چھڑ گئی، جس میں عربوں خصوصاً مصریوں نے اپنے متعدد کھوئے ہوئے علاقے واپس لیے مگر فلسطین کا مسئلہ طے نہیں ہوا، فلسطینی عرب اب بھی بے گھر ہیں اور وہ جب اپنے وطن اور ملک کی واپسی کے لیے کوشش کرتے ہیں تو ان پر یہودی امریکہ کے مہلک اسلحہ سے ایسے انتہائی خوں ریز مظالم ڈھاتے ہیں کہ انسانیت کی گردن شرم و ندامت سے جھک جاتی ہے، اسرائیلیوں نے جولائی ۱۹۸۲ء میں لبنان میں فلسطینیوں کے ٹھکانوں پر ایسی بمباری کی کہ بی. بی. سی. (برٹش براڈ کاسٹنگ کارپوریشن) کے بیان کے مطابق تیس ہزار فلسطینی شہید ہوئے، ان کو دفن کرنے کے لیے جگہیں نہیں ملیں تو ایک ایک قبر میں بیس بیس پچیس پچیس لاشیں دفن کی گئیں، جو زندہ بچے وہ اپنی جائے پناہ چھوڑ کر بھاگتے پھرے، ان کے کھانے پینے کے سامان پہونچنے کے راستے مسدود کر دیے گئے، ان کے بچے یتیم، عورتیں بیوہ، بوڑھے بے کس اور نوجوان بے سہارا بن کر اس مشہد اکبر کا منظر دیکھتے رہے اور ان سطروں کے لکھنے کے زمانہ میں شاید ہی کوئی ہفتہ ایسا خالی جاتا ہو جس میں فلسطینی عربوں پر یہودیوں کی بہیمانہ اور سفاکانہ کارروائیوں کی خبر نہ ملتی ہو اور یہ امریکہ اور یورپ کی عیارانہ سیاست کا عجیب کرشمہ ہے کہ بے گھر یہودیوں کو تو ایک وطن دلایا جائے اور جو عرب چودہ سو سال سے جہاں آباد تھے وہاں سے ان کو نکال کر بے گھر اور بے وطن کر دیا جائے، فلسطین میں جو کچھ ہو رہا تھا، اس سے متاثر ہو کر مشہور عیسائی مورخ آرنلڈ ٹوائن بی نے اپنی موت سے بہت پہلے فلسطین کے مسئلہ پر اپنے خیالات کا اظہار اخباروں میں اس طرح کیا تھا کہ ایک مورخ کی حیثیت سے مجھے وہ وقت یاد ہے جب صلیبی جنگ نے عربوں کے لیے ایسے ہی عظیم مسائل پیدا کر دیے تھے، جیسا کہ اسرائیل کے

قیام سے پیدا ہو گئے ہیں، پہلی صورت میں عربوں کا ردعمل فوری نوعیت کا نہیں تھا مگر انجام کار عرب ایک مضبوط اتحاد قائم کرنے اور خود کو درپیش خطرے کا مقابلہ کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے، مجھے اس بات کا یقین ہے کہ موجودہ حالت میں بھی عربوں میں اتحاد کی تحریک ضرور پھیلے گی، جیسا کہ آٹھ سو سال پہلے پھیلی تھی، عربوں کے اتحاد اور نشاۃ ثانیہ سے دنیا کو فائدہ بھی پہونچ سکتا ہے، وہ اپنے دوسرے ساتھیوں کو بہت کچھ دے سکتے ہیں کیونکہ ان کی تہذیبی روایات انسانیت کے مشترکہ خزانہ کا قیمتی سرمایہ ہیں۔

یہ تو ایک مورخ کا بیان ہے مگر امریکہ اور یورپ کے عیسائیوں کو تو یہی فکر ہے کہ جس طرح انھوں نے ٹرکش امپائر کی قوت کو زائل کر دیا، اسی طرح وہ عربوں کی قوت کو بھی کسی نہ کسی طرح زائل کر کے رکھ دیں، بظاہر انسانی ہمدردی میں انھوں نے مظلوم اور ستم زدہ یہودیوں کو ایک وطن، ایک ریاست اور ایک حکومت عطا کر دی ہے اور شاید یہودی بھی خوش ہوں کہ ان کی وجہ سے ان کو وہ سب کچھ مل گیا جس کے لیے وہ ہزاروں برس سے کوشاں اور خواہاں رہے مگر یہ دراصل یہودیوں کو وطن نہیں ملا ہے بلکہ امریکہ اور برطانیہ نے مل کر عربوں کے علاقہ میں اپنی ایک فوجی چھاؤنی عربوں کی سرکوبی کے لیے قائم کی ہے تاکہ ان کو مغلوب، مفلوج اور مرعوب کر کے وہاں اپنی سامراجیت سے ہر قسم کا استحصال کرتے رہیں۔

اس فلسطین کے مسئلہ پر بیروت کی امریکن یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر نابیح امین فارس نے ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ کے بعد ایک لکچر دیا تھا، اس کا اردو ترجمہ ہم یہاں پیش کرتے ہیں جس سے اس تنازعہ کی نوعیت کو اور بھی سمجھنے میں مدد ملے گی۔

میں اپنی گفتگو شروع کرنے سے پہلے دو باتوں کی وضاحت کر دینا چاہتا ہوں، ایک تو یہ کہ میں اپنے پیغمبر کے شہر ناصرہ میں پیدا ہوا، اس لیے مجھ کو اس موضوع سے جذباتی لگاؤ ہے لیکن میں وعدہ کرتا ہوں کہ جو کچھ کہوں گا اس میں پورا فکری رنگ ہوگا، دوسرے یہ کہ اس میں رائے بالکل میری ذاتی ہوگی کسی ادارہ، کسی حکومت، کسی تنظیم حتی کہ میرے خاندان کے خیالات کی بھی نمایندگی نہ ہوگی۔

سوال یہ ہے کہ مشرق وسطی کے بحران کی نوعیت کیا ہے؟ اس کی وضاحت ضروری

ہے، خصوصاً میں ذاتی طور پر اس کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں، اس مسئلہ میں بڑا انتشار پیدا ہو گیا ہے لیکن اس کی اصلی نوعیت بالکل بھلا دی گئی ہے، جس کا ذکر تک اقوام متحدہ میں نہیں آتا ہے، اس کی وضاحت اس کے اصلی تجزیہ سے ہو سکتی ہے۔

یہ موجودہ جھگڑا دراصل عقبہ اور طیران کی بندرگاہوں کا نہیں ہے، ان دونوں بندرگاہوں کا فیصلہ بین الاقوامی عدالت میں ہو سکتا تھا، جہاں یہ بات متعین ہو سکتی تھی کہ یہ علاقائی بندرگاہیں ہیں یا بین الاقوامی بحری راستے ہیں، میرے ایک طالب علم جنھوں نے ایک وکیل کی حیثیت سے ٹریننگ بھی پائی ہے، اپنے ایم۔ اے۔ کے مقالہ میں اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ خلیج عقبہ کا پانی علاقائی ہے لیکن اس بحث کو نظر انداز کیجیے کیونکہ موجودہ بحران کا تعلق خلیج عقبہ اور طیران سے نہیں ہے۔

یہ جھگڑا نہر سوئز کا بھی نہیں کیونکہ ۲۹ / اکتوبر ۱۸۸۸ء کے معاہدہ کی رو سے اس میں امن اور جنگ کے زمانہ میں دنیا کے تمام لوگوں کو پر امن جہاز رانی کی اجازت ہے لیکن اس معاہدہ کی خلاف ورزی برطانیہ نے ایک مرتبہ پہلی جنگ عظیم اور دوسری مرتبہ دوسری جنگ عظیم میں کی، اس وقت مصر درحقیقت اس معاہدہ کی خلاف ورزی نہیں کر رہا ہے، اسرائیل کے علاوہ تمام ریاستوں کے جہاز اس راستہ سے گذر سکتے ہیں، ۱۹۵۶ء میں مصر نے اس نہر کو اپنی قومی ملکیت میں ضرور لے لیا لیکن اس نے اس لیے لیا کہ کسی زمانہ میں وہ اس کے حق سے دست بردار نہیں ہوا تھا، گو یہ ایک بین الاقوامی کمپنی کے ماتحت رہی۔

یہ جھگڑا ناصر کی وجہ سے بھی نہیں ہے، بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ معلوم نہیں کب اس شخص سے نجات حاصل ہوگی جس کی ذات سے سارے جھگڑے ہیں، ایسے لوگ ناصر کی حکمت عملی سے چیں بہ جبیں ضرور ہیں لیکن دراصل جھگڑا ناصر کی وجہ سے نہیں، ناصر مصر کے ساتھ عربوں کی اکثریت کے جذبات کی بھی نمایندگی کر رہے ہیں، دوسرے رہنماؤں کی طرح ان سے غلطی ہوتی رہتی ہے اور ان سے یقیناً چند غلطیاں سرزد ہوئیں، وہ انسان ہیں اور انسان ہی سے خطائیں ہوتی ہیں، وہ مسلمان ہیں اور صرف ایک ہی مسلمان سے کوئی غلطی نہیں ہوتی اور وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں۔

جھگڑا اسرائیل کی مصنوعی ریاست اور عرب ممالک کا بھی نہیں، پرانے اور نئے پناہ گزینوں کا بھی جھگڑا نہیں ہے، ۱۹۴۹ء میں ان کی تعداد نو لاکھ تین ہزار تھی، جون ۱۹۶۷ء سے پہلے ان کی تعداد تیرہ لاکھ پچاس ہزار ہوگئی، اس میں ساڑھے تین لاکھ ان لوگوں کا اور اضافہ ہوگیا ہے جو جون ۱۹۶۷ء میں اسرائیلیوں کی وجہ سے بے گھر ہوگئے لیکن یہ بھی کوئی حقیقی مسئلہ نہیں، یہ پناہ گزیں کسی اور مسئلہ کا شکار ہوکر رہ گئے ہیں۔

اصل مسئلہ خود اسرائیل ہے، جس کو ایک قانونی اور اخلاقی حیثیت دے دی گئی ہے، اس کے علاوہ کوئی اور مسئلہ نہیں ہے، یہ مسئلہ صہیونیت اور صہیونیت کے متعلقات کا ہے لیکن یہ واضح رہے کہ جب میں صہیونیت کہتا ہوں تو اس سے یہودیت مراد نہیں ہوتی، میں سامی النسل ہوں اور عیسائی بھی ہوں اور عیسائی بھی جدید دنیا اور اسلام سے پہلے کا ہوں، عیسائی کی حیثیت سے اس پر یقین رکھتا ہوں کہ دنیا میں وہی باقی رہ سکتے ہیں جو سب سے اچھے ہیں، صہیونیت سے میری مراد یہودیت نہیں کیونکہ یہودیت تو میرے مذہب کا ایک حصہ ہے، صہیونیت تو یہودیت کی نفی کرتی ہے۔

صہیونیت کا آغاز پانچویں صدی قبل مسیح سے ہوتا ہے، اس سے پہلے ان کی تاریخ کا پتہ نہیں، اگر کسی کو شبہ ہو تو وہ انجیل میں عذرا کے نویں اور دسویں باب کا مطالعہ کرے، ان ابواب میں ہٹلر ہی کی طرح نسلی نظریہ کی تنگ نظری اور مجنونانہ تعصب کی تعلیم ہے، صہیونیت کی اسپرٹ ان ہی دو ابواب اور Psalm یعنی مناجات ۱۳۷ پر مبنی ہے، ان ابواب اور مناجات کو منسوب حضرت داؤد سے کیا جاتا ہے حالانکہ اس سے ان کا کوئی تعلق نہیں، مناجات ۱۳۷ کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ صہیونیت کس طرح اب تک اسی کی اسپرٹ سے چپکی ہوئی ہے، اسی لیے وہ شروع ہی سے تنگ نظر، الگ تھلگ اور اپنے ہی میں مرکوز رہنے والا فرقہ ہے۔

موجودہ دور میں صہیونیت انیسویں صدی میں ابھری جب کہ یورپ کے عیسائیوں کے مجنونانہ تعصب سے مجبور ہوکر یہودیوں کے مفکرین نے سامی نسلوں کے خلاف ایک مذہبی اور نسلی قومیت کو ابھارا، عذرا اور Psalm ۱۳۷ کے مصنف یرمیاہ اور میکہ پر غالب

آئے ، یرمیاہ نے باب ۲۹: ۵-۷ میں جلاوطن یہودیوں کو تعلیم اس طرح دی ہے کہ تم اس شہر کی خیر مناؤ جس میں میں نے تم کو اسیر کرواکے بھیجا اور اس کے لیے خداوند سے دعا مانگو کہ اس کی سلامتی میں تمہاری سلامتی ہوگی ، میکہ نے ان کو نصیحت کی تھی کہ تمہارے خداوند تم سے صرف یہ چاہتے ہیں کہ تم عدل پسند بنو ، رحم سے محبت کرو اور اپنے خدا کے ساتھ عجز سے چلو ، لیکن یہ باتیں بھلادی گئیں اور صرف Psalm ۱۳۷ اور عذرا کی باتیں انیسویں صدی کے مفکروں کے ذہن میں رہ گئیں ، جو سامی النسل کی مخالفت کے مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

صہیونیت کو موزز ہس ، لیو پنسکر ، تھیوڈ ہرزل نے فلسفیانہ رنگ دیا ، جس کے بعد یورپ کے یہودیوں نے انفرادی آزادی کو سیاسی پروگرام بنا کر قومیت کی ایک خیالی دنیا بسائی ، صہیونیت کی پہلی عالمگیر کانفرنس ۱۸۹۷ء میں ہوئی جس کے بعد سے جدید صہیونیت دنیا میں چل نکلی اور پھر انہی صہیونیت کے حامیوں نے یہ نقشہ بنایا کہ فلسطین کے وہ وارث ہیں اور یہاں سے عربوں کو بے دخل کرنا چاہیے۔

پہلی جنگ عظیم میں برطانیہ کو اپنے مفادات سامنے تھے ، اس کو خیال پیدا ہوا کہ اگر مصر اس کے اقتدار سے باہر ہو جائے گا تو نہر سوئز پر اس کا قبضہ کس طرح رہ سکتا ہے ، برطانیہ اسرائیلیوں کی طرف مائل ہوا ، جس کے بعد اعلان بالفور کیا گیا ہے ، یہ پہلی بین الاقوامی دستاویز ہے جس سے جدید صہیونیت کو سہارا ملا ، یہ اعلان ۲ رنومبر ۱۹۱۷ء میں ہوا ، اس وقت فلسطین پر برطانیہ کا تو قبضہ نہیں تھا لیکن اس اعلان میں وعدہ کیا گیا کہ فلسطین یہودیوں کا ایک قومی وطن بنادیا جائے گا ، پہلی جنگ عظیم کے صلح نامہ کے زمانہ میں صہیونیت کے حامیوں نے یہ نقشہ بنایا کہ فلسطین کے عرب اپنی سرزمین اور جائداد سے کس طرح دربدر کیے جاسکتے ہیں ، اس میں ان کو برطانیہ کی پوری حمایت حاصل ہوئی ، عربوں نے اس کی مخالفت کی ، ۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۹ء تک کا زمانہ بڑے ہیجان اور تشدد کا رہا ، فلسطین میں بڑے بڑے ہنگامے ہوئے ، بغاوتیں ہوئیں۔

ممکن تھا کہ اس کا کوئی حل نکل آتا لیکن اسی زمانہ میں جنگ چھڑ گئی ، جس سے

ساری دنیا مصیبت میں مبتلا ہوگئی، برطانیہ نے عربوں سے بہت کچھ وعدے کرر کھے تھے، جن کی روشنی ہی میں برطانوی حکمت عملی کی تشکیل ہونی چاہیے تھی اور برطانیہ نے کوئی مصالحت کرانا بھی چاہا لیکن اس کی کوشش اس لیے بارآور نہیں ہوسکی کہ ہٹلر کے نازی ازم کی وجہ سے سارے یہودی جرمنی سے جلاوطن کردئے گئے۔

دوسری جنگ عظیم میں مشرق وسطیٰ میں بھی نیے نیے مسائل پیدا ہو گئے، صہیونیت کی سرگرمیاں یورپ سے منتقل ہوکر امریکہ میں پہونچ گئیں، امریکہ اس وقت تک بین الاقوامی سیاست میں ناتجربہ کار تھا، اس کا بین الاقوامی شعور بھی خام تھا، اس کی خارجہ پالیسی پر جماعتوں اورامریکن ازم کا دباؤ پڑتا رہا، صہیونیت کے امریکہ میں منتقل ہوجانے سے یہ مسئلہ زیادہ سنجیدہ ہوگیا، وہاں صرف دو پارٹیاں ہیں جن کے رہنماؤں نے یہودیوں کے ووٹ حاصل کرنے کی خاطر اس مسئلہ کواور بھی پیچیدہ کردیا۔

امریکہ میں صہیونیت کوزیادہ فروغ ہوا، امریکی یہودی سب کے سب صہیونیت کے حامی نہیں ہیں لیکن صہیونیت کے حامی ہی یہودیوں کے رہنما بھی بن گئے اور یہ رہنما زیادہ تر روس اور مشرقی یورپ کے تھے، جوروسی اور مشرقی یوروپی روایات کے پابند بن کر رہے، یورپ میں دوسری جنگ عظیم میں جو المناک واقعات ظہور پذیر ہوئے تو مذکورہ بالا صہیونی رہنماؤں کی قیادت میں ۱۹۴۲ء میں بلٹمور کانفرنس ہوئی اوران رہنماؤں نے عربوں سے مقاطعہ کی پالیسی اختیار کی اور فلسطین کو یہودیوں کی ریاست بنانے کا مطالبہ کیا۔

دوسری جنگ عظیم ختم ہوئی تو پرانے امپائر کا خاتمہ ہوگیا لیکن روس اور امریکہ کی دو بڑی قوتیں سامنے آئیں، جن پر دنیا کی ساری ذمہ داریاں آگئیں، دنیا کے جمہوری حصوں پر تو امریکہ اور کمیونسٹوں کے علاقوں پر روس کے اثرات ہو گئے لیکن اسی کے ساتھ ادارۂ اقوام متحدہ بھی وجود میں اس لیے آیا کہ وہ تمام لوگوں میں مساوات، خوداختیاریت اورانسانی حقوق اور بنیادی آزادی کے احترام کا جذبہ پیدا کرے، اقوام متحدہ کونسبۃً زیادہ کامیابیاں ہوتیں، اگر دنیا میں ایک طرف سرد جنگ شروع نہ ہوئی ہوتی اور دوسری طرف ماضی کے پرانے امپائر کو کچھ دنوں اور بڑھا کر باقی رکھنے کی کوشش نہ کی گئی ہوتی، ادارۂ اقوام متحدہ ابھی بالکل

ابتدائی دور ہی میں تھا کہ اس کو فلسطین جیسے بہت بڑے مسئلہ کا سامنا کرنا پڑا۔

اس ادارہ نے اس مسئلہ کو ایک نا تجربہ کار مبتدی کی طرح نپٹایا اور پھر اس پر ہر طرح کا دباؤ بھی پڑا، جیسا کہ صدر ہیری ایس ٹرومین اور دوسرے امریکنوں کی خود نوشتہ سوانح عمریوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوگا، اس ادارہ کی سب سے پہلی لیکن عظیم ترین غلطی یہ ہوئی کہ اس کے ذریعہ فلسطین کی تقسیم ہوگئی جو سراسر ناانصافی پر مبنی ہے، جب یہ تقسیم ہوئی تو عربوں کی آبادی ۶۶ فیصد تھی اور صہیونی صرف ۳۳ فیصد تھے، یہ ۱۹۴۷ء کے اعداد و شمار ہیں، ۱۹۲۰ء میں یہودیوں کی آبادی کا تناسب ۱۰ فیصدی تھا اور عرب ۹۰ فیصدی تھے، ۱۹۴۷ء میں عربوں کی ۶۲ فیصدی آبادی کو ملک کا ۴۳ فیصدی حصہ ملا اور ۳۳ فیصدی آبادی والوں کو ملک کا ۵۶ فیصدی دیا گیا اور پھر ستم ظریفی یہ ہوئی کہ یہودیوں کی ریاست میں چار لاکھ نوے ہزار تو یہودی تھے لیکن ان کے ساتھ چار لاکھ ستانوے ہزار عرب بھی کر دئے گئے، ایک ہزار کا فرق دونوں میں رکھا گیا، پھر عرب کے حصہ میں آنے والی ریاست، میں سات لاکھ چوبیں ہزار تو عرب تھے لیکن دس ہزار یہودی تھے، اس طرح متمدن دنیا کی دعائے خیر کے ساتھ فلسطین سے عربوں کے اخراج کی مہم کی سرگرمیوں کا آغاز ہوا۔

اسرائیل کی ریاست ۱۵ رمئی ۱۹۴۸ء کو وجود میں آئی لیکن اسی زمانہ میں ساڑھے تین لاکھ عرب فلسطین سے باہر آتے ہوئے دکھائی دیے، قبل اس کے کہ ادارۂ اقوام متحدہ ان کی مدد کو پہونچے، راشن کارڈ کے حساب سے ان پناہ گزینوں کی تعداد نو لاکھ تین ہزار تین سو ہوگئی۔

اسرائیل ۵۶ فیصدی علاقہ لے کر قانع نہیں ہوا، یہ عربوں کو بے دخل کر کے ۳۰ فیصدی علاقہ اور چاہنے لگا، یہ سوال اکثر پوچھا جاتا ہے کہ ۱۹۴۸ء میں عربوں نے اپنے گھر بار کو کیوں چھوڑ دیا؟ لیکن اس سوال کا جواب اس سوال سے ہوسکتا ہے کہ آخر وہ اپنے گھروں کو واپس کیوں نہیں گئے؟ اگر اس دوسرے سوال کا جواب مل جائے تو پہلے سوال کا جواب خود بخود مل جائے گا۔

ادارۂ اقوام متحدہ میں اسرائیل کے حامی کہتے ہیں کہ یہودیوں نے یورپ میں بڑی سختیاں جھیلیں، یہ بالکل صحیح ہے، میں بھی یہی کہتا ہوں لیکن سوال یہ ہے کہ یورپ کے

عیسائیوں نے ان پر مظالم کیے تو پھر ان کا بدلہ فلسطین کے عربوں سے کیوں لیا جائے، یہودیوں کو یورپ میں کس کس طرح نہ ستایا گیا، یہ کھلی ہوئی تاریخ ہے، ہٹلر کے زمانہ میں یہ مظالم انتہا کو پہونچ گئے، صہیونیت کی تحریک کا آغاز ہٹلر سے پہلے بھی ہو چکا تھا، اس لیے اس کے علمبرداروں کو یہ موقع مل گیا کہ یورپ سے یہودی نکالے گئے ہیں تو پھر فلسطین سے عرب نکالے جائیں تا کہ جو یہودی یورپ کے مجنونانہ تعصب کے شکار ہوئے ہیں وہ آباد ہوسکیں، اب مسئلہ ہے تو یہی ہے، سرحدوں کا جھگڑا دراصل نہیں ہے اور نہ عقبہ، طیران، سویز اور ناصر کے تنازعے ہیں، مسئلہ عربوں کے بے دخل ہونے کا ہے اور یہ ایک اخلاقی مسئلہ ہے جو سیاست اور جنگ کے ذریعہ حل نہیں ہوسکتا، اسرائیل جنگ کے ذریعہ فرات سے نیل تک ایک امپائر قائم کر لینے میں کامیاب ہوگیا تو اس کی سامی نسلوں کی مخالفت جاری رہے گی، کیونکہ اس کے سکہ کے دوسرے رخ پر یہی مخالفت منقوش ہے اور یہ صہیونیوں کی علاحدگی پسندی کا نتیجہ ہے۔

فلسطین میں امن قائم ہونے کے امکانات ابھی دور ہیں، صہیونیوں میں یہ رجحانات نہیں پائے جاتے ہیں کہ وہ عربوں کو ان کی سرزمین سے بے دخل نہ کریں، یہ مسئلہ ان بڑی طاقتوں کی وجہ سے اور بھی پیچیدہ ہوگیا ہے جو اسرائیل کے عزائم کو پورا ہونے سے روک سکتے ہیں لیکن وہ سستے قسم کے سیاسی اسباب کی بنا پر ان کو روکنا نہیں چاہتے ہیں، عرب کے ساتھ جو تھوڑا بہت انصاف کر دیا جاتا ہے اس سے وہ مطمئن نہیں ہوسکتے، یہ صحیح ہے کہ عرب ابھی کمزور ہیں ان میں اتفاق نہیں، وہ شکست کھا کر ذلیل اور پریشان ہیں، یہ بھی صحیح ہے کہ وہ پچھڑے ہوئے ہیں لیکن یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ ایسے ہی برابر رہیں گے، یہ بھی صحیح ہے کہ دنیا کی رائے عامہ ان کے موافق نہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ عرب پناہ گزینوں کے زخم پر کتنا ہی پھاہا رکھ دیا جائے اور عرب اس انسانیت نوازی کو اچھی نظر سے دیکھنے بھی لگیں ان کے پناہ گزینوں کی خواہ کتنی ہی مدد کی جائے عرب اس ناانصافی کو بھول نہیں سکتے جو ان کے ساتھ کی گئی ہے، میری رائے میں اس ناانصافی کو دور، اپنے زخم کو مندمل اور ایک بڑی غلطی کی تلافی کرنے کی خاطر یہ عرب برابر جدوجہد کرتے اور لڑتے رہیں گے اور مجھ کو اس میں شبہ

نہیں کہ آخر میں وہ اس ناانصافی کو دور کرنے میں کامیاب ہو کر رہیں گے، گو میں اس وقت تک اس نتیجہ کو دیکھنے کے لیے زندہ نہ رہوں لیکن میری اولاد اور میری اولاد کی اولاد دنیا کے اس حصہ کی طویل تاریخ میں اسرائیل کی عبرتناک کہانی کا مطالعہ ضرور کر رہی ہوگی۔ (نیز دیکھیے معارف ستمبر ۱۹۶۹ء)

ہندوستان کی مغلیہ سلطنت اور عیسائی: عیسائیوں نے ہندوستان کے مسلمانوں اور ان کے حکمرانوں کے ساتھ جو سلوک کیا اس پر بھی ایک سرسری نظر ڈالنے کی ضرورت ہے، ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں نے یہاں جس مذہبی رواداری کے ساتھ حکومت کی اس کی تاریخ ہم تین جلدوں میں لکھ چکے ہیں، ان تفصیلات کو یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں مگر انگریزوں نے ان کی نرمی، لینت اور فراخ دلی سے جس طرح فائدہ اٹھایا اور پھر یہاں اقتدار پانے کے بعد مسلمانوں پر جو مظالم کیے ان کے کچھ موٹے موٹے واقعات سرسری طور پر یہاں قلمبند کیے جاتے ہیں، ان عیسائی حکمرانوں نے جو یہاں یورپ سے، ہندوستان پر ستم ڈھائے اور جو اقتصادی لوٹ گھسوٹ کی، اس کی پوری تفصیلات تو کے. ڈی. باسو کی رائز آف دی کرسچین پاور ان انڈیا کی پانچ جلدوں اور رمیش چندر دت کی ہندوستان کی اقتصادی تاریخ میں ملے گی، ہم یہاں صرف ان واقعات کی طرف اشارہ کریں گے جن کا تعلق یہاں کے مسلمانوں سے رہا۔

اکبر نے اپنے دربار میں عیسائیوں کو آنے کی اجازت دے رکھی تھی اور اس کے عبادت خانہ میں جو مباحث ہوتے تھے ان میں عیسائی پادری بھی شریک ہوتے، وہ دربار میں انجیل بھی لاتے، اکبر نے اس کا ترجمہ فارسی میں بھی کرایا، یہ پادری عقیدۂ تثلیث کے حق ہونے پر دلیلیں پیش کرتے اور نصرانیت کو سچا مذہب قرار دینے کی کوشش کرتے، بعض اوقات اپنی حد سے بڑھ کر نعوذ باللہ دجال ملعون اور حضرت خیر النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف میں مشابہت بھی دکھاتے، اکبر ان کو خاموشی سے سن لیتا، ان پادریوں نے دربار میں کھلم کھلا عیسائیت کی ترویج بھی کرنی شروع کر دی، شہزادہ مراد نے ان سے کچھ سبق بھی پڑھے، شیخ ابوالفضل کو جب انجیل کے ترجمہ کا حکم دیا گیا تو اس نے بسم اللہ کے بجائے یہ لکھا:

''اے نامی دے ژژو کرستو''

یعنی اے وہ ذات کہ تو بڑا مہربان اور بہت کچھ بخشنے والا ہے، شیخ فیضی نے اس کا دوسرا مصرع یہ کہا:

''سبحا نک لاسواک یاہو''

پادریوں میں یہ غلط فہمی پیدا ہونے لگی تھی کہ اکبر نے عیسائی مذہب قبول کرلیا لیکن جب ان کو معلوم ہوا کہ ایک مسلمان کی حیثیت سے مرا تو ان کو بڑا دکھ ہوا۔

جہانگیر کے زمانہ میں انگلستان کے بادشاہ جیمس اول کی طرف سے ۱۶۱۵ء میں طامس سفیر بن کر آیا تو شاہی دربار میں اس کا بڑا اعزاز کیا گیا اور رفتہ رفتہ وہ جہانگیر سے اتنا قریب ہوا کہ وہ اپنے خلوت کے جلسوں میں بھی اس کو بلایا کرتا تھا، جس کے بعد اس نے بادشاہ سے یہ رعایت حاصل کی کہ انگریزی مال پر کوئی محصول عائد نہ کیا جائے، جہانگیر نے اپنی شرافت اخلاق سے یہ مراعات تو دے دیں مگر کیا معلوم تھا کہ یہ ہندوستان کی غلامی اور مغلیہ سلطنت کے سقوط کا ذریعہ بن جائے گی۔

۱۶۵۰ء میں بنگالہ کے صوبیدار نے انھیں وہاں تجارت کرنے اور ہگلی اور قاسم بازار میں کوٹھیاں بنانے کی بھی اجازت دی، جس سے ان کے حوصلے اور بڑھے پھر اورنگ زیب کے زمانہ تک آتے آتے انھوں نے سورت میں بھی اپنی فیکٹریاں بنالیں، اس وقت تک ان کی ایسٹ انڈیا کمپنی بہت باا ثر ہوتی گئی اور اب یہ کمپنی اپنی تجارت کو محفوظ کرنے کی خاطر پختہ حصار بھی بنانے لگی اور خاموش تجارت کرنے کے بجائے قلعہ بند تجارت کرنے کی طرف مائل ہوگئی، ان کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کو دیکھ کر بنگال کے صوبہ دار نواب شایستہ خان نے اپنے علاقہ میں ان کے مال پر محصول لگادیا تو وہ جنگ کرنے پر آمادہ ہوگئے اور دس جہازوں میں فوج کے دستے انگلستان سے منگوائے، اسی زمانہ میں منتخب اللباب کے مصنف خافی خان کا بیان ہے کہ گنج سوائی نام کے بادشاہی جہاز کو انگریزوں نے لوٹ لیا اور اس کے مسافروں کو برہنہ کرکے تلاشی لی، اس پر جو عورتیں تھیں وہ اپنی بے حرمتی سے بچنے کے لیے سمندر میں کود پڑیں یا خنجر مار کر اپنے کو ہلاک کرلیا، اورنگ زیب کو جب اس کی خبر ملی تو اس نے سورت

کے متصدی اعتماد خان کو حکم دیا کہ انگریز گماشتے قید میں ڈال دیے جائیں اور بمبئی کے جزیرے سے انھیں دربدر کر دیا جائے۔ (منتخب اللباب، ج ۲ ص ۴۲۸-۴۲۱) ہگلی اور قاسم بازار کے انگریزوں کو کوٹھیاں چھوڑنی پڑیں، وہ سورت اور مچھلی پٹم سے نکال دیے گئے مگر انھوں نے مغلوں کے حکام کی رواداری اور نرمی سے پھر فائدہ اٹھایا، انھوں نے ڈیڑھ لاکھ روپے سالانہ ادا کرنا قبول کیا تو پھر ان کو تجارت کرنے کی اجازت مل گئی، انھوں نے بنگال کے صوبہ دار سے تجن گاؤں خرید لیے، جہاں اپنے تجارتی مال کی حفاظت کے بہانے سے چار دیواری تعمیر کرائی جو بعد میں فورٹ ولیم کہلانے لگی اور یہ انگریزوں کی سامراجی سازشوں کا بہت بڑا مرکز بن گیا۔

فرانسیسی بھی ہندوستان کی فضا میں منڈلا رہے تھے، انھوں نے نواب ارکاٹ سے ہر قسم کے فوائد حاصل کیے لیکن جب ان کی قوت بڑھنے لگی تو انگریز خوف زدہ ہوئے، فرانس کا فرماں روا نپولین اعظم تو اپنی فتوحات کے غرور میں یہ بھی ارادہ رکھتا تھا کہ مصر کو فتح کرتا ہوا وہ مشرق پہونچے اور وہ ایسا مشرقی امپائر قائم کرے جس میں ہندوستان بھی شامل ہو، اس خطرہ کو محسوس کر کے انگریز اس سے بھی برسرِ پیکار ہوئے اور واٹرلو کی جنگ میں اس سے لڑ کر اس کو قیدی بنایا اور سینٹ ہانا بھیج کر اس کو ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے پر مجبور کیا، وہ فرانسیسیوں سے برابر لڑتے رہے، دکن میں نواب نظام الملک آصف جاہ، نواب ناصر جنگ، مظفر جنگ، چندا صاحب و نواب صلابت جنگ پہلے فرانسیسیوں کی ریشہ دوانیوں کے شکار رہے، ۱۷۵۱ء میں کلائیو نے ارکاٹ پر حملہ کیا اور اس پر قابض ہو گیا اس کے بعد وہ فرانسیسیوں سے برابر لڑتے رہے۔

کلائیو کو بنگالہ میں بھی اس کی چالبازیوں سے کامیابی حاصل ہوئی، ۱۷۵۲ء میں نواب علی وردی خان کے بعد اس کا نواسہ سراج الدولہ جانشین ہوا، مغلیہ سلطنت کی کمزوری کی وجہ سے نواب علی وردی خان نے بنگالہ میں خود مختار ریاست قائم کر لی تھی، نواب سراج الدولہ کے مخالفوں کی حمایت انگریز کرنے لگے تو سراج الدولہ نے ان کے خلاف لشکر کشی کی مگر یہ انسانی تاریخ کا بہت ہی شرمناک واقعہ ہے کہ انگریزوں نے سراج الدولہ کے درباریوں

میں سے امی چند اور میر جعفر کو غداری کرنے پر آمادہ کیا، امی چند سے ایک فرضی اور جھوٹا وعدہ کیا کہ وہ اس کو تیس لاکھ روپیے دیں گے اور میر جعفر کو بنگال کا حاکم بنانے کا وعدہ کیا، سراج الدولہ اور انگریزوں سے لڑائی ہوئی، آخر میں جعفر کی غداری سے وہ ہارا اور مارا گیا، میر جعفر کو بنگال کا حاکم بنایا مگر اس کو بیس لاکھ روپیے تو صرف کلائیو کو نذرانہ دینے پڑے اور پھر ایسٹ انڈیا کمپنی کے اور عہدیداروں کو بھی بے شمار روپیے دیے، کشتیوں میں بھر بھر کے روپیے اور زر و جواہرات کلکتہ بھیجے گئے، چوبیس پرگنہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے حوالہ کردیا گیا، میر جعفر بنگال کا حاکم تو بن گیا مگر جب انگریزوں کو دکن میں کامیابی حاصل ہوئی اور ولندیزیوں کو بنگال سے نکال دیا تو انھوں نے میر جعفر کو تنگ کرنا شروع کیا جو انھیں روپیے دیتے دیتے تھک چکا تھا، اس نے بردھان، مدناپور اور چاٹ گام کے علاقے بھی اپنی نوابی کی خاطر دے دیے تھے مگر پھر بھی انگریز اس سے مطمئن نہ تھے اور اس کو علاحدہ کرکے اس کے داماد میر قاسم کو بنگال کا حاکم بنایا مگر کچھ دنوں کے بعد انگریز اس کے بھی خلاف ہوگئے اور جب وہ پٹنہ کے مقام پر ان سے لڑا تو شکست کھا گیا کیونکہ انگریزوں نے اس کے حامیوں کو بھی اس سے غداری کرنے پر آمادہ کرلیا پھر میر قاسم نے ادھر ادھر پناہ لے کر دہلی کے پاس اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کردی، انگریزوں کی قوت بڑھ رہی تھی تو انھوں نے دہلی کے حکمراں شاہ عالم سے ٹکر لی اور ۱۷۶۴ء میں بکسر کی لڑائی میں اس کو شکست دی اور جب صلح ہوئی تو انگریزوں نے بنگال، اڑیسہ اور بہار لے کر چھبیس لاکھ روپیے سالانہ کی مال گذاری ادا کرنے کا وعدہ کیا، اس کے بعد ان کی آویزش مرہٹوں سے ہوئی اور وہ ان کو بھی شکست دیتے رہے، ۱۷۸۱ء تک آتے آتے انگریزوں کا قبضہ احمد آباد، گوالیار سین اور پونا پر ہوگیا، گو آگے چل کر مرہٹوں نے یہ علاقے ان سے واپس لے لیے، ان لڑائیوں میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے اخراجات کافی ہورہے تھے، سرمایہ کی کمی ہوئی تو انگریزوں نے راجہ بنارس کا استحصال شروع کیا، اس راجہ سے بائیس لاکھ روپیے سالانہ لے کر انگریزوں نے اس کو اپنی پناہ میں لے لیا تھا اس رقم کو بڑھانے پر اصرار کیا تو اختلاف ہوگیا انگریزوں نے اس کو معزول کردیا اور اس کے خاندان کے ایک دوسرے فرد کو بٹھا کر سالانہ خراج کی رقم بڑھادی پھر بھی ان کے اخراجات

پورے نہیں ہوئے تو انھوں نے نواب اودھ کی طرف نظر اٹھائی، ان کی ایک امدادی فوج اودھ میں متعین تھی، اس کے مصارف نواب کے ذمہ تھے جو نواب سے باقاعدہ ادا نہیں ہوئے تو انگریزوں نے ان کی بیگمات کے زیورات، جواہرات، مال ومتاع اور جاگیریں چھین لیں۔

ارکاٹ پر بھی انگریز اپنی چالبازیوں سے مسلط ہو گئے تھے، وہاں کے نواب محمد علی کو اپنا باج گذار بنا لیا تھا اور وہاں جو اپنی فوج رکھ چھوڑی تھی اس کے مصارف نواب محمد علی کمپنی ہی کے ملازمین سے سودی روپیہ قرض لے کر ادا کر رہا تھا اور اس سودی قرض کے عوض کوئی پرگنہ یا علاقہ رہن رکھ دیتا تھا بالآخر انگریزوں نے اس کو بھی مجبور کر کے ارکاٹ کی ریاست کی مال گذاری کو وصول کرنے کا اختیار اپنے ذمہ لے لیا اور اس کو اس کے خانگی مصارف کے لیے کچھ رقمیں دینے لگے۔

اب وہ میسور کی طرف متوجہ ہوئے، اس کے فرماں روا سلطان حیدر علی کو تو وہ اپنی لڑائیوں میں زیر نہ کر سکے لیکن ۱۷۹۹ء میں انگریزوں نے سرنگا پٹم میں سلطان ٹیپو سے لڑ کر اس کو بے دردی سے شہید کیا، سلطان بھی بڑی جانبازی سے ہاتھ میں تلوار لیے جان بحق ہوا، یہ لڑائی لارڈ ویلزلی کے زمانہ میں ہوئی جس کے بعد وہ فخر سے کہا کرتا تھا کہ ہندوستان اپنے امن وامان کی خاطر پورا ملک انگریزوں کے حوالے کر دے اسی میں یہاں کے لوگوں کی فلاح و بہبود ہے، اسی بہانے انگریزوں نے دکن کے نظام الملک سے ۱۸۰۰ء میں معاہدہ کیا کہ ریاست حیدر آباد میں انگریزوں کی جو فوج وہاں کی حفاظت کے لیے متعین ہے، اس کی تعداد بڑھادی جائے اور اس کے مصارف کے لیے وہ تمام علاقے ایسٹ انڈیا کمپنی کے حوالے کر دیے جائیں جو سلطنت میسور کی تقسیم کے وقت نظام الملک کو دیے گئے تھے پھر ارکاٹ یعنی کرناٹک کے نواب محمد علی کی وفات ہوئی تو پہلے اس کا بیٹا ۱۷۹۵ء میں نواب عمدۃ الامراء اس کا جانشین ہوا، ۱۸۰۱ء میں اس کی وفات ہوئی تو اس کے بیٹے علی حسین کو اپنا وظیفہ خوار بنا کر رکھنا چاہا اس نے انکار کیا تو اس کے ایک رشتہ دار عظیم الدولہ کو وہاں کا نواب اس شرط پر بنایا کہ وہ اپنا سارا اختیار کمپنی کے حوالہ کر دے، اس کے بعد لارڈ ویلزلی نواب اودھ کی طرف متوجہ ہوا اور وہاں کے کمزور نواب پر دباؤ ڈالا کہ وہاں کی انگریزی فوج کی تعداد دس ہزار سے

زیادہ بڑھادی جائے اور اس کے مصارف کے لیے دوآب اور روہیل کھنڈ کے علاقے انگریزوں کے حوالہ کردے، اس طرح نواب اودھ کا آدھا علاقہ انگریزوں کے تسلط میں آگیا۔

پھر تقریباً چالیس برس تک انگریز مرہٹوں اور سکھوں سے لڑتے رہے اور انھوں نے افغانستان کو بھی ۱۸۳۹ء میں فتح کرنے کی ناکام کوشش کی، وہاں ان کو کامیابی نہیں ہوئی انھوں نے سندھ کے امیروں پر یہ الزام رکھا کہ انھوں نے انگریزوں کی فوج کی رسدرسانی کا ٹھیک انتظام نہیں کیا اور فوج کی کوچ میں رخنہ ڈالا اور پھر وہاں کے امیروں کو اتنا تنگ کیا کہ وہ لڑنے پر آمادہ ہو گئے لیکن انگریزوں نے ۱۸۴۳ء میں ان کی قوت توڑ کر رکھ دی۔

انگریزوں کی چالبازیوں سے ہندوستان کا پورا علاقہ ان کے قبضہ میں آگیا تو ۱۸۵۷ء میں یہاں کے لوگوں کو محسوس ہوا کہ سات سمندر پار ایک بیرونی قوم کے وہ غلام ہو گئے ہیں تو وہ کوہ آتش فشاں کی طرح ان کے خلاف پھٹ پڑے اور پھر جو کچھ ہوا اس کی تفصیل بڑی ہی ہولناک ہے، جو کئی جلدوں میں بھی قلمبند نہیں کی جاسکتی، یہاں پر ایک انگریز مورخ ہی کے حوالہ سے اس کی ایک جھلک دکھائی جاتی ہے۔

سر جون نے اپنی ہسٹری آف سی پوائی وار میں لکھا ہے کہ:

> ”بغاوت کے نام سے مجرموں کے ساتھ عورتیں اور بچے ہلاک کیے جا رہے تھے، ان کو قصداً پھانسی نہیں دی جاتی بلکہ وہ اپنے گاؤں میں آگ میں ڈال کر جلا دئے جاتے یا ان کو گولی ماردی جاتی، انگریز یہ فخر کرنے میں نہیں ہچکچاتے کہ انھوں نے کسی کو نہیں چھوڑا، ہلاک کرنا ان کے لیے خوشگوار تفریح تھی، تین مہینے تک روزانہ لاشوں کی آٹھ گاڑیاں صبح سے شام تک ان مردوں کو لاتیں جو راہوں اور بازاروں میں لٹکی دکھائی دیتیں۔“

(بحوالہ رائز آف دی کرسچین پاور ان انڈیا از کے. ڈی. باسو ج۵ ص ۲۸۵)

مغلوں کے آخری فرمارو ا بہادر شاہ ظفر اور ان کے شہزادوں کے ساتھ جو انتہائی سفاکانہ سلوک ہوا، وہ انسانیت کی انتہائی دردناک تاریخ ہے، ایک فوجی افسر ہڈسن نے بہادر شاہ ظفر کے شہزادوں میں سے مرزا مغل، مرزا خضر خاں، مرزا ابوبکر اور مرزا عبداللہ کو

ہمایوں کے مقبرے میں گرفتار کیا، ان کو رتھ پر سوار کیا، ایک میل چل کر ان کو رتھ پر سے اتار دیا اور ان کو اپنے کپڑے اتارنے کا حکم دیا پھر اپنے ہاتھ سے تین گولیاں ان کے سینوں پر ماریں اور شہ رگ کو سنگین سے چیر دیا، کوتوالی میں لا کر ان کی نعشوں کو زمین پر ڈال دیا، کہا جاتا ہے کہ ہڈسن نے ان کو قتل کر کے ایک چلو خون یہ کہہ کر پیا کہ اگر میں ان کا خون نہ پیتا تو میرا دماغ خراب ہو جاتا، شہزادوں کے سر کاٹے گئے اور یہ بادشاہ کے سامنے لائے گئے، ہڈسن نے کہا: یہ آپ کی نذر ہے جو بند ہو گئی تھی اور جس کو جاری کرانے کے لیے آپ نے غدر میں شرکت کی بہادر شاہ نے جوان بیٹوں اور جوان پوتوں کے کٹے ہوئے سر دیکھے تو حیرت انگیز استقلال کے ساتھ ان کو دیکھ کر منھ پھر لیا اور کہا کہ الحمدللہ تیمور کی اولاد ایسی ہی سرخرو ہو کر باپ کے سامنے آیا کرتی تھی، اس کے بعد شہزادوں کی لاشیں کوتوالی کے سامنے خونی دروازے میں لٹکا دی گئیں جن کو ہزاروں آدمیوں نے دیکھا۔

دہلی کے آس پاس جتنے شہزادے ملے پکڑے گئے، ان کی تعداد انیس بیان کی جاتی ہے، ان میں بوڑھے، لنگڑے، بیمار سب کے سب پھانسی پر لٹکائے گئے، سب سے زیادہ بوڑھا شہزادہ مرزا قیصر ابن شاہ عالم ثانی اکبر شاہ کا بھائی تھا اور مرزا محمود شاہ اکبر کا پوتا وجع مفاصل میں مبتلا تھا، اس کو بھی پھانسی دی گئی اور اس کی لاش لٹکتی ہوئی دکھائی گئی، جو شہزادے قید میں ڈال دیے گئے ان پر سخت مظالم ہوتے رہے، زینت محل کے والد بزرگوار نے جیل ہی میں وفات پائی، بہادر شاہ کے دو لڑکوں مرزا بختاور اور مینڈھو پر مقدمہ قائم کیا گیا پھر ان کو گولی ماردی گئی اور ان کی لاشیں کوتوالی میں لٹکائی گئیں، اس طرح شاہی خاندان کے چوبیس افراد پھانسی پر لٹکائے گئے، ان میں بادشاہ کے دو برادر نسبتی اور دو داماد تھے، بقیہ بادشاہ کے بھتیجے وغیرہ تھے۔

اوپر جو تفصیلات لکھی گئی ہیں ان کے لیے کسی حوالہ کی ضرورت نہیں، یہ ایسے کھلے ہوئے موٹے واقعات ہیں جو اسکول کی نصابی کتابوں میں بھی درج ہیں اور اس سلسلہ میں کسی مستند ضخیم کتاب کا مطالعہ کیا جائے تو ان تفصیلات میں ایک سامراجی قوت کی ہولناکیوں، خوں ریزیوں اور سفاکیوں کی اور بھی دردناک تصویریں ملیں گی۔

انگریزوں نے جس حکومت کو سفاکانہ طور پر ختم کیا اس کی بڑی لمبی تاریخ رہی ہے، اس نے ہندوستان میں ۳۳۰ برس تک حکمرانی کی لیکن اس کی پوری تاریخ میں ایسی سفاکی کی مثال نہیں ملے گی جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، اس کی رواداری کی تاریخ خاکسار نے دو جلدوں میں لکھی ہے اور برطانوی راج کے زمانہ میں ہندو مورخین نے بھی مغل حکومت کی عدل پروری، نرمی، لینت، فراخ دلی اور رواداری کی تعریف کی ہے، ان کی تفصیل میری مذہبی رواداری کی دوسری اور تیسری جلد میں ملے گی، جن ناظرین کو یہ دونوں جلدیں کسی وجہ سے نہ مل سکیں ان کے لیے یہاں پر ایک دو اقتباسات درج کیے جاتے ہیں۔

پروفیسر رام پرشاد گھوسلا اپنی کتاب مغل کنگ شپ اینڈ نوبی لیٹی میں لکھتے ہیں:

> ''مغلوں کے زمانہ میں عدل و انصاف میں جو اہتمام ہوتا اور جو ان کی مذہبی رواداری کی پالیسی تھی اس سے عوام ہمیشہ مطمئن رہے، اسلامی ریاست میں سیاست اور مذہب کا گہرا لگاؤ رہا ہے لیکن مغلوں کی مذہبی رواداری کی وجہ سے اس لگاؤ کی وجہ سے کوئی خطرہ پیدا نہیں ہوا، کسی زمانہ میں بھی یہ کوشش نہیں کی گئی کہ حکمراں قوم کا مذہب محکوموں کا بھی مذہب بنا دیا جائے حتیٰ کہ اورنگ زیب نے بھی حصول ملازمت کے لیے اسلام کی شرط نہیں رکھی تھی، مغلوں کے عہد میں Fermilao Act یا Corporation Act جیسے قوانین منظور نہیں کیے گئے، ایلزبتھ کے زمانہ میں ایک ایسا قانون تھا جس کے ذریعہ سے جبری طور پر عبادت کرائی جاتی تھی مغلوں کے زمانہ میں اس قسم کا کوئی جبر نہیں کیا گیا Bartholomews day کے جیسے قتل عام سے مغلوں کی تاریخ کبھی داغدار نہیں ہوئی، مذہبی جنگ کی خوں ریزی سے یورپ کی تاریخ بھری ہوئی ہے لیکن مغلوں کے عہد میں ایسی مذہبی جنگ کی مثال نہیں ملتی، بادشاہ مذہب اسلام کا محافظ اور نگہبان ضرور سمجھا جاتا لیکن اس نے کبھی غیر مسلم رعایا کے عقائد پر دباؤ نہیں ڈالا۔
>
> (ص ۲۹۷، ۱۹۳۴ء ایڈیشن)

پرمتھا سرن نے اپنی کتاب پروشنل گورنمنٹز انڈر دی مغلز میں لکھا ہے کہ مغلوں کی حکومت عروج کے زمانہ میں دنیا کی شاندار حکومتوں میں سے ایک تھی اور اس کی تمام معاصر حکومتوں میں اس سے زیادہ وسیع اور مستحکم کوئی اور حکومت نہ تھی، اس نے ہندو مسلمان دونوں کو متحد کیا، اس کی کارکردگی ایسی تھی جس پر فخر کیا جا سکتا ہے، اٹھارہویں صدی عیسوی میں سر جان شور بہت بڑا مدبر گذرا ہے جو حکومت کے نظم و نسق میں بڑا ماہر سمجھا جاتا تھا، اس کا بیان ہے کہ جب ایسٹ انڈیا کمپنی برسر اقتدار ہوئی تو اس وقت صوبوں کے نظم و نسق میں ابتری ضرور تھی لیکن اس کا جو نظام تھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مغلوں کی حکومت استحکام اور دانش مندی کی مضبوط بنیاد پر قائم تھی جس میں مختلف فرقوں کے حقوق کی پوری حفاظت تھی، ہندوؤں کے لیے قوانین ان ہی کے بنائے ہوئے تھے، جن پر سختی سے عمل درآمد کرنے کی کوشش کی جاتی۔

عیسائیوں کی اصلی فطرت: یورپ اور امریکہ کے عیسائی بظاہر بہت مہذب، متمدن اور شائستہ نظر آتے ہیں، وہ اخوت، مساوات اور جمہوریت کے حامی بھی ہیں علوم و فنون کے بہت بڑے سرپرست بھی ہیں، سائنس کی ترقی میں ان کے کارنامے بے مثال ہیں لیکن یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان سب کارناموں میں ان کی فطرت کی بنیادی کج روی کارفرما رہتی ہے، ان کی تہذیبی اور تمدنی زندگی میں جو فاسقانہ اور فاجرانہ رنگ پیدا ہو گیا ہے وہ بھی اسی کج روی کا مظاہرہ ہے اور ان کی تہذیب خود ان کے خنجروں سے ہلاک ہو رہی ہے، ان کی اخوت کے دعوی میں بھی ان کی اپنی مصلحت اندیشی ہوتی ہے، مساوات کی حمایت میں بھی ان کی خود غرضی شامل ہوتی ہے اور ان کی جمہوریت تو سیاسی استحصال کا بہت بڑا ذریعہ ہے، علوم و فنون کی سرپرستی میں بھی ان کی نظر و فکر کی وجہ سے مذہب میں ژولیدگی، معاشرہ میں پراگندگی اور سیاست میں فریب کاری پیدا ہو گئی ہے پھر ان کی معروضی تاریخ نویسی قوموں میں باہمی منافرت پیدا کرنے کے لیے ہے، ان کی حقیقت پسندانہ سوانح نگاری سے اسلاف کی سطوت شکنی ہوتی ہے، ان کی غیر جانبدارانہ تنقید نگاری سے آبرو ریزی ہوتی ہے، ان کی ناول نگاری جنسی جرائم کی پردہ پوشی کے لیے ہے، شعر و ادب میں بشری اور نفسیاتی تقاضے کے بہانے قلم میں بے باکی، تحریر میں بے راہ روی اور انداز بیان میں فتنہ انگیزی کی ترویج

ہورہی ہے، اس میں شک نہیں کہ سائنسی علوم کو ترقی دے کر انھوں نے انسانی راحت و آسایش کی خاطر بے شمار چیزیں ایجاد کیں مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ انھوں نے ایسے جنگی اسلحہ، ہوائی جہاز، بم اور زہریلی گیس بھی ایجاد کی ہے جن کے ذریعہ سے نہ صرف ایک علاقہ یا ایک ملک یا ایک برصغیر بلکہ پورا براعظم چند دنوں میں راکھ کا ڈھیر کیا جا سکتا ہے، ان ایجادات کا تصور ہی اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ وہ فطرۃً ظالم اور طبعاً سفاک ہیں اور اگر ان کی پوری تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو اس ظلم اور سفاکی کا پورا نقشہ سامنے آجائے گا، آیئے ذرا ان کی تاریخ کے ایسے پہلو پر بھی ایک سرسری نظر ڈالی جائے جس سے یہ معلوم ہو کہ انھوں نے خود اپنے ہم مذہبوں اور ہم وطنوں پر کیا کیا مظالم ڈھائے ہیں، اس کی کچھ جھلک ہم گذشتہ اوراق میں بھی دکھا چکے ہیں اور کچھ اور دیکھیے۔

عیسائی حکمرانوں کے مظالم: ولیم اول نے ۱۰۶۶ء میں انگلستان کو فتح کیا تو اس کے حکم سے مفتوحہ علاقوں کے گھر، کھلیان اور کھیت وغیرہ سب کچھ جلا دیے گئے اور ایک لاکھ سے زیادہ مرد و زن، بچوں اور عورتوں کو قتل کیا گیا، لن گارڈ نے تاریخ انگلستان جلد دوم میں لکھا ہے کہ یارک اور ڈرہم کے علاقے اس طرح برباد کردیے گئے تھے کہ نو سال تک وہاں کی زمین کھیتی کے لائق نہیں رہی، انگلستان کے کچھ مورخین ایسے سفاکانہ واقعات کی تاویل کر کے ان پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں مگر دوسرے ملکوں کے ایسے واقعات میں خوب رنگ آمیزی کرتے ہیں۔

روس کا حکمراں آئیون چہارم (۱۵۸۴ء-۱۵۳۰ء) آئیون مہیب (ٹریبل) کہلاتا، وہ اپنے غلاموں کو اپنی نجی ملکیت سمجھتا اور کہتا کہ وہ اپنی مرضی سے جب چاہے ان کو ہلاک کردے اور جب تک چاہے ان کو زندہ رہنے دے، اس کو کلیسا کے پادریوں سے شکایت رہتی کہ وہ کاہل ہیں، عبادت نہیں کرتے، اس لیے کلیسا میں جا کر قیام کرتا اور کبھی کبھی رات رات بھر ان سے عبادت کراتا، اس نے تو بائبل کو بھی بدل دینے کی کوشش کی اور اپنی طرف سے اس کا ایک نسخہ تیار کر کے اس کو رائج کرانے کی کوشش کی۔ (روس از ڈبلیو آر مورفل ص ۶۹-۷۲)

سولہویں صدی میں فرانس کے حکمراں چارلس نہم اور اس کی ماں کیتھرائن نے مل کر سینٹ بارتھیسیلو کے میلے کے موقع پر ساڑھے دس ہزار پروٹسٹنٹ کو قتل کرادیا تو کیتھولک چرچ نے خوشی کے شادیانے بجائے۔ (انسائیکلوپیڈیا آف بری ٹانیکا، گیارہواں ایڈیشن ج ۱۰ص ۳۱-۸۲۹)

لوئی پانزدہم اپنی داشتاؤں کے ہاتھوں میں کھلونا بنا رہا، اس کے زمانہ میں ژان سینی تحریک مذہبی اور سیاسی احکام کے خلاف چلی تو اس کو کچلنے کے لیے ہر طرح کے مظالم ڈھائے گئے۔ (ایضاً ۴۹-۸۴۷)

روس کا شہنشاہ پیٹر (۱۷۲۵ء-۱۶۷۲ء) اپنے کارناموں کی وجہ سے پیٹر اعظم کہلایا مگر جہاں اس میں بڑی عظمت تھی، وہاں اس کے مزاج میں اتنا غصہ تھا کہ پھر ایسے مظالم کرنے پر اتر آتا کہ لوگ ان کو دیکھ کر تھرا اٹھتے، اس کے راستے میں جو کوئی رکاوٹ پیدا کرتا اس کو نیست و نابود کردینے میں تامل نہ کرتا، وہ اپنی خوبیوں کی وجہ سے معما بنا رہا، اس کے قریب ترین ساتھی بھی باخبر نہیں ہوتے کہ وہ کس وقت کیا کر بیٹھے گا، اس کے بارہ میں مشہور تھا کہ اس کا غصہ طوفانی ہوتا، وہ کسی سے نفرت کرتا تو اس کی پوری بیخ کنی کر کے دم لیتا، اس کی ضیافت میں بڑی سرمستیاں ہوتیں اور اس کی تفریحیں بڑی پیچیدہ ہوتیں، اس نے اپنے لڑکے الیکزیسن کو پھانسی کی سزا دلوائی، اس لیے کہ اس کی حرکتیں اس کو پسند نہیں تھیں، اس نے اپنی ایک بیوی کو خانقاہ میں بند کر کے نن بننے پر مجبور کیا کیونکہ اس کو شبہ تھا کہ وہ پادریوں سے مل کر اس کے خلاف باغیانہ سازش میں ملوث ہوگئی تھی، اس نے کلیسا میں اپنی خواہش کے مطابق اصلاحات کیں تو پادریوں نے اس کو قتل کردینے کی دھمکی دی۔ (روس از ڈبلیو. ای. مورفل ص ۱۷۳-۱۶۲، انسائیکلوپیڈیا بری ٹانیکا، گیارہواں ایڈیشن)

سترہویں صدی میں جرمنی میں پروٹسٹنٹ اور کیتھولک فرقوں کی جنگ شروع ہوئی تو یہ یورپ کی تیس سالہ جنگ کے نام سے مشہور ہوئی، یورپ کی بہت سی حکومتیں اس میں الجھ گئی تھیں، مورخین کا بیان ہے کہ اس لڑائی میں بوہیمیا کے ۳۵ ہزار گاؤں میں صرف ۶ ہزار باقی رہ گئے تھے، بویریا، فرینکونیا اور سوابیا میں غارت گری ایسی کی گئی تھی کہ یہ سارے

علاقے قحط اور امراض سے تباہ ہو کر ویران ہو گئے، جرمنی میں ایک کروڑ ساٹھ لاکھ کی آبادی تھی، اس جنگ کے بعد ساٹھ لاکھ رہ گئی، اے. جے. گرانٹ اس جنگ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اس سے صنعت وحرفت اور علوم وفنون کا فقدان ہو گیا، لوگوں کے خیالات اور اعمال میں ایک وحشیانہ انداز پیدا ہو گیا، مذہب، تدبر اور سیاست کا کوئی بلند معیار باقی نہ رہا، آئرلینڈ کے سوا اور کوئی ملک ایسے جہنمی عذاب میں مبتلا نہیں ہوا۔ (تاریخ یورپ از اے. جے. گرانٹ اردو ترجمہ ص ۷۷۷)

انیسویں صدی میں ۱۸۳۱ء میں یونان کے علاقہ موریا میں تین لاکھ اور یونان کے شمالی حصہ میں ہزاروں مسلمان مرد، بچے اور عورتیں بڑی بے رحمی سے ہلاک کی گئیں، تفصیل مارماڈیوک پکتھال کی کتاب دی کلچرل سائڈ آف اسلام میں پڑھی جاسکتی ہے۔

یورپ میں تھوڑی تھوڑی مدت کے بعد خوں ریز لڑائیاں ہوتی رہی ہیں اور ان سے جو غارت گری ہوتی رہی اس کی تاریخ المناکی سے بھری ہوئی ہے، پہلی جنگ عظیم میں انسانوں پر جو الم انگیز مصائب آئے، اس کا ذکر گذشتہ اوراق میں آچکا ہے، دوسری عالمگیر جنگ میں روسیوں کے تیس لاکھ سپاہی جرمن حملہ آوروں کے اسلحہ سے ہلاک ہوئے، ان کے ملک کے آٹھ لاکھ مربع میل کے علاقے بالکل تباہ کر دیے گئے، اسی جنگ میں برطانیہ کے چھ لاکھ سپاہی مارے گئے اور چالیس لاکھ مکانات برباد ہوئے، فرانس کو چھبیس ملین ڈالر کا نقصان پہونچا، یہاں کے پانچ لاکھ گھر تہس نہس ہوئے اور ساڑھے سات لاکھ خاندان بے گھر ہو گئے، کہا جاتا ہے کہ اس جنگ کے زمانہ میں پورے یورپ میں ایک کروڑ سے زیادہ سپاہی موت کے گھاٹ اترے اور دو کروڑ سے زیادہ شہری ہلاک ہوئے اور خدا جانے کتنے لنگڑے لولے اور بے کار ہو کر زندگی کے دن گذارنے پر مجبور ہوئے، چار سو ملین ڈالر کی املاک تباہ ہوئی۔ (موڈرن یورپ از سی. ڈی. ہیزن باب ۳۸، اڈیشن ۱۹۷۹ء) اسی جنگ کا یہ واقعہ بھی ابھی تک لوگوں کے ذہن میں ہے کہ اخوت، مساوات اور جمہوریت کے علمبردار عیسائیوں نے جاپان کے شہروں میں سے ہیروشیما اور ناگاساکی میں ایٹم بم گرا کر ان کے لاکھوں مردوں، عورتوں، بوڑھوں اور بچوں کو چشم زدن میں موت کے گھاٹ اس طرح اتار دیا گیا کہ چنگیز اور

ہلاکو کی سفاکیاں بھلادی گئیں اور ابھی کچھ دن پہلے ویٹ نام میں امریکہ کے عیسائیوں نے تیس سال تک جنگ کی، لندن کے اخبار ٹائمس میں چھپا کہ اس مدت میں امریکی فضائیہ نے اٹھارہ لاکھ ننانوے ہزار چھ سو اڑسٹھ حملے کیے، سرسٹھ لاکھ ستائیس ہزار چوراسی ٹن بم گرائے، وہاں کے نباتات کو تباہ کرنے کے لیے ایک کرور نوے لاکھ گیلن کے تباہ کن مادے پھینکے، ۳۵ لاکھ ایکڑ زمین پر زہریلی دوائیں چھڑکی گئیں، جن کا زہر خیال ہے کہ ایک سو برس تک کام کرتا رہے گا، ایک کرور افراد بے گھر ہوئے، ان کے بچے یتیم ہوئے، پندرہ لاکھ ساٹھ ہزار شہری مجروح ہوئے، چھتیس لاکھ باسٹھ ہزار آدمی مارے گئے۔

یہ سفاکی، بے دردی اور ستم آرائی بلکہ خونخواری اور درندگی ان عیسائیوں کی طرف سے ہوئی جن کے پیغمبرؑ نے یہ تعلیم دی تھی کہ جو تیرے داہنے گال پر تھپڑ مارے تو اس کے سامنے اپنا بایاں گال بھی پھیر دے، جو تجھ کو ایک میل بیگار لے جائے تو اس کے ساتھ دو میل جا، جو تیرا کوٹ مانگے تو اس کو اپنا کرتہ بھی دے دے، کیا عیسائیوں اور ان کے فرماں رواؤں نے بلکہ ان کے مذہبی پیشواؤں نے اس پر کبھی عمل کیا؟ ان کی تاریخ نویسی کا طلسم سامری بھی ان کے ان جرائم پر پردہ نہیں ڈال سکتا مگر وہ اب عیسائی مذہب کے پیرو کب رہے، انھوں نے اپنی بظاہر چمکدار زندگی کے جو روزمرہ اصول بنالیے ہیں یا اپنی مصنوعی تہذیب کے جو ضابطے مقرر کر لیے ہیں یا اپنی عیاشانہ زندگی کی تسکین کے لیے جو رسم و رواج رائج کر لیے ہیں ان ہی کی پابندی کرنا ان کی شریعت ہے، یہی حال ان کی پاپائیت کا ہے جو کلیسا میں بیٹھ کر اپنے ظاہری کروفر سے دنیا کو تو مرعوب کر لیتی ہے مگر اپنے پیرووں کو وہ مذہبی زندگی بسر کرنے پر آمادہ نہیں کر سکتی، جس کی تعلیم حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دی تھی، اسی لیے یہ پاپائیت بھی اسی فطری کج روی میں مبتلا ہے جس میں عیسائی اور عیسائی حکمراں رہے، ذرا اسی پاپائیت کی بھی تھوڑی سی جھلک دیکھ لی جائے۔

پاپائیت: لاطینی مسیحیت پر چوتھی صدی سے لے کر سولھویں صدی تک یورپ کی مادی، اخلاقی اور عقلی حالت کی ذمہ دار رہی، اس وقت تک رومۃ الکبری ویران ہو چکا تھا، اٹلی پر شمال کی وحشی قوموں نے جس قدر حملے کیے سب پاپایان رومہ کی تحریک سے ہوئے بلکہ خود

پاپاؤں اوران کے بھتیجوں نے اس خوبصورت شہر کو غارت کیا، انھوں نے اپنے چونے کی بھٹیوں کے لیے، عالی شان عمارتوں کے پتھر اکھڑوا کر منگوائے، پرانے مندروں اور ہیکلوں کی غارت گری سے گرجاؤں کی آرائش کا سامان کیا، ان پاپاؤں کے لیے عمارتوں کو منہدم کر کے اپنے کسی مصرف میں لے لینا ایک عام بات ہوگئی تھی، رومن شہنشاہ سیوبرس کے عہد کی ایک بے نظیر عمارت ہیٹیز وینم تھی، اس کو منہدم کر کے سینٹ پیٹر کا گرجا بنایا گیا، پنتھین کی کانسے کی چھت گلا کر وہ ستون ڈھالے گئے جن سے سینٹ پیٹر کا روضہ آراستہ کیا گیا، رومن قیصروں کی قیمتی عمارتیں تھیں ان کو برباد کر کے کلیسا والوں نے اس دور سے اپنی نفرت کا اظہار پورے طور پر کیا۔

پاپایان روما پہلے تو قسطنطنیہ کے فرماں رواؤں کے ساتھ رہے جو عیسائی ہو گئے تھے پھر فرانس کے تاجداروں کے مددگار ہو گئے، جس کے بعد یورپ کی فرماں روائی ان کے ہاتھوں میں آگئی، فرانس کی حکومتوں میں تو تغیر وتبدل ہوتا رہا لیکن عیسائی پیشواؤں کا تعصب بدستور سابق قائم رہا اور یہاں تک بگڑتا چلا گیا کہ جب ارسمس اور لوتھر نے ان کی بے دینی اور دہریت پر نظر ڈالی تو ان پر لرزہ طاری ہو گیا، پوپ کا انتخاب ضرور کیا جاتا لیکن وہ عموماً سن رسیدہ اور سال خوردہ ہوتے، عنان اقتدار دوسرے کے ہاتھوں میں ہوتا، عہدوں اور ملازمتوں کو تقسیم کرتے وقت بے شمار نذرانے وصول کیے جاتے، تقدس کا اچھا خاصا بیوپار ہونے لگتا، کوئی مقدس شے ایسی نہ تھی جس کا بھاؤ سونے چاندی میں مقرر نہ ہو، جو ممالک کلیسا سے ملحق ہوتے ان کی خواہش اور مرضی کے خلاف ان سے بڑی بڑی رقمیں وصول کی جاتیں، روپیہ جمع کرنے کا سب سے بڑا حیلہ تذکرۃ الغفران تھا، اس کو خرید کر خریدار من مانے گناہ کر سکتا تھا۔

ایک ہزار سال تک روما پاپائے روم کے زیر نگیں رہا، اس مدت میں روما پر بہت سی تباہیاں آئیں، ان کا ذمہ دار کلیسا کو تو تنہا قرار نہیں دیا جا سکتا ہے لیکن اس کی کوئی تردید نہیں کر سکتا ہے کہ اس مدت میں کلیسا کی طرف سے اس شہر کی مادی واخلاقی اصلاح کے لیے کوئی کوشش نہیں کی گئی، اس کی طرف سے سائنس کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اس کے سارے دعاوی اس کے مذہب کے خلاف ہیں، اس کے بجائے آخر آخر میں اس

کی طرف سے فنون لطیفہ کی سرپرستی ہونے لگی، جو کمزور قوم کو شہ زور بنانے کے بجائے انسان کی مادی راحت آسایش میں اضافہ کرتے ہیں، اس طرح اس شہر کی تمام توانائیاں سلب ہوتی گئیں اور یہ اس قابل نہیں رہا کہ دنیاوی یا دینی ترقی میں حصہ لے سکے، جمہوری یا شہنشاہی کی ترقی پذیر قوتوں کے بجائے پاپائیت کے جامد اور غیر متحرک اصولوں کو اپناتا رہا، اس پر زہد واتقا کا ایک غیر حقیقی ملمع چڑھا رہا اور دنیاوی ترقی کے لیے اس کے قبضہ میں صرف فنون لطیفہ تھے، اس طرح یہ گویا ایک ایسے راہب کی لاش بنا ہوا تھا جو بھورے رنگ کی کفنی اوڑھے ہوئے ہو لیکن دعاؤں کی کتاب یا کچھ مرجھائے ہوئے پھول ہاتھ میں لیے ہوئے ہو۔

یورپ بھر میں بڑی بڑی سیاسی خدمتوں پر پادری ہی مامور کیے جاتے تھے، اس طرح ہر ملک میں دوہری حکومت تھی، ایک تو مقامی ہوتی، دوسری وہ جس کے اقتدار کا مرکز پاپائے روم ہوتا، اس طرح مقامی اثر کا کمزور ہونا لازمی تھا پھر ہمسایہ سلطنتوں کی باہمی رقابتیں ان کو اور کمزور بنائے ہوئے تھیں، ان کی رہی سہی طاقت کو پاپائیت کسی نہ کسی حیلے سے اور بھی ضعیف کرتی رہتی، یہ حکومتیں پاپائیت کے خلاف کبھی متحد نہ ہوئیں، اگر ان میں اتحاد کا ذرا سا بھی خدشہ پیدا ہوتا تو پاپائیت کسی نہ کسی بہانہ سے اس کو ختم کر دیتی، وہ مداخلت تو اخلاقی اور روحانی اصلاح کے نام پر کرتی مگر اس کا اصلی مقصد آمدنی کی توفیر اور پادریوں کے جم غفیر کی شکم پروری ہوتا، پاپائی خزانے کی دولت مقامی حکومت سے زیادہ ہوتی، ایک موقع ایسا بھی آیا کہ انوسنٹ رابع نے یہ مطالبہ کیا کہ انگلستان کا کلیسا تین سو مزید اطالوی پادریوں کی کفالت کرے اور لنکن کے گرجا میں اس کا ایک بھتیجا جو سن بلوغ کو بھی نہ پہونچا تھا، ایک بڑی خدمت پر مامور کیا جائے مگر یہ اس لیے ممکن نہ ہو سکا کہ اس وقت تک انگلستان پادریوں پر جو رقم خرچ کر چکا تھا وہ اس کے خزانے سے تین گنی زیادہ رقم تھی اعلیٰ طبقے کے پادری اتنے متمول ہوتے تھے کہ ہر گرجا کا صدر راہب بڑے امیروں اور جاگیرداروں کا مقابلہ کرتا تھا، بعض صدر راہبوں کے پاس بیس بیس ہزار غلام تھے، غریب راہبوں کے لیے معاش پیدا کرنے کے وسیع ذرائع تھے، ہر ملک کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جہاں وہ نظر نہ آتے اور وہ اپنے نکمے پن، کاہلی اور بے کاری کا معاوضہ ان مزدوروں سے حاصل کرتے جو اپنے پسینے سے

روزی کماتے، ویران صومعوں اور خانقاہوں سے باہر تحصیل علم کی کوئی کوشش نہ کی جاتی، کلیسا کی مصلحت اسی میں تھی کہ لوگ جاہل رہیں اس کا اصول یہ تھا کہ جہالت زہد و اتقا کی ماں ہے۔

جہالت ہر جگہ پھیلی ہوئی تھی، اس لیے لوگ اوہام پرستی میں مبتلا تھے، شرمناک معجزوں اور کرامتوں کی بھرمار تھی، کوئی سڑک ایسی نہ تھی جہاں خانقاہوں کے زائرین کی بھیڑ نہ ہوتی، وہ اپنے مرض کی مسیحائی کے بھی خواستگار ان خانقاہ نشینوں سے ہوتے، منفعت رسانی کی خاطر زور ادر تلبیس کا جال ہر طرف بچھا ہوا تھا، خانقاہوں کے طبی کرشموں کا اظہار تبرکات کے ذریعہ ہوتا، ایک خانقاہ میں حضرت مسیح کے کاہنوں کا تاج رکھا ہوا تھا، گیارہ گرجوں میں وہ برچھا محفوظ کر دیا گیا تھا جس سے ان کا پہلو چھیدا گیا تھا، صلیبی جنگ کے زمانہ میں یورشلم سے مقدس دوشیزاؤں کے دودھ کی بوتلیں لاکر صلیبی افواج کے سپاہیوں کے ہاتھوں من مانے اور منھ مانگے داموں فروخت کی گئیں، پھر یہ بوتلیں مقدس جگہوں پر رکھ دی گئیں، بیت المقدس کی اس خانقاہ کا درجہ بہت بڑا تھا جس میں روح القدس کی ایک انگلی رکھی ہوئی تھی۔

نویں صدی کے آغاز تک یہی صورت حال رہی پھر ۸۴۵ء میں اشبیلیہ کے سینٹ اسی ڈور نے کچھ ایسے جعلی اور فرضی فرامین جاری کیے جن سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ پہلے کے تمام اساقف روما کے ماتحت تھے، ان فرامین کے مطابق پاپائے روم کل مسیحی دنیا کا حاکم اعلیٰ بن گیا، اس کے بعد گری گوری سابع نے اس کی کوشش کی کہ دول یورپ کو ایک ربانی الاصل قسیسی حکومت کی صورت میں بدل دیا جائے جس کا شہنشاہ پاپائے روم ہو، اس کو عمل میں لانے کے لیے ایک قسیسی کونسل بنائی گئی جس کے انعقاد کا حق پاپاؤں اور ناسیوں کو دیا گیا، اس کے بعد لاکا کے انسلم نے ایک اور مجموعۂ فتاوی مرتب کیا، جس کی رو سے بادشاہوں کو تخت سے اتارنے اور مسیحی برادری سے خارج کرنے کا حق پاپایان روم کو دیا گیا، پاپائے روم نے اور بھی زیادہ مطلق العنان ہونا چاہا تو یہ تجویز منظور کرالی گئی کہ قسیسی کونسل توڑ دی جائے اور وہی مجلس قائم رہے جو پاپائے اعظم کی نگرانی میں ہو۔

بارہویں صدی میں فتاوی گریشین شایع کیے گئے اس کی رو سے کل مسیحی دنیا اطالوی پادریوں کی ملکیت پاپائے روم کی وساطت سے قرار دے دی گئی جس کے بعد انسان کو

اعمال حسنہ پر مجبور کرنا، ملاحدہ اور زنادقہ کو عذاب دینا، ان کو قتل کر دینا اور ان کی جائداد ضبط کر لینا پاپائے روم کے دائرۂ اختیار میں دے دیا گیا، اس وقت تک وہ پطرس کا نائب تھا، اب وہ نائب مسیح اور ہمسایۂ ابن اللہ ہوگیا، اس کے ذریعہ سے نائبان پاپائے روم طرح طرح سے روپیوں اور اشرفیوں کی پوٹلیاں حاصل کرنے لگے، مزید دولت حاصل کرنے کے لیے پاپائے روم کو یہ اختیار بھی دیا گیا کہ وہ مقدس قوانین وضع کرنے کے علاوہ ان کو منسوخ اور معطل بھی کر سکتا ہے، ایک قانون ایسا بھی بنایا گیا کہ جو شخص چاہے نذرانہ ادا کر کے پروانۂ نقض قانون حاصل کر سکتا ہے، غرض پاپائے روم اسقف اعظم بن گیا، اساقف کے ساتھ اس کے تعلقات وہی ہو گئے جو مطلق العنان بادشاہ کے اپنے ارکان سلطنت کے ساتھ ہوتے ہیں۔

تیرہویں اور چودہویں صدی میں پاپائے روم نے اپنے اختیارات کو غیر معمولی طور سے اور بھی بڑھایا، وہی سارے تقررات کے احکام جاری کرنے لگا، جس کے بعد لوگ اس کے ذریعہ سے عہدوں پر مامور ہوتے، وہ اپنے کو پاپا کی اطاعت اور فرماں برداری کرنے پر مجبور ہوتے پھر پاپائے روم نے وہ تمام حقوق بھی غصب کر لیے جو کلیساؤں کی کونسلوں کو حاصل تھے، اس نے طرح طرح کے نذرانوں سے کثیر دولت جمع کر لی، یہاں تک کہ پاپائے لیودہم کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے تین پاپاؤں کی جمع کی ہوئی دولت اڑا ڈالی پھر ایک سو پچاس جدید خدمتیں قائم کر کے ان کو فروخت کیا اور بڑی دولت پیدا کی۔

پہلے پاپائے روم کا انتخاب رومن کیتھولک کے پادریوں کی طرف سے عمل میں آتا تھا، روما کے مجسٹریٹوں اور سربرآوردہ باشندوں کا استصواب بھی لازمی ہوتا تھا لیکن پاپائے نکولس ثانی نے حق انتخاب کو پادریوں کی مجلس کی آرا کے دو ثلث پر محدود کر کے توثیق انتخاب کا حق شہنشاہ جرمنی کو عطا کر دیا، جس سے بڑی کشمکش پیدا ہوتی رہی، بعض دفعہ آپس کی رقابتوں کی وجہ سے سالہا سال تک کسی پاپا کا انتخاب نہ ہوتا تھا مگر جو پاپا مقرر ہو جاتا وہ مطلق العنان ہوتا تیرہویں صدی کے خاتمہ تک کلیسائے روما دربار روما ہو گیا تھا۔

پاپائے روم نے ایک محکمۂ احتساب بھی قائم کر رکھا تھا، ارکان احتساب کو حکم تھا کہ

لینیت اور رحم کو دل میں مطلق نہ آنے دیں، ملزم کو اپنے عقائد سے توبہ کرنے کی بھی اجازت نہ تھی، اس کے اور اس کے خاندان کے سارے مال و اسباب ضبط کر لیے جاتے، جن میں سے آدھا پاپا کے خزانے میں داخل ہو جاتا اور آدھا ارکان احتساب کے تصرف میں ہوتا۔

چودہویں صدی میں پاپائیت پر قبضہ کرنے کے لیے فرانسیسیوں اور اطالویوں میں بڑی کشمکش پیدا ہوئی، جس کے بعد بڑا مذہبی تفرقہ پیدا ہوا، چالیس مہینے تک دو رقیب پاپا ایک دوسرے پر سب وشتم کرتے رہے، بالآخر پاپاؤں کی تعداد دو سے بڑھ کر تین ہوگئی اور تین جداگانہ مرکز قائم ہوئے، لوگوں کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کس کو جناب مسیح کا اصلی نائب تصور کریں، کلیسائی عہدے عام طور پر فروخت ہونے لگے تھے اور زندگی کا یہ اصول بن گیا تھا کہ اول دولت بعدہ عزت۔

پاپائے روم نے اپنے مقصد کی خاطر ایک ہی زبان لاطینی کو رائج رکھا، دوسری زبانوں کو فروغ دینے سے وہ سمجھتے رہے کہ مسیحیت ختم ہو جائے گی۔

اور یہ کہنا بالکل درست ہوگا کہ قوموں کی مادی حالت کی اصلاح وترقی میں پاپاؤں کا کوئی حصہ نہیں رہا، ان کی عقلی نشوونما کے لیے کوئی طریقہ اختیار نہیں کیا گیا، ان کو ان پڑھ اور جاہل مطلق رکھنے کی کوشش کی گئی، اس کے برعکس راہب کی خانقاہ بہت شاندار ہوتی، اس میں عیش، عشرت راحت اور آسایش کا پورا سامان ہوتا، ترشی ہوئی گھاس کے زمردیں تختے، پھولوں کے چمن، درختوں کے حدیقے، اچھلتے ہوئے فوارے اور ترنم آفریں لہریں ہوتیں۔

(ماخوذ از معرکۂ مذہب وسائنس دسواں باب)

کلیسا کے بہت سے مظالم کے ساتھ یہاں پر دو واقعات لکھنے کے قابل ہیں، اٹلی کا ایک باشندہ گارڈینو برونو تھا، اس نے شروع میں ڈومیگن فرقہ کے راہبوں کے ساتھ زندگی گذاری لیکن اس کو عشائے ربانی اور مسئلۂ حبل بلادنس یعنی امکان استقرار حمل بہ حالت دوشیزگی کے مسئلہ پر غور کرنے سے وہ اس زندگی سے منحرف ہوگیا، پیشوایانِ دین کے عتاب سے بچنے کے لیے سوئٹزرلینڈ، فرانس اور انگلستان میں مارامارا پھرا پھر اس نے ایک کتاب لکھی جس میں یہ ظاہر کیا کہ اناجیل مقدسہ ہیئت اور طبیعیات کے متعلق ذریعۂ استناد نہیں

ہوسکتیں، خصوصاً ان کی یہ تعلیم تو بالکل ہی ناقابل قبول ہے کہ زمین ایک سطح مستوی ہے جو ستونوں پر قائم ہے اور آسمان ایک قبۂ جامد ہے جو فردوس کا صحن ہے، اس کے جرم میں وہ روما پکڑ کر بلایا گیا اور انکوئزیشن کی عدالت نے یہ فیصلہ دیا کہ اس الحاد کے جرم میں وہ زندہ جلا دیا جائے، اس حکم کی تعمیل میں وہ ۱۶؍فروری ۱۶۰۰ء میں زندہ جلا دیا گیا۔ (یہ ساری تفصیلات معرکۂ مذہب وسائنس ص ۵۰۔ ۲۴۹ سے ماخوذ ہیں، اس کا مصنف جان ولیم ڈریپر ہے)

تتمہ: اس طویل خامہ فرسائی کا مقصد یہ ہے کہ عیسائی، عیسائی پادری اور عیسائی مورخین مسلمانوں کے مذہب اور ان کی تاریخ سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان کی عدم رواداری اور سفاکی کے کچھ واقعات جمع کر کے اپنے قلم اور تحریر کی شعلہ فشانیوں سے چاہے کتنا ہی دوسرے سے بدظن کرنے کی کوشش کریں مگر جب ان کی مذہبی اور سیاسی تاریخ خود اتنی داغ دار ہے تو پھر اپنی فطرت کی چیرہ دستی اور کج روی دکھا کر مسلمانوں کے مذہب اور تاریخ کو اپنی گمراہ کن تحقیقات، طبعیات اور تدلیسات سے آلودہ نہ کریں، ان کی حیثیت اس سینیٹری انسپکٹر کی ہوگئی ہے جس کی نظر شہر کے گلزار، مرغزار اور سمن زار پر نہیں جاتی بلکہ اس کی گندگی اور آلودگی پر ہی جاتی ہے اور وہ اپنے افسر کو خوش کرنے کے لیے ایسی ہی رپورٹ پیش کرتا ہے۔

یہ کوئی دعویٰ نہیں کرسکتا کہ ہر مسلمان اور ہر مسلمان حکمراں فرشتہ صفت رہا، مسلمانوں میں بشری کمزوریاں نہیں ہیں یا ان کے حکمرانوں نے کسی زمانہ میں کوئی زیادتی نہیں کی، ان میں علاء الدین جہاں سوز تیمور اور نادر شاہ بھی ہوئے، وہ آپس میں لڑتے بھی رہے، خانہ جنگی میں ایسی خوں ریزی بھی کی جس سے خود مسلمانوں کی گردن شرم سے جھکتی رہی۔

انھوں نے اپنے دشمنوں سے بڑی بڑی لڑائیاں بھی لڑیں اور ان لڑائیوں میں کشتوں کے پشتے بھی لگا دئے مگر یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ مسلمانوں کی جہاں بھی حکومتیں ہوئیں ان کو تین قسم کے غیر مسلموں سے سابقہ پڑا، ایک تو حربی تھے، دوسرے معاہد اور تیسرے ذمی تھے، حربی تو وہ تھے جو مسلمانوں سے لڑائی لڑنے کے لیے تیار رہتے تھے یا تو وہ اسلام کو ختم کرنے کے لیے مذہبی لڑائی لڑتے یا مسلمانوں کی حکومت کو ختم کر کے ان کو بے گھر اور بے وطن کرنے کی کوشش کرتے اور اپنی مدد کے لیے دوسروں سے اتحاد کر لیتے، ایسے حربیوں سے

قرآن پاک میں بھی حکم ہے کہ ان سے لڑائی لڑی جائے جیسا کہ ہم اس کتاب کے شروع میں بھی بیان کر چکے ہیں مگر قرآن پاک کا یہ بھی حکم ہے:

وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَاتَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَايُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ (البقرہ رکوع ۲۴)	اور تم لڑو اللہ کی راہ میں ان لوگوں کے ساتھ جو تمہارے ساتھ لڑنے لگیں اور حد سے مت نکلو، واقعی اللہ تعالیٰ حد سے نکلنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔

مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمان فاتحین اور لشکریوں نے اپنی بشری کمزوری اور جنگی غیض وغضب میں دشمنوں کے علاقوں کو بعض اوقات ضرورت سے زیادہ نقصان پہونچایا، وہاں غارت گری بھی کی پھر بھی مجموعی حیثیت سے ان میں وہ عدم رواداری بلکہ وہ درندگی نہیں رہی جس کی ہولناک مثالیں عیسائیوں کے یہاں ملتی ہیں، ایک بار پھر یہ کہہ دینا کافی ہے کہ ان کی تاریخ میں ہیروشیما اور ناگاساکی جیسے روح فرسا واقعات نہیں ملیں گے، اس طرح دونوں کا موازنہ اور مقابلہ کیا جائے تو نسبتۃً مسلمان اور ان کے حکمراں عیسائیوں اور ان کے حکمرانوں سے زیادہ اونچے اور قدآور نظر آئیں گے۔

حربیوں کے علاوہ مسلمانوں کا سابقہ ان سے بھی پڑا جن سے صلح کا کوئی عہد و پیمان ہوتا رہا ان کے متعلق قرآن پاک میں یہ ہدایت ہے کہ

لَايَنْهَاكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِی الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ أَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْا اِلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ (الممتحنہ رکوع ۲۰)	اللہ تم کو ان لوگوں کے ساتھ احسان اور انصاف کا برتاؤ کرنے سے منع نہیں کرتا جو تم سے دین کے بارہ میں نہیں لڑے اور تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکالا اللہ تعالیٰ انصاف کا برتاؤ کرنے والوں سے محبت رکھتے ہیں۔

ذمیوں کے متعلق ہم پہلے ہی لکھ چکے ہیں یہ وہ لوگ ہوتے جو جزیہ ادا کر دیتے تو ان کے جان و مال اور عزت وآبرو کی ذمہ دار مسلمانوں کی حکومت ہو جاتی، یہ ذمہ داری کس طرح نباہی گئی، اس کی تفصیل اس کتاب کے شروع میں آچکی ہے، حضرت علیؓ فرمایا کرتے

کہ ذمیوں کا مال ہمارا مال ہے اور ان کا خون ہمارا خون ہے۔

یہاں پر یہ واقعہ لکھنے کے قابل ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں حضرت عمرو بن سعدؓ بڑے خدا ترس صحابی تھے، حضرت عمرؓ نے ان کو حمص کا عامل مقرر کیا تو انھوں نے اس شرط پر یہ عہدہ قبول کیا کہ وہ اپنی خدمت کے صلہ میں کوئی تنخواہ نہ لیا کریں گے، ان کی رعایا میں عیسائی ذمی بھی تھے، ایک روز انھوں نے ایک عیسائی کو کہہ دیا کہ خدا تم کو رسوا کرے، یہ کہنے کو تو کہہ گئے مگر سوچنے لگے کہ ان کو یہ کہنے کا کہاں تک حق تھا کچھ بھی حق نہ پایا، حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ نہ یہ عہدہ ہوتا اور نہ یہ بات منھ سے نکلتی، جس سے اس عیسائی کو تکلیف پہونچی، اس لیے عہدہ سے استعفا حاضر ہے۔ (خطبات شبلی ص ۸۳) کیا ایسی مثالیں انسانیت کو سنوارنے میں معاون نہیں ہوسکتی ہیں، اسی طرح بنو امیہ کے خلیفہ ولید نے دمشق میں اپنی خواہش کے مطابق ایک مسجد بنانے کا ارادہ کیا تو جہاں یہ مسجد بن رہی تھی اسی کے پاس ایک گرجا تھا، مسجد کے لیے زمین کی کمی پڑی تو ولید نے عیسائیوں سے گرجے کی کچھ زمین مانگی، انھوں نے یہ کہہ کر دینے سے انکار کردیا کہ خوشی سے تو نہیں دے سکتے، زبردستی لی گئی تو لینے والے کو کوڑھ ہو جائے گا، ولید کو غصہ آگیا یہ کہہ کر زمین لے لی کہ دیکھیں کیسے کوڑھ ہوتا ہے، عیسائی ذمی تھے، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ جب خلیفہ ہوئے تو ان سے عیسائیوں نے شکایت کی، حضرت عمر بن عبدالعزیز نے حکم دیا کہ گرجے کی مسجد کا وہ حصہ جو گرجے کی زمین پر تعمیر ہوا ہے وہ فوراً منہدم کردیا جائے اور سرکاری خرچ سے گرجے کی از سر نو تعمیر ہو۔ (خطبات شبلی ص ۷۵-۷۴) ایسی مثالیں عیسائیوں کی تاریخوں میں نہیں ملیں گی، ایسی ہی فراخ دلی، رواداری اور عالی ظرفی کی تعلیم پانے والوں کے درپے رہ کر عیسائیوں نے ان کی مذہبی اور سیاسی ترقی کی راہوں میں ہر قسم کی رکاوٹیں پیدا کیں۔

خود عیسائی اور ان کے مدبرین اور مورخین ٹھنڈے دل اور پوری رواداری اور غیر جانبداری سے غور کریں تو ان کو اندازہ ہوگا کہ مسلمانوں کے زوال سے دنیا اور انسانیت کو کس قدر نقصان پہونچا، ایک طرف تو عیسائی مدبرین اور فاتحین مسلمانوں کی حکومتوں اور ان کے بڑھتے ہوئے اثرات کو ختم کرنے میں لگے رہے، دوسری طرف عیسائی اہل قلم اپنی

تاریخوں، تحقیقات حتی کہ ناولوں، افسانوں، اخباروں کے کالموں، کارٹونوں اور سنیما کی فلموں کے ذریعہ اسلام، اس کے رسولؐ، اس کے مقدس صحیفہ قرآن مجید، احادیث، فقہ اور اس کے حکمرانوں کی تاریخ کے سلسلہ میں ہر قسم کی زہر چکانی اور ہرزہ سرائی کی زبردست مہم چلاتے رہے مگر حقیقت دبنے کے بجائے ابھر کر سامنے آ ہی جاتی ہے، ایڈورڈ گبن مسلمانوں کا خالصۃً کوئی ہمدرد مورخ نہیں لیکن اس کو اپنی مشہور تاریخ ہسٹری آف دی ڈکلائن اینڈ فال آف دی رومن امپائر میں لکھنا پڑا کہ افریقہ اور ایشیا کے لاکھوں انسان مومن عربوں کی صف میں کسی دباؤ کے بغیر شامل ہوتے رہے، وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف اپنی رغبت سے مائل ہوتے، وہ کلمہ پڑھ لیتے، ختنہ کرا لیتے تو چاہے قیدی ہوں یا غلام، یا مجرم وہ یہ محسوس کرنے لگتے کہ وہ آزاد ہو کر فاتح مسلمانوں کے برابر ہو گئے ہیں، اب وہ گنہگار نہیں سمجھے جائیں گے، وہ اپنی اندرونی صلاحیت اور ہمت کو بیدار پانے لگے، اسی طرح عرب کے پیغمبرؐ نے جو روحانی اور دنیاوی تعلیمات دیں، ان کی طرف بے شمار لوگوں کو ترغیب ہونے لگی تو مسلموں کو عرب کے پیغمبر کے الہامات کی سچائی اور پاکیزگی پر یقین ہونے لگا، مشرک بھی ان الہامات کو انسانی عقل اور ربانی تخیل کے مطابق سمجھنے لگے، اسلام کا پیام زرتشتوں کے پیام سے زیادہ خالص اور موسیٰ کے افکار سے زیادہ فیاض تھا، اس میں وہ متضاد باتیں بھی نہ تھیں جن کی تعلیم انجیل کے ذریعہ سے ساتویں صدی میں دی جا رہی تھی۔ (ج ۳ ص ۵۹)

اسلام کا واحد مقصد دنیا میں اصلی اور سچی توحید کی تعلیم کی تبلیغ و اشاعت ہے، اس میں توحید کا جتنا اعلیٰ ترین اور سہل ترین تخیل پیش کیا گیا ہے کسی اور مذہب میں نہیں کیا گیا، گذشتہ اوراق میں ایچ۔ جی۔ ویلس کی اس تحریر کا ذکر آیا ہے جس میں اس نے اعتراف کیا ہے کہ قرآن میں توحید کا جو تخیل ہے وہ یہودیوں سے بالکل مختلف ہے، عیسائیت نے اس تخیل کو اتنا گنجلک بنا دیا کہ اس سے نہ صرف تفرقہ پیدا ہوتا گیا بلکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کی اسپرٹ جاتی رہی، ایچ۔ جی۔ ویلس کا یہ لکھنا صحیح ہے بلکہ اس میں یہ اضافہ کر دیا جائے تو اور زیادہ صحیح ہوگا کہ یہودیوں کا خدا ایک خاندانی خدا تھا جس نے ساری دنیا صرف بنی اسرائیل کے لیے پیدا کی تھی، عیسائیوں کا خدا سب کچھ مسیح بن مریم کو دے کر خود معطل ہو گیا ہے۔

مجوسیوں نے دیکھا کہ دنیا میں جس قدر اشیا ہیں وہ افعال وحرکات میں سب باہم متضاد ہیں، نور وظلمت، پستی و بلندی، یمین وشمال، نرم وسخت، رات اور دن، خیر وشر، حلم وغضب، غرور و خاکساری کوئی چیز تضاد سے خالی نہیں، اس لیے ایسے دو متضاد عالم کا خالق ایک نہیں ہوسکتا، اس بنا پر انھوں نے دو خدا تسلیم کیے اور ان کا نام یزدان اور اہرمن، نور وظلمت رکھا، ہندوؤں نے صفات کے لحاظ سے برہما، بشن، اور شیو کو تسلیم کیا جس سے تینوں کے پوجنے والے الگ الگ ہوگئے مگر اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ عالم کا خالق وصانع ایک اور صرف ایک ہے، دو یا اس سے زیادہ نہیں، آسمان وزمین کے تمام قوانین قدرت اگر ایک کے بجائے دو طاقتوں کے ہاتھ میں ہوتے تو یہ باہمی تصادم میں ایک لمحہ کے لیے بھی قائم نہ رہتے پھر خدا کے ساتھ کوئی قیصر نہیں ہے، جو کچھ ہے اسی خدا کا ہے قیصر کا کچھ نہیں، اسی کی حکومت، اسی کی سلطنت اور اسی کی فرماں روائی ہے، اسی کا ایک حکم ہے جو فرش سے عرش تک اور زمین سے آسمان تک جاری ہے، اس کے سوا سب باطل ہیں، اس کی قدرت کی وسعت کی کوئی انتہا نہیں، وہ ہر مشکل کو کھولنے والا ہے، اس کے سامنے کسی کا بس نہیں چل سکتا، وہ دنیا میں ہر واقعہ اور ہر حادثہ کا محرک ہے، وہ مردوں کو قبروں سے اٹھانے والا ہے، وہ جلانے والا اور مارنے والا ہے، سمیٹنے اور پھیلانے والا ہے، عزت اور ذلت دینے والا ہے، نفع اور نقصان پہونچانے والا ہے، اس کی اس قدرت کے ساتھ اس کی صفات جمالی کی بھی کوئی حد نہیں، وہ لطف والا، درگذر کرنے والا، پیار کرنے والا، امان دینے والا، امن بخشنے والا، ہر خوف سے بچانے والا، اپنے بندوں کے نیک عمل کو قبول کرنے والا، روزی دینے والا، انصاف والا، دعاؤں کا سننے والا، بندوں کی برائیوں سے چشم پوشی کرنے والا، ماں کی طرح بچوں پر شفقت کرنے والا، بندوں کی کفالت کرنے والا اور ان کو پناہ دینے والا ہے، ان صفاتِ جمالی کے ساتھ اس میں کچھ صفات جلالی بھی ہیں، وہ سب کو دبا کر اپنے قابو میں رکھنے والا، سخت سزا دینے والا، جبروت والا، بڑی گرفت والا اور کائنات کو تہ وبالا کرنے والا ہے، اللہ تعالیٰ کی صفات جلالی کے مقابلہ میں اس کی صفات جمالی زیادہ ہیں، رحمت وشفقت اللہ تعالیٰ کی خاص صفت ہے، مگر خدا کی رحمت وشفقت کے وہی مستحق ہیں جو دوسروں پر رحمت وشفقت کرتے ہیں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگو! تم زمین والوں پر رحم کرو تو آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔ (ابوداؤد باب فی رحمۃ) اور پھر آل عمران -۱۹ میں ہے کہ بے شک خدا بندوں پر ظلم نہیں کرتا، اس لیے اس کے بندوں کا فرض ہے کہ وہ بھی آپس میں ایک دوسرے پر ظلم نہ کریں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی زبان سے اس کی تعلیم کو ان الفاظ میں ادا فرمایا: اے میرے بندو! میں نے ظلم کو اپنے اوپر حرام کیا اور اس کو تمہارے درمیان بھی حرام کیا تو تم آپس میں ایک دوسرے پر ظلم نہ کرنا۔ (سیرۃ النبیؐ ج۴ص۵۲۳)

اگر انسان اللہ تعالیٰ کی جمالی، جلالی اور تنزیہی صفات کا قائل ہو جائے تو پھر وہ انسانیت کے رتبہ کو انتہائی بلندی پر پہونچا سکتا ہے، وہ دہکتی ہوئی آگ سے ڈر کر اس کی پوجا نہیں کر سکتا، وہ زہریلے سانپ سے خوف کھا کر اس کے سامنے جھک نہیں سکتا، وہ بہتے دریا اور اونچے پہاڑ کی عظمت کا قائل ہو کر ان کو کوئی مذہبی تقدس نہیں دے سکتا، وہ سورج، چاند اور کسی سیارے کے آگے عبودیت کا سر نہیں خم کر سکتا، اسلام نے انسان کو یہ تعلیم دی ہے کہ یہ تمام چیزیں تمہاری آقا نہیں بلکہ تم ان کے آقا ہو، وہ تمہارے لیے پیدا کی گئی ہیں تم ان کے لیے پیدا نہیں کیے گئے ہو وہ تمہارے آگے جھکی ہیں تم کیوں انکے آگے جھکتے ہو، سورہ انعام ۲۰ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمیں پر اپنا نائب بنایا ہے، اسی نیابت کی وجہ سے وہ اشرف المخلوقات کہلاتا ہے، سورہ بقرہ ۳ میں ہے کہ خدا نے جو کچھ زمیں میں پیدا کیا ہے وہ سب انسان کے لیے ہے نحل ۱۰-۲ میں ہے کہ دنیا کے جانور، بارش، اس سے اگنے والی سبزیاں، درخت، دریا اور اس کی روانی سب انسان کے لیے ہیں۔ (مزید تفصیلات اور مباحث کے لیے دیکھو سیرۃ النبیؐ از مولانا سید سلیمان ندوی ج۴ص۵۲۷- ۴۱۷، خطبات مدرس ۱۶۸-۱۶۰)

توحید کی ان تعلیمات کے ذریعہ سے انسان کا جو رتبہ بلند کیا گیا ہے اس سے دنیا سنواری جاسکتی ہے۔

مشہور افریقی لیڈر مالکم ایکس نے اپنی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ اگر امریکہ کے لوگ توحید پر ایمان لے آئیں تو شاید وہ بھی انسانی وحدت کو قبول کرلیں اور دوسرے لوگوں کا

موازنہ، مخالفت یا دشمنی رنگ کی بنیاد پر کرنا بند کردیں۔(۴۲۰-۴۱۹، اڈیشن ۱۹۶۵ء بحوالہ تہذیب وتمدن پر اسلام کے اثرات واحسانات از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ص ۴۹)

اسلام اور اس کے پیروؤں کو مذہبی تعصب، سیاسی عداوت اور جنگی مہم سے ضرب کاری لگانے کے معنی یہ ہیں کہ انسانیت کو سنوارنے کی ان اعلیٰ قدروں کی بیخ کنی کرنی ہے اور دنیا کو اعلیٰ تعلیمات سے محروم کرنا ہے اور یہ محرومی جاری ہے، دولت عثمانیہ کو ختم کرنے میں روس کا بڑا حصہ ہے، اس کے بعد وہ ایک بہت بڑی طاقت بن کر بیسویں صدی میں ابھرا، وسط ایشیا کو جہاں سے اسلامی تعلیمات کا چشمہ بہا تھا اپنے تسلط میں لے کر سرمایہ داری کے خلاف جنگ کرنے کے نعرے اور کمیونزم کی ترویج کے پردے میں الحاد کا ایک ایسا سیلاب بہا دیا ہے کہ عیسائیت اور عیسائی حکومتیں اس کو روکنے میں بے بس ہو رہی ہیں۔

اسلام فضائل اخلاق میں زبان، دل اور عمل کی سچائی، سخاوت، عفت، دیانت داری، شرم حیا، رحم، عدل، عہد کی پابندی، عفو، حلم، رفق، تواضع، خوش کلامی، ایثار، میانہ روی، خودداری، عزت نفس، شجاعت، استقامت، حق گوئی اور استغنا کی تعلیم دیتا ہے، ان ہی اخلاقی قدروں سے انسانیت سنواری جا سکتی ہے، رذائل اخلاق میں جھوٹ، وعدہ خلافی، خیانت، غداری، بہتان، چغل خوری، غیبت، دورخاپن، بدگوئی، بے جا مداحی، بخل، طمع، بے ایمانی، رشوت، چوری، سودخواری، شراب خواری، ظلم کینہ پروری، بے جا فخر، غرور، خود بینی، خودنمائی، حسد، فحش گوئی اور فضول خرچی کے انسداد کی تلقین کرتا ہے۔(تعلیمات کی تفصیلات کے لیے دیکھو سیرۃ النبیؐ ج ۶ از مولانا سید سلیمان ندوی)

یہ ضرور ہے کہ مسلمان اس وقت ان تعلیمات پر سختی سے عامل نہیں ہیں اور اس اخلاص کو زائل کر دیا جس سے اسلام کے ابتدائی دور میں پوری انسانیت متاثر ہوئی تھی مگر اس کے زائل کرنے اور کرانے میں عیسائیوں اور عیسائی حکومتوں کی تخریبی کارروائی، ریشہ دوانی، دشمنی اور عدم رواداری کو بھی بڑا دخل ہے، مسلمانوں کی حکومتیں جہاں بھی قائم ہوئیں عیسائیوں نے ان کے خلاف ہر قسم کی تخریبی مہم چلائی اور اس وقت تک دم نہیں لیا جب تک ان کو اپنا غلام نہیں بنا لیا اور یہ غلامی اپنے تمام رذائل کے ساتھ ان پر حاوی رہی، کیونکہ جب دین کے

پیچھے سیاسی یا فوجی قوت نہ ہو تو پھر دین زیادہ موثر نہیں ہوتا، اسلام غیر موثر ہوا تو انسانیت بھی اس کے فیوض و برکات سے محروم ہوتی گئی، جن سے انسانی شرف وعظمت میں اضافہ ہوتا، جب سے یورپ سے دولت عثمانیہ ختم کردی گئی تو اس کا تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے کہ یہ براعظم فضائل اخلاق کی طرف بڑھا یا رذائل اخلاق کی طرف مائل ہوتا گیا، یہ صحیح ہے کہ یورپ کی وجہ سے ریل، تار، ٹیلیفون، بجلی کی طرح طرح کی قوتیں، ریڈیو، ٹیلی ویژن، ہوائی جہاز اور کمپیوٹر وغیرہ سب ملے، اب تو چاند اور دوسرے سیاروں کی بھی تسخیر سائنس کی وجہ سے ہو رہی ہے لیکن اس ترقی کے باوجود کیا یورپ اسلام کی طرح یہ سمجھتا ہے کہ کائنات کا بہترین زیور انسان کا اخلاق حسنہ ہے اور اسلام کی میزان میں حسن اخلاق سے زیادہ گراں کوئی چیز نہیں، بندہ کو خدا کی طرف سے جو کچھ ملا ہے اس میں حسن اخلاق کا عطیہ سب سے بڑھ کر ہے اور اس حسن اخلاق کی وضاحت کلام پاک میں اس طرح کی گئی ہے:

> ''رحم والے خدا کے بندے وہ ہیں جو زمین پر دبے پاؤں چلتے ہیں اور جب ناسمجھ لوگ ان سے بات کریں تو وہ سلام کہیں اور جو اپنے پروردگار کی سیادت کی خاطر قیام اور سجدہ میں رات گذارتے ہیں اور جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم سے جہنم کا عذاب دور کر کہ اس عذاب کا بڑا تاوان ہے اور جہنم برا ٹھکانا اور مقام ہے اور جو خرچ جب کرتے ہیں تو نہ تو فضول خرچی کریں اور نہ تنگی کریں بلکہ ان دونوں کے بیچ سے وہ سیدھے گذریں اور جو خدا کے ساتھ اور خدا کو نہیں پکارتے اور کسی جان کا بے گناہ خون نہیں کرتے، جس کو خدا نے منع کیا ہے اور نہ بدکاری کرتے ہیں کہ جو ایسا کرے گا وہ گناہ سے پیوستہ ہوگا اور جو جھوٹے کام میں شامل نہیں ہوتے اور جب کسی لغویات پر گذر رہے ہوں تو سنجیدگی اور وقار سے گذر جاتے ہیں اور جب خدا کی نشانیاں ان کو سنائی جائیں تو وہ اندھے اور بہرے نہ ہو پڑیں اور یہ دعا مانگتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو ہماری بیویوں اور ہماری اولادوں کی آنکھ کی ٹھنڈک بخش اور ہم کو پرہیزگاروں کا پیشوا بنا۔

(فرقان-۹)(سیرۃ النبیؐ از حضرت مولانا سید سلیمان ندوی ج ۶ ص ۱۶-۱۷)

یورپ میں ایسے فضائل اخلاق کتنے نظر آتے ہیں؟ سائنس کی تمام ترقیوں کے باوجود تعدد ازدواج کے عیسائی مخالفین کے معاشرہ میں جو آج جنسی آوارگی، فحاشی، عریانی، نائٹ کلب، برہنہ رقص، منع حمل، اسقاط، طلاق، ناجائز اولاد کی جو کثرت ہے اور ستم بالائے ستم مرد کی مرد اور عورت کی عورت سے شادی کا جو قانونی جواز ہے، کیا اس سے انسانیت کی گردنیں فخر سے اونچی ہیں یا شرم سے جھکی ہوئی ہیں؟ اور کیا عیسائیوں نے صقلیہ، اندلس، دولت عثمانیہ اور ہندوستان کی سلطنتِ مغلیہ اور دوسری چھوٹی چھوٹی اسلامی مملکتوں کو ایسے ہی تمدن اور معاشرہ کے لیے ختم کیا تھا؟

مگر مسلمانوں کے خلاف عیسائیوں کا غصہ، بغض، بلکہ عداوت اور نفرت ابھی تک ختم نہیں ہوئی ہے، دولت عثمانیہ ختم ضرور ہوگئی اور مسلمانوں کا ایک بڑا امپائر ان کے ہاتھوں سے جاتا رہا مگر اس کے خاتمہ کے بعد اب تک مسلمانوں کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں برابر قائم ہو رہی ہیں اور ان کی تعداد اب تک تینتالیس ہو چکی ہیں، جن کے نام یہ ہیں:

(۱)افغانستان (۲)الجیریا (۳)بحرین (۴)بنگلہ دیش (۵)لیمرون (۶)چاڈ (۷)واہولی (۸)مصر (۹) گیمبیا (۱۰) گینی (۱۱) گینی بساو (۱۲)انڈونیشیا (۱۳)ایران (۱۴) عراق (۱۵) آیوری کوسٹ (۱۶)اردن (۱۷)کویت (۱۸)لبنان (۱۹)لیبیا (۲۰)ملیشیا (۲۱) مالدیو (۲۲)مالی (۲۳)موری ٹینیا (۲۴)مراکش (۲۵)نائیجیریا (۲۶)نائجر (۲۷)عمان (۲۸) پاکستان (۲۹)قطر (۳۰)سعودی عرب (۳۱) سینی گال (۳۲) سائرالی اون (۳۳) صومالیہ (۳۴) جنوبی یمن (۳۵) شمالی یمن (۳۶) سوڈان (۳۷) شام (۳۸) تنزانیہ (۳۹) ٹوگو (۴۰) ٹیونس (۴۱) ترکی (۴۲) امارات عرب (۴۳) ایر ولٹا۔

عیسائیوں کو یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ یہ سب متحد ہو گئیں تو پھر ان کے لیے شدید خطرہ بن جائیں گی، ایسے عیسائیوں کے جذبات کا اندازہ انگلستان کے ایک عیسائی مصنف جوزف لیفن کی ایک کتاب ڈیگر آف اسلام سے ہوگا جو ۱۹۷۹ء میں شائع ہوئی، اس کا خیال ہے کہ مسلمان دنیا میں ایک تیسری قوت بن کر جہاد کے ذریعہ دنیا پر حاوی ہونے والے ہیں،

اس لیے وہ بغض اور عداوت سے بھری ہوئی اپنی تحریروں میں مسلمانوں کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پھر قرآن مجید اور احادیث مقدسہ پر ناروا حملے کرتا ہے پھر قرآن مجید اور حدیث کی رو سے شراب نوشی، قمار بازی، چوری اور قتل کی جو سزائیں مقرر کی گئی ہیں، ان کا تمسخر کیا ہے اور اسلامی ممالک کے تمام موجودہ سربراہوں کو اپنی زہریلی تحریروں سے مطعون کرتا ہے، آخر میں لکھتا ہے کہ مغرب کو اس وقت ایسے اسلام کا سامنا کرنا ہے جو خنجر نکال کر نشاۃ ثانیہ کی طرف مائل ہے، اس کے خلاف مغرب کو اپنی مدافعت کرنی ہے اس کو اپنا دوسرا گال پیش کر کے سپر انداز نہیں ہونا ہے، اس کے یہ معنی ہیں کہ اس کی خواہش ہے کہ یورپ اسلام کو پھر ایک بار کچل کر رکھ دے، خواہ حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم کے خلاف ہی عمل کیوں نہ کرنا ہو، مگر سوال یہ ہے کہ ان عیسائیوں نے حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم پر عمل کب کیا ہے، وہ تو صرف خون بہانا جانتے ہیں اور خون بہا کر دوسروں کی تاریخ کو اپنی فریب کارانہ تحقیق کے ذریعہ سے قصائی کی دوکان ثابت کرنے کی فکر میں رہتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی یہود اور نصاری مسلمانوں کے ایسے ہی دشمن تھے جیسے آج ہیں مگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپؐ کو یہ ہدایت ملی:

> ''اور کہہ دے کہ میں ہر اس کتاب کو مانتا ہوں جو اللہ تعالیٰ نے اتاری اور مجھے خدا سے یہ حکم ملا ہے کہ میں تمہارے بیچ میں انصاف کروں، اللہ رب ہے ہمارا اور تمہارا، ہم کو ہمارے کاموں کا بدلہ ملنا ہے اور تم کو تمہارے کاموں کا، ہم میں تم میں کچھ جھگڑا نہیں، اسی کی طرف سب کو پھر جانا ہے۔'' (شوریٰ ۲، سیرۃ النبیؐ ج ۶ ص ۴۵۷)

اور پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو رحمۃ للعالمین کہا ہے، اللہ تعالیٰ کی رحیمی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیام رحمت پر عمل کر کے مسلمانوں کو خیر الامت بننا ہے اور ان کو اپنے اعمال و کردار سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کو بھی عملی طور سے پورا کرنا ہے کہ خدا کی مخلوق خدا کا کنبہ ہے اور اللہ کو مخلوق میں سب سے زیادہ وہ محبوب ہے جو اس کے کنبہ کے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہے (سنن بیہقی) تا کہ یورپ کے عیسائیوں کو یہ احساس ہو

کہ ایچ. اے. آر. گب نے جو یہ کہا ہے تو کتنا صحیح ہے کہ اگر مشرق و مغرب کی عظیم سوسائٹیوں میں مخالفت کے بجائے باہمی تعاون پیدا ہوتا ہے تو اس کے لیے اسلام کی خدمات حاصل کرنا لازمی ہوگا، وحید را اسلام ص ۳۷۹ لندن ایڈیشن ۱۹۳۳ء جوزف لیفن کو اپنی کتاب ڈیگر آف اسلام میں بادل ناخواستہ یہ اعتراف کرنا پڑا ہے کہ اس وقت مسلمان دنیا میں سات سو پچاس ملین ہیں، عیسائیوں کی آبادی نو سو پچاس ملین ہے مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ عیسائیت اسلام سے طاقت ور ہے، عیسائیت اسلام کی ارٹری کی محض دین ہے، اسلام عیسائیت کی طرح ایک فرقہ کے اندر محض ایک چرچ نہیں بلکہ ایک ایسی کمیونٹی ہے جو مذہب سے منسلک ہے اور یہی اس کی مخصوص قوت ہے۔

آخر میں یہ کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں کو یہ یقین کرنے کو کہا گیا ہے کہ یہودی ہوں یا عیسائی ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے، زیادہ سے زیادہ بس کچھ ستا سکتے ہیں:

لَن یَّضُرُّوْکُمْ اِلَّآ اَذًی (آل عمران:۱۱۱) ہرگز نہ ضرر پہنچا ئیں گے تم کو مگر ایذا تھوڑی

پھر مسلمانوں کو یہ بھی بشارت دی گئی ہے کہ وہ دنیا میں بہترین گروہ بن کر انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے میدان میں اتر سکتے ہیں بشرطیکہ وہ نیکی کا حکم دیں، بدی کو روکتے رہیں اور اللہ پر ایمان رکھیں۔

کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ (آل عمران:۱۱۰)

☆☆☆
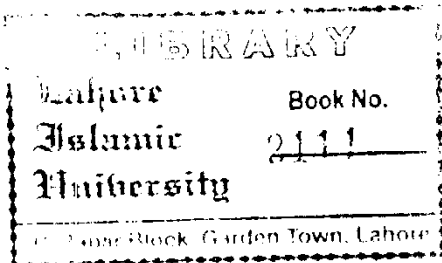
ISLAM MIEN MAZHABI RAWADARI

Syed Sabahuddin Abdur Rahman

Darul Musannifeen Shibli Academy
Azamgarh, U.P.

Price : 150.00